# اِلقائے عہد

جنرل (ر) حمید گل

مرتب: مبین غزنوی

جنرل (ر) حمید گل

مرتب: مبین غزنوی



علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37232336'37352332 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ............... | ایفائے عہد |
| مصنف | ............... | جنرل (ر) حمید گل |
| مرتب | ............... | مبین غزنوی |
| ناشر | ............... | گل فراز احمد |
| | | علم و عرفان پبلشرز، لاہور |
| مطبع | ............... | زاہد نوید پرنٹرز، لاہور |
| کمپوزنگ | ............... | انیس احمد |
| سن اشاعت | ............... | جنوری 2012ء |
| قیمت | ............... | =/400 روپے |

......ملنے کے پتے......

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار
لاہور

اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی


ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہِ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

# آئینہ

## جرنیل

# دیباچہ

از: سیف اللہ خالد

جنوبی ایشیا کے مسلمان کا المیہ رہا ہے کہ ہمیشہ سے دو گروہوں مین منقسم ہے۔ ایک وہ جو ماضی میں زندہ ہے۔ عظمت رفتہ کی داستانیں ورد زبان اور نشاۃ ثانیہ کا خواب حرز جاں تو ہے مگر اس کے لئے درکار قوت عمل سے اس کا دامن خال ہے۔ زمانہ حال کی تو تازہ ہوا بھی اسے گوارا نہیں مگر ماضی سے بھی روشنی اور لائحہ عمل کرنے پر آمادہ نہیں۔ جو بھی پدرم سلطان بود کا نعرہ لگائے آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ نقصان اٹھاتا ہے مگر تجزیہ کرنے کے بجائے دشمنوں کو کوسنے پر اکتفا کرتا ہے۔

دوسرا طبقہ ان بابوؤں پر مشتمل ہے جو لارڈ میکالے کی سوچ کا حاصل ہیں۔ دانش افرنگ کے یہ اسید ماضی سے ہر رشتہ توڑ کر جدیدیت کا طوق گلے میں ڈالنے کو ہی زندگی کا حاصل خیال کرتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ جن کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہیں ان کی بقا ان کی نفی بلکہ فنا میں مضمر ہے۔

پہلا طبقہ خواب فروشوں کا ہے تو دوسرا مغرب کے ذہنی غلاموں کا مصدر ے چند ہیں جو اس گردہ بندی سے اور ماضی کی راہنمائی میں حال کی گتھیاں سلجھا کر مستقبل کی راہ متعین کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جن کی انگلیاں ایک طرف حال کی نبض ٹٹولتی ہیں تو ان کا ذہن اس کے لئے نسخہ کیمیا سے علاج تجویز کرتا ہے۔ جو اپنے رب کی عطا سے ہر رکاوٹ، ہر موڑ، ہر تاریکی اور سازش سے آشنا ہی نہیں متبادل کی خبر بھی رکھتے ہیں۔ قرآن سے گہرا تعلق اور رب کے احکامات کی روشنی میں غور و فکر اور تجزیہ بھی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان میں ایک نمایاں اور چمکتا ہوا نام جنرل حمید گل کا بھی ہے۔

قاری یقیناً محسوس کرے گا کہ پاکستان کی سلامتی، کشمیر، جہاد افغانستان، در استعمار کا ذکر کرتے ہوئے جرنیل کے قلم سے علم، تجربہ اور تجزیہ کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص والہانہ پن بھی ٹپکتا ہے۔ جو ذاتی تعلق اور قلبی احساسات کے بغیر ممکن نہیں جو بعض اوقات کشمیریوں سے زیادہ کشمیری اور افغانیوں سے زیادہ افغانستان سے محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں اس کا واحد سبب یہ نہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت جہاد افغانستان کے لئے صرف کیا اور جب ان کے ساتھی جرنیل اپنی شامیں گالف کھیلتے گزارتے تھے تو وہ مجاہدین کے مورچوں میں، ان کے کیمپوں میں ان کے ساتھ ہوتے تھے، بلکہ یہ محبت ان کے خون کا حصہ ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ استعمار کی مزاحمت بھی ان کی میراثی جبلت ہے تو شائد غلط نہ ہو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

جنرل حمید گل کے پردادا، فیض محمد خان یوسف زئی سید احمد شہید کے جانثار سپاہی تھے جو معرکہ بالاکوٹ میں بھی شریک ہوئے۔ان کے والد محمد خان نے تحریک خلافت میں شمولیت کی خاطر ملٹری اکاؤنٹس کی نوکری پر لات ماردی اور تحریک خلافت کے پنجاب دفتر میں اس وقت تک کل وقتی خدمات سرانجام دیتے رہے جب تک تحریک خلافت ختم نہیں ہوگئی۔ اور کشمیر کی محبت تو شیر مادر کے جیسی ہے کہ جنرل صاحب کی دادی محترمہ کا تعلق کشمیری چغتائی خاندان سے تھا۔اب وہ اپنے خون سے غداری کس طرح کریں۔۔۔۔۔۔؟

تحریک پاکستان کے آغوش میں پل کر جوان ہونے والے حمید گل کو قیام پاکستان کا مقصد سمجھنے کی خاطر انگریز یا ہندو لکھی کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں ان کے لاشعور میں وہ پوری تحریک اپنے نعروں اور وعدوں کے ساتھ زندہ ہے۔ مشرقی پنجاب اور کشمیر سے آنے والے لٹے پٹے مہاجروں کے قافلے اور قائداعظمؒ کے کلمہ پر جہاد کشمیر کے لئے جاتے مجاہدین کے دستے آج بھی انہیں یاد دلاتے رہتے ہیں کہ یہ ملک کیوں بنا تھا اور کشمیریوں سے ان کا رشتہ کیا ہے۔

یہ سارے منظر، یہ سارے حقائق ان کی آپ بیتی ہے یہی سبب ہے کہ بعض دوسروں کی طرح ان کی سوچ اور ان کی تحریر میں الجھاؤ نہیں، وہ پاکستان کے دوست اور دشمن کی تمیز کرنے میں کسی ابہام کا شکار نہیں۔ یقیناً اس میں ان کی پروفیشنل زندگی میں حاصل ہونے والی معلومات کا بھی اثر ہے مگر اصل قوت ان کا ماضی سے تعلق اور حال کے علم کو ملا کر تجزیہ کرنے کی خوبی ہے۔اور یہ سارا عمل جب احکامات ربانی کے سایہ میں آجائے تو اس کا اثر کیا ہوگا۔ان مضامین میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہماری یہ عادت بنا دی گئی ہے کہ اپنے گھر کو بھی یہودی ذرائع ابلاغ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔اسلام آباد، کراچی اور لاہور کے حالات پر بھی اپنے چشم دید کے بجائے مغرب ذرائع ابلاغ کا فرمایا مستند مانتے ہیں۔ مگر حمید گل اس دادگر پر نہیں وہ اپنی آنکھ سے دیکھتے، اپنے تجربہ اور تاریخ کی کسوٹی پر جانچتے اور دین متین کی روشنی میں تجزیہ کرتے اور اپنی زبان میں بات کہنے کو ترجیح دیتے ہیں لہٰذا مغرب گذیدہ انہیں ایک تنازعہ شخصیت قرار دیتے ہیں۔

بعض لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اس ملک میں اور بھی بہت سے جرنیل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں مگر امریکی حمید گل کو کیوں ہدف بناتے ہیں، کبھی اقوام متحدہ سے دہشت گرد قرار دلوانے کی سازش، کبھی طالبان سے شکست کی ذمہ داری اور کبھی عالمی جہادی تحریکوں کی قیادت کا ''الزام''۔۔۔۔۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ حمید گل انہیں جانتا ہے۔انکے انداز فکر کو نہ صرف پہچانتا ہے بلکہ ان کے ذہنوں میں پنپتی سازشوں کا کھوج لگانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے وہ اس شخص سے خائف کیوں نہ ہوں جو ان کے آگے سوچ کر اپنے مضامین میں یہ تک پیشن گوئی کردیتا ہے کہ اس کے بعد یہ اور اس کے بعد فلاں قدم اٹھایا جائے گا اور بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ نہ صرف اقدامات بلکہ ان کی ٹائم لائن کی نشاندہی بھی درست تھی۔ عسکری سائنس کہتی ہے کہ دشمن کے ذہن میں جھانکنے والا جرنیل آدھی جنگ جیت جاتا ہے۔اور اس کتاب کے مضامین تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ حمید گل صرف جھانکنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ فریق ثانی کے ذہن اور ان میں ابلتی سازشیں ان کے

سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں۔

مضامین کا یہ انتخاب تاریخ کے طالب علم کے لئے ایک اثاثہ ہے۔ جو گواہی دیتا ہے کہ حالات کا ہارا کس طرح اپنا رخ بدلتا رہا اور پاکستان کے ارباب لسبت دکشاد کس طرح خبردار کئے جانے کے باوجود خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہے۔ان مضامین میں تاریخ بھی ہے، سیاست بھی، سٹریٹیجک ایشوز بھی، جغرافیائی امداد بھی، سازشوں کی نقاب کشائی بھی ہے اور تحریک راہنمائی بھی۔ سب سے نمایاں خوبی یہ کہ ایک جرنیل کے رشحات قلم سے انتخاب کے باوجود کتاب ادبی چاشنی سے محروم نہیں۔ مرحوم اشفاق احمد نے ایک بار کہا تھا ''جرنیل صاحب! افسوس فوج نے ایک ادیب چھین لیا۔ آپ اگر فوج کے نہ ہوتے تو بہترین ادیب ہوتے''۔ یہ وصف ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔

جنرل حمید گل کے یہ مضامین پڑھنے سے قبل یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب کے لئے لکھی جانے والی مربوط تحریر نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً فوری ضرورت کے تحت وقت کے اہم ترین مسئلہ پر قوم کی راہنمائی کے جذبہ سے لکھے گئے مضامین میں سے انتخاب ہے۔ اور انہیں پڑھتے وقت ماضی کے اس ماحول کو پیش نظر رکھا جائے تو فائدہ دوچند ہو جائے گا۔

دوسرے یہ کہ کاش اس میں 1980 میں جنرل رحیم الدین کے لئے لکھا گیا مقالہ اور اپریل 1982 فارمیشن کمانڈروں کی کانفرنس میں پڑھا جانے والا ان کا مقالہ بھی شامل ہوتا۔ جس نے مایوسی کا شکار کور کمانڈروں کو افغانستان میں ڈٹ جانے کی راہ دکھائی اور اسے ملٹری آرکائیوں میں رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔

زیرِ نظر کتاب چونکہ ایک مختصر انتخاب ہے اس لئے یہ مکمل عکس نہیں بلکہ اس بوڑھے جرنیل کی ایک جھلک ہے جس نے وردی تو وقت پر اتار دی کہ وہ ضابطے کا پابند تھا مگر دفاع وطن کی قسم نہیں توڑی کہ یہ ایمان اور ضمیر کا معاملہ تھا۔ جہاں تلوار کبھی بھی زنگ آلود ہوئی نہ اس کے اعصاب میں کوئی کمزوری واقع ہوئی۔ جب بھی ارضِ وطن کو ضرورت پڑی وہ اپنی عمر اور علالت کو بھول کہ جوان رعنا کی طرح میدان میں ڈٹ گیا۔ ایسی پھرتی، ایسی چستی کہ جوانوں کو رشک آئے۔

امریکی اخبار نویس نے کہا تھا ایسا شخص ہمارے پاس ہوتا تو اس پر کہانیاں لکھی جاتیں، فلمیں بنتی، اس کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو پالیسی کا درجہ دیا جاتا۔۔۔۔ مگر یہ پاکستان ہے اور پھر برصغیر کے مسلمان کا المیہ ہے کہ وہ دو دو گروہوں میں تقسیم ہے ماضی کا قیدی یا مغرب کا غلام اور حمید گل ان دونوں سے اوپر اٹھ کر ماضی کی روشنی میں حال کو بدل ڈالنے کی راہ دکھانے کی کوشش کا نام ہے جو کہ آسان کام نہیں۔

# صیہونی ایجنڈا اور پاکستان

امریکہ انشاء اللہ یہ جنگ ہار جائے گا اس لیے کہ اس جنگ کی بنیاد ہی دھوکے پر رکھی گئی ہے اور یہ کسی اخلاقی اور قانونی جواز سے محروم ہے۔ عسکری اور سیاسی دونوں محاذوں پر امریکی ناکامی کے آثار بتدریج نمودار ہو رہے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ افغان تاریخ کے شناو اور افغان قوم کے مزاج شناس لوگوں پر جو حقیقت ہمیشہ سے عیاں تھی، امریکی دانش وروں اور منصوبہ سازوں کو آج تک کیوں سمجھ نہیں آئی۔ یہی خلا امریکی پالیسی کا بنیادی سقم ہے۔ دراصل یہ اسرائیل کی داخلی سلامتی کے تقاضے ہیں جو امریکی پالیسی سازوں کے اعصاب اور ذہنوں پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔ پاکستان کی پالیسی بھی اس پس منظر سے ناآشنائی کی وجہ سے ناکارہ ہو کر رہ گئی ہے۔ حکومت پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ فوراً کیا۔ اب اس فیصلے کے منفی اثرات کے پرت کھلنا شروع ہو گئے ہیں۔ گن پوائنٹ پر کیے گئے فیصلے کو آپ دانش اور حکمت نہیں کہہ سکتے، یہ تو ایسا ہی ہے کوئی ڈاکو آپ کی کنپٹی پر پستول رکھ کر زہر کا پیالہ پینے کا حکم دے اور اس امید پر چھوٹے چھوٹے گھونٹ پی لیں گے کہ یا تو ڈاکو کو رحم آجائے گا یا زہر ختم ہونے سے پہلے ہی صورتحال میں کوئی ڈرامائی تبدیلی ہو جائے گی۔ لٰہذا پالیسی کو بصیرت کا نام دینا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ پاکستان کی نظریاتی تاریخ میں یہ سانحہ بھی سقوط مشرقی پاکستان کی طرح ایک کریہہ زخم کی طرح ابھرا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے جان سوز سانحے کے صدمے کو ہم آج تک بھلا نہیں پائے۔ معرکہ کارگل نے ہمیں قدرے حوصلہ دیا تھا کہ گیارہ ستمبر کے واقعے اور امریکی دھمکی نے چاروں شانے چت کر دیا۔

امریکہ ایک ہلاکت خیز لائحہ عمل (deadly purpose) پر کاربند ہے۔ اگرچہ یہ امریکی قوم کا منصوبہ نہیں، نہ امریکی ریاست کو اس کام سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی فائدہ ہے۔ امریکہ اور پاکستان میں خصوصاً اور عالم اسلام اور امریکی مفادات میں عموماً کوئی بڑا تنازعہ یا ٹکراؤ نہیں۔ مانا کہ اسلامی دنیا کے تیل کے ذخائر پر کنٹرول حاصل کرنا امریکیوں کا ایک خواب ہے اور چین اور پاکستان کے بڑھتے ہوئے روابط کو قطع کرنا بھی ان کی خواہش ہے اور امریکہ اسلام بالخصوص پاکستان کے اندر جہاد کی ابھرتی ہوئی لہر کو محدود رکھنا بھی ضروری سمجھتا ہے، لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے کسی ایسی جنگ کا سہارا ضروری نہ تھا جو خود امریکہ کو ایک ان دیکھی تباہی سے دوچار کر دے یہ مقصد امریکہ عالم اسلام کو دوست بنا کر بھی حاصل کر سکتا تھا۔ خصوصاً ہم تو ہمیشہ اس کی خدمت کرتے چلے آئے تھے اور پورے عالم اسلام میں بھی اس کے خلاف کوئی سنجیدہ بغض موجود نہ تھا۔ تو پھر کیا وجہ ہے امریکہ اپنی تمام تر طاقت عالم اسلام کے خلاف استعمال کرنے پر تل گیا اور ایسی طویل المیعاد نظریاتی جنگ کا آغاز کر دیا جو اس کے الفاظ میں ''آزادی کی جستجو'' (freedom endeavour) لیکن دراصل جارحانہ

دہشت گردی ہے۔

امریکہ ''دہشت گردی'' کے خلاف اس جنگ کے لیے عرصے کا تعین کرنے پر آمادہ نہیں، لیکن یہود نواز حلقے جنگ کو پچاس برس پر محیط دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے پچاس سال افغانستان جیسے ملک کو فتح کرنے یا دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے درکار نہیں، بلکہ یہ عرصہ اسلام کو نشاۃ ثانیہ کی راہ سے ہٹانے اور مسلمانوں کو سلا دینے کے لیے مطلوب ہے۔ پاکستان اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا عنوان ہے، اس کے نظریاتی سفر کا آغاز نصف صدی پہلے ہوا تھا (یہ الگ بات کہ ابھی تک یہ منزل سے آشنا نہیں ہو سکا) لیکن اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے دشمن اسے اپنا دشمن نمبرون سمجھتے ہیں۔ وہ اسے اس کی نظریاتی بنیاد سے محروم کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں اس کام کے لیے پچاس برس کے عرصے کی ضرورت ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس منصوبے کے پیچھے امریکہ نہیں بلکہ صیہونی ریاست ہے جو پاکستان کو علانیہ اپنا دشمن نمبرون قرار دے چکی ہے اور اس کے تین اہداف اب واضح ہو کر سامنے آ چکے ہیں:

1- پاکستان کو جوہری صلاحیت سے محروم کرنا اور جذبہ جہاد کو سرد کرنا۔

2- یروشلم کو دارالسلطنت بنانا۔

3- خلیج کی عرب ریاستوں اور ایران کو غیر مسلح (Disarm) کرنا۔

پاکستان کا وجود شروع دن سے یہود و ہنود کی نظر میں کھٹکتا رہا ہے۔ بن گوریان سے شیرون تک تمام اسرائیلی لیڈر پاکستان کو دشمن نمبر ایک قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ پاکستان کے لیے اپنی ہر پالیسی طے کرتے ہوئے اور ہر اہم فیصلہ کرنے سے پہلے اس نکتہ کو سمجھنا لازم تھا۔ دیرپا اور کامیاب پالیسی اسی طرح وضع ہو سکتی تھی، لیکن بدقسمتی سے ہم نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ جب تک ہم یہ ذہن نشین نہیں کرتے کہ یہودی ریاست کے لیے پاکستان کا اسلامی وجود، اس کی جوہری صلاحیت اور جذبہ جہاد قبول نہیں، ہم امریکہ، بھارت اور اسرائیل کے ہاتھوں خطرات سے دوچار رہیں گے۔ اسرائیل امریکہ کو مسلسل ہمارے خلاف اکساتا چلا آ رہا ہے۔ آج بھی کہہ رہا ہے کہ امریکہ کے پاس طاقت تو ہے لیکن وہ اس کو استعمال کرنا نہیں جانتا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف طاقت کے استعمال کے لیے ہی وہ الگور اور لیبرمین کو وائٹ ہاؤس میں بٹھانا چاہتے تھے۔ اس میں ناکام ہوئے تو بش انتظامیہ کو بلیک میل کیا، اس طرح بھی مقصد حل نہ ہوا تو پھر گیارہ ستمبر جیسے واقعے سے اس کا جواز پیدا کر لیا۔ اس طرح افغانستان کے خلاف جنگ کی اصل قیادت عالمی صیہونیت کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بجا طور پر اس جنگ کو اپنی جنگ سمجھتے ہیں اور دنیا پر واضح کر چکے ہیں کہ یہ سلسلہ افغانستان پر نہیں رکے گا، بلکہ ساٹھ ممالک پر محیط ہوگا، گویا ساٹھ دوسرے ممالک بھی نامزد کیے جا چکے ہیں۔ اسلامی ممالک کی تعداد 57 ہے، اس میں فلسطین، چیچنیا اور کشمیر کو شامل کر لیں تو یہ تعداد ساٹھ ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جنگ کے اہداف نامزد کیے جا چکے ہیں۔ جارج بش نے ابتداء میں اسرائیلی احکام ماننے سے گریز کیا لیکن حالات نے انہیں یہود کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیا۔

پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ اسلام سے کٹ کر پاکستان کی سلامتی اور بقاء کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اسی رشتے سے پاکستان عالم اسلام کا محافظ بھی ہے۔ عالم اسلام کی امداد اور اس کی حفاظت ہماری آئینی ذمے داری

بھی ہے، قرارداد مقاصد میں اسلامی برادری سے خصوصی تعلقات قائم کرنے کی شق شامل ہے۔ جو لوگ پاکستان کو عالم اسلامی سے الگ کر کے دیکھ رہیں ہیں، ''سب سے پہلے پاکستان ..........'' کا نعرہ ان ہی کا بنایا ہوا ہے لیکن اس سے پاکستان خطرات سے نکل نہیں سکتا، بلکہ مزید خطرات میں گھر جائے گا یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستان سے مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے نظریئے کو نہیں مانتے، اس کی طرف سے جان بوجھ کر یہ ابہام پیدا کیا جا رہا ہے کہ امریکہ سے تعاون کے جواز کے طور پر چار مقاصد یا اہداف بتائے گئے ہیں۔ آیئے دیکھیں ان اہداف کا حصول کس حد تک ممکن ہے۔

ایٹمی صلاحیت کو نشانہ بننے سے بچانا ایک اہم ہدف قرار دیا جا رہا ہے لیکن حقیقی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ کے ساتھ تعاون کے بعد ایٹمی صلاحیت کی حفاظت سوال بن کر سامنے آ گئی ہے۔ اس طرح تو ہماری صلاحیت محدود ہو کر رہ جائے گی، جوہری طاقت کے استعمال کی طاقت ختم ہو جائے گی اور جارحیت کی پوزیشن 'Deterrent' ہی باقی نہ رہے گی، بلکہ اسرائیل اور بھارت اور خود امریکہ جب چاہیں گے اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ یقیناً امریکہ سرگوشیوں میں پاکستان کو باور کرا رہا ہوگا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں بس اسرائیل کی تشفی ضروری ہے۔

یہ مفروضہ سرے سے غلط ہے کہ اگر ہم امریکہ کو اپنے اڈے فراہم نہ کرتے تو بھارت اڈے دے دیتا، اس سے ہماری پوزیشن بہت نازک ہو جاتی۔ ایسا ہوتا تو اچھا تھا۔ بھارتی اڈے استعمال کرنا آسان نہ ہوتا۔ ان کو پھر بھی ہماری فضائی حدود سے گزرنے کی ضرورت پیش آتی۔ ہماری فضائی اہمیت ہر حال میں باقی رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ خوف کوئی پالیسی نہیں اور نہ سرنگوں ہونا کوئی آپشن ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ تحریک آزادی کشمیر کو نقصان سے بچانے کے لیے امریکہ سے تعاون کیا گیا امریکی اپنا مفاد کشمیر کا مسئلہ حل کرنے میں نہیں، اسے لٹکائے رکھنے میں سمجھتے ہیں۔ امریکہ اس خطے میں مستقل قیام کے لیے آیا ہے۔ اس مقصد کے لیے کشمیر اس کے ہاتھ میں ایسی کنجی ہے جس سے پاکستان اور بھارت دونوں کو ہاتھ میں رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اسے حل کرنے کی بجائے مزید التواء میں ڈالنا چاہے گا۔

چوتھا ہدف معیشت بتایا گیا ہے...... زمینی حقائق اس دعوے کے بھی سراسر خلاف ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ افغانستان کی موجود کیفیت جاری رہنے سے پاکستان کی معیشت میں بہتری آئے گی یا ابتری۔ برآمدات کو تو چند روز کے اندر اندر زبردست دھچکا لگ چکا ہے۔ دن بدن امریکہ پر انحصار بڑھتا جائے گا۔ اگر پاکستان کی معاشی غلامی امریکی پالیسی کی معاون بن سکتی ہے تو پھر امریکہ کیوں چاہے گا کہ پاکستان معاشی طور پر آزاد ہو۔

تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ امریکہ کہ وہ تمام مفروضے غلط ثابت ہو چکے کہ ہم طالبان کو گرا دیں گے۔ امریکا انجام بد تو مقدر ہے کہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ ظالموں اور متکبروں کو مٹا کر چھوڑتا ہے...... لیکن ہم کیوں اس ڈوبنے والی کشتی میں بیٹھ گئے۔ اپنے دوست ملک کو گرانے میں ہم نے غیروں کی مدد اور انہیں حق دے دیا کہ وہ چاہیں تو ہمارے اندرونی معاملات میں بھی ایسی ہی مداخلت کریں...... امریکہ تو ایک عالم گیر ایجنڈے پر کار بند ہے، وہ دوسرے ممالک کے شہریوں کے آئینی حقوق کو تسلیم نہیں کرتا۔ بظاہر ایک معجزہ رونما ہو رہا ہے...... دنیا

کی وہی غریب ترین قوم امریکہ کے ایجنڈے کے راستے میں رکاوٹ بن گئی ہے جس نے کبھی روسی عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا لیکن خدانخواستہ اگر امریکہ کامیاب ہو جاتا ہے تو آئندہ ہر ایک ملک کو بالواسطہ امریکی قانون کا پابند ہونا پڑے گا۔ قومی ریاستوں کی آزادی کا بنیادی تصور ہی ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے گا۔ ہم اگر پاکستان کو امریکی تسلط سے آزاد کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم فضول بحثوں میں اُلجھنے کے بجائے قوم کو یکسو کریں اس کے دو ہی راستے ممکن ہیں۔ پہلا یہ کہ تمام قوم حکومتی مواقف کی تائید کرے اور امریکہ کی ہم نوا ہو جائے اور دوسرا یہ کہ حکومت اور قوم دونوں میں امریکی عزائم (جن کے پیچھے اسرائیلی عزائم چھپے ہیں) کے خلاف اخلاقی مزاحمت پر اتفاق ہو جائے۔ پہلا طریقہ ممکن ہی نہیں کہ پاکستانی عوام کا افغان قوم سے رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اب تک صرف ایک آدھ پارٹی نے عملی طور پر سرکاری پالیسی کی حمایت کی ہے۔ جبکہ بھاری اکثریت اس کے خلاف ایک گہرے صدمے سے دوچار ہے اور بہت سے لوگ غم و غصے کا عملاً اظہار بھی کر رہے ہیں۔ پاکستانی قوم غم و غصے کے علاوہ شرمندگی اور ندامت کا شکار بھی ہے کہ ہماری قیادت نے اپنے بھائیوں کو لہو بہانے کے لیے اپنے کندھے پیش کر دیئے ہیں۔

# پاکستان پر امریکی حملے کا پلان

امریکہ میں اس وقت پاکستان کے ایٹمی مراکز پر حملے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہوگی۔ مجھے یہ گمان اس لیے ہوا کہ انہوں نے عراق کے خلاف کیے گئے ''آپریشان ڈیزٹ سٹارم'' کی دس برس قبل ہی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ یہ ان کا مخصوص انداز ہے، پہلے وہ منصوبوں کو افسانوی (fictional) انداز میں پیش کرتے ہیں، پھر انہیں حقیقت کا روپ دیتے ہیں۔ بظاہر ایک امریکی تھنک ٹینک کی طرف سے پاکستان کے وجود پر سوالیہ نشان لگا کر بے پر کی خبر اڑانے کے اس واقعے پر زیادہ پریشانی کا اظہار بلاوجہ معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ہم اس کے مضمرات پر غور کرتے ہیں تو اسے نظر انداز کرنا خطرے سے خالی نظر نہیں آتا۔ اس تھیوری میں ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ امریکہ آخر کار پاکستان کی ایٹمی صلاحیت پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر دیتا ہے۔ اس سے قبل کریش آف 79 کے نام سے ایک افسانوی ناول لکھا گیا، بعد میں ایران میں عین ایسے ہی منصوبے پر عمل کیا گیا۔ اس لیے امریکہ میں بننے والے حالیہ منصوبے کو سرسری طور پر نہیں دیکھنا چاہیے خصوصاً اس صورت میں کہ اس کا ہماری سلامتی اور بقا سے تعلق ہو لیکن بدقسمتی سے اس پر ماحقہ غور وفکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

اپنے حالیہ دورہ امریکہ کے مشاہدے اور جنرل زینی کے بیانات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امریکہ ہمارے ایٹمی پروگرام اور جہاد فلسفے کا شدید مخالف ہے۔ وہ دہشت گردی کے سوا کوئی تشریح قبول کرنے کو تیار نہیں اور دہشت گردی اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو وہ ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جہاں پاکستان کے لیے جہاد اور ایٹمی صلاحیت کے امتزاج میں سلامتی، آزادی اور یکجہتی کا راز پوشیدہ ہے وہاں امریکہ ہمارے جہاد اور نیوکلیئر صلاحیت کے ملاپ کو اپنے لیے خطرے کی تلوار سمجھتا ہے۔ اب افغانستان کا مسئلہ بھی طالبات کی مکمل کامیابی کی شکل میں حل ہوتا نظر آتا ہے، وہاں انہام و تفہیم کی راہیں روشن ہو رہی ہیں، یہ بھی امریکہ کی برداشت سے باہر ہے۔ امریکہ کے لیے یہ صورت حال اس لیے بھی وبال جان بنی ہوئی ہے کہ اس میں اسرائیل کے لیے خطرہ موجودہ ہے۔ اسی لیے امریکہ نے پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنے کو چیلنج جان کر قبول کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم اس چیلنج سے عہدہ برآمد ہونے کے لیے تیار ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے قوم نے ہمیشہ اس چیلنج کو قبول کیا، مصائب و مشکلات جھیل کر بھی جہاد اور ایٹمی صلاحیت کا دفاع کیا ہے۔ اور کسی کو اس کا سودا نہیں کرنے دیا، لیکن حکومتیں نہ تو اس خطرے کا ادراک رکھتی ہیں اور نہ ہی اس کا مقابلہ کرنے کے بارے میں سوچتی ہیں اور اکثر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے لینے کی خاطر دوسروں کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہو جاتی ہیں۔

میں ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں کہ بیرونی قرضے ہماری آزادی اور خودمختاری سلب کرنے کا ذریعہ ہیں

اور ہمیں اپنے اہم قومی مفادات سے محروم کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ان قرضوں کے ذریعے پاکستان کو ایک شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہے۔ ہمارے حکمران بے بس کٹھ پتلیوں کی طرح امریکہ اور آئی ایم ایف کے احکام پر ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے بے نظیر نے کہا کہ میں نہ رہی تو بنیاد پرست آجائیں گے، پھر نواز شریف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میں نہ ہوا تو بنیاد پرست آجائیں گے۔ اب امریکی فوج کے سربراہ جنرل زینی نے موجودہ حکمرانوں کے بارے میں کہا ہے کہ وہ امریکہ کی آخری امید ہیں، جنرل مشرف نہ رہے تو بنیاد پرست آجائیں گے۔ جنرل مشرف نے اس کا دوٹوک جواب نہیں دیا، انہیں کہنا چاہیے تھا کہ ہم سب بنیاد پرست ہیں اور نظریہ پاکستان اور کلمہ لا الہ الا اللہ ہماری بنیاد ہے...... پاکستان اور اسلام جسم و جان کی طرح ہیں۔ یہی ہمارا نظریہ ہے اور یہی بنیاد ہماری اساس ہے، اور ہمارے دستور میں قرآن و سنت کی حاکمیت کو برتری حاصل ہے، اس حوالے سے ہم بنیاد پرست ہیں، لیکن ہماری بنیاد پرستی انتہا پسندی (Extremism) نہیں۔ قرآن جو ہمارا دستور حیات ہے ہمیں عدل اجتماعی کا نظام قائم کرنے کا حکم دیتا ہے جو انتہا پسندی کی ضد ہے۔

''اس طرح ہم نے تمہیں ایک ''امت وسط'' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔'' (بقرہ۔۱۴۳)

یہ حقیقت امریکہ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ یہود و ہنود سب سے بڑھا پسند ہیں، مگر انہیں بنیاد پرست نہیں کہا جاتا۔ دراصل یہ جہاد ہے جس کو وہ بنیاد پرستی اور اپنے لیے خطرہ خیال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں، ہم ایک چھوٹا ملک ہیں مگر ہمیں بھی اپنی بقا کے لیے اپنا دفاع کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمیں علاقے میں طاقت کا توازن برقرار رکھنا۔ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ہمیں اپنے وجود بقا اور آزادی کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی ہے اور یہ کام روایتی ہتھیاروں سے ہو نہیں سکتا۔ اس کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو قوم میں جذبہ جہاد زندہ رکھنا اور دوسرا اپنی ایٹمی صلاحیت کی حفاظت کرنا۔

پاکستان پر سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں کے لیے دباؤ غیر منصفانہ ہے۔ موجودہ ایٹمی صلاحیت کے ذریعے ہم وسیع پیمانے پر تباہی پھیلا سکتے ہیں اور محدود پیمانے پر فوجی ہدف کو نشانہ نہیں بنا سکتے، جو کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ اس لیے ہمیں محدود ہدف کے کلین بم (Clean Bomb) تیار کرنا ہوں گے جس سے چھوٹے فوجی اہداف کو نشانہ بنایا جاسکتے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ہم تھرمونیوکلیئر کو ترقی دیں جس کے لیے مزید تجربات کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں تعمیر و ترقی کے کاموں کے لیے بھی ایٹمی صلاحیت کو بروئے کار لانا گزیر ہے۔ اگر سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرانے والی قوتیں ہماری ایٹمی صلاحیت سے خطرہ ہی محسوس کرتی ہیں تو انہیں دستخط کے لیے اصرار کرنے کے بجائے محدود تباہی پھیلانے والے ایٹمی ہتھیار بنانے کے لیے ہماری حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ وسیع پیمانے پر پھیلانے والے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کا خطرہ ہی نہ رہے۔ موجودہ حالات میں سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے اصرار کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ہمیں ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں مغرب کے رویے کے اسرار و رموز کو سمجھنا چاہیے۔ امریکہ کے رویے سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں منصوبے اور مضمرات کو سمجھنا چاہیے۔ آج کل وہ پاکستانیوں کو دھڑا دھڑ ویزے دے رہا ہے، اسی طرح پاکستان سے سرمایہ اور ٹیلنٹ نکالنے میں مصروف ہے۔ وہ بار بار اپنے سفارت خانے کو بند کر دیتا ہے، عین ممکن ہے کہ کہوٹہ پر حملے کی صورت میں امریکیوں کو

نکالنے کی ریہرسل کی جارہی ہو۔ وہ یہ کام بڑی خاموشی اور غیر محسوس انداز میں کر رہے ہیں تاکہ کوئی چوکنا نہ ہو جائے۔

ہم نے امریکہ کو جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی عادت ڈال دی ہے۔ مثال کے طور پر افغانستان پر پہلے بھی حملہ ہوا اور اب پھر حملے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ گزشتہ حملے میں اپنی فضا اور سمندر استعمال کرنے پر ہم صدائے احتجاج تک بلند نہ کی، ہمارے لوگ اس حملے میں شہید ہوئے ہم نے اس پر بھی غم و غصے کا اظہار نہیں کر پائے بلکہ امریکہ کی خوشنودی کے لیے اپنے لوگ پکڑ پکڑ کر اسے پیش کرتے رہے۔ اب میں محسوس کر رہا ہوں افغانستان پر دوبارہ حملے کی آڑ میں پاکستان کو ہدف بنایا جائے گا اگر ایسا ہو گیا تو امریکہ ایک تیر سے دو شکار کرلے گا۔ امریکی حملہ جلد بھی ہو سکتا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق امریکہ ن اپنے جہاز تاجکستان میں روک رکھے ہیں۔ اگر امریکہ خدانخواستہ پاکستان کو کمزور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو نہ صرف افغانستان میں من مانی حکومت قائم کرانے کی راہ میں موجود رکاوٹ بھی دور ہو جائے گی بلکہ اپنی مرضی کے مطابق بھارت کو اس خطے کا چودھری بنانے اور چین کے خلاف ایک مضبوط حلیف کھڑا کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے گا۔ حالات بگڑ رہے ہیں لیکن ہم ان حالات کی سنگینی سے لاعلم ہیں اور چیلنج قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ ناگزیر خطرے کو شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینے سے ٹالا نہیں جا سکتا۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ حالات کا جرأت اور ہمت مردانہ سے مقابل کیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم متحد ہو جائیں گے، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب مستقبل کا لائحہ عمل تیار کر کے اس پر ابھی سے عمل شروع کر دیا جائے۔

ہماری حکومت کو سوچنا چاہیے کہ آخر ہم امریکہ سے تعلقات بڑھانے کے لیے کیوں بے کل ہو رہے ہیں۔ حالانکہ امریکہ نے گزشتہ دو برس سے ہمیں ایک پائی کی امداد بھی نہیں دی، بلکہ وہ تو الٹا اپنے زیر اثر اداروں کے ذریعے ہماری معیشت کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ پاکستان کو اس پوزیشن پر لانا چاہتا ہے جہاں بنیاد پرستی کا ہوا کھڑا کر کے پاکستان پر حملہ کیا جا سکے۔ معاملہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کا ہوتا تو امریکہ، بھارت اور اسرائیل پر روک لگاتا۔ کشمیریوں اور فلسطینیوں پر دہشت گردی کا الزام عائد نہ کرتا۔ حالانکہ وہ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ تیسری عالمی جنگ ہو سکتی ہے، یہ نیوکلیر فلیش پوائنٹ ہے لیکن انہیں کشمیر کے عوام کے دکھوں کا احساس نہیں دراصل وہ یہ شور اس لیے مچا رہے ہیں کہ انہیں مداخلت کا بہانہ مل سکے۔ اب تو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ امریکی صدارت کے امیدوار الگور نے ۳ مئی کو بوسٹن میں جس پالیسی کا اعلان کیا اس کا سرعنوان "Doctrine of Forwad Engagement" تھا جس کا ملب یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی امریکی مفادات کو خطرہ لاحق ہوگا ہم وہاں اقوام کی اجازت کے بغیر جا کر ''باغیوں'' کا سر کچل دیں گے۔ اس خطے میں پاکستان واحد ملک ہے جو امریکہ کی آنکھ میں کھٹک رہا ہے۔ الگور کے نظریے کی روشنی میں اس خطرے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، تاہم ہمارے ہاں امریکہ سے جسمانی (Physical) خطرے کا شعور موجود نہیں، جب شعور نہیں ہوگا تو ظاہر ہے اس خطرے کا تدارک بھی نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم شعور پیدا کریں اور تدارک کے لیے ابھی سے اقدامات شروع کر دیں۔ یہاں میں اس ضمن میں چند اہم نکات کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔

☆ اس کے لیے پہلا کام معیشت کی بحالی ہے...... ایک اندھا بھی یہ جانتا ہے کہ ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ہدایات اور قرضوں کی واپسی جاری رکھ کر معیشت کو بحال نہیں کر سکتے۔ قرضے نہ ہم ادا کر سکتے

ہیں اور نہ ہی ان کو ادا کرنے کی اخلاقاً اور قانوناً ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے اس معاملے میں ایک ہی بار یکسو ہو جائیں اور اعلان کر دیں کہ قرضے ادا کرنے کے لیے ہم اپنی آزادی اور بقا کا سودنہیں کریں گے۔ بار بار اس طرح کے دعوے نہ کریں کہ معیشت کو دستاویزی شکل میں ملنے کے بعد جب ٹیکس وصول ہوں گے تو ہم دو تین سال میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک سی جان چھڑا لیں گے۔ سردست اس کا سیدھا ساحل یہ ہے کہ ہم قرضے واپس کرنے سے انکار کر دیں۔ صاف صاف کہہ دیں کہ وہ اپنے قانون کا احترام کرتے ہیں تو ہم بھی اپنے قانون کا احترام کریں گے۔ سپریم کورٹ نے سود کو غیر قانونی قرار دیا ہے۔ اس لیے ہم اس کی روشنی میں سود کی ادائیگی فی الفور بند کر دیں۔ جس طرح انہوں نے اپنے قانون کا سہارا لے کر ہمیں ایف سولہ طیاروں کی فراہمی بند کر دی تھی۔

☆ ہماری ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنانے کی جسارت کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان اس کے جواب میں پہلے کی طرح چپ نہیں رہے گا اور وہ کیا کچھ امکانی اقدامات کر گزرے گا۔ ہمیں نہ صرف بھارت کو واضح الفاظ میں خبردار کر دینا چاہیے کہ اس طرح کے حملے کا اسے کیا نتیجہ بھگتنا پڑ سکتا ہے، بلکہ خود امریکہ کو باور کرانا چاہیے کہ اس کی دکھتی رگ (Soft Under Belly) پر بھی جوابی حملہ ضرور ہوگا۔ اگر اسرائیل بھارت کو مجاہدین کے خلاف مدد فراہم کر سکتا ہے تو ہم بھی امریکہ کہ مرغ دست آموز کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ہمیں اشارے ضرور دینے چاہیں کہ اگر ہمارے ساتھ ایسا کیا گیا تو ہمارا ردعمل کیا ہوگا اور کن کن اطراف میں ہوگا۔ اس کے لیے نہ صرف سوچنا ضروری ہے بلکہ اس کا منصوبہ بھی بنانا چاہیے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں کہوٹہ کو تباہ کرنے کے لیے اسرائیلی طیاروں نے بھارت میں باقاعدہ ریہرسل شروع کر دی تھی۔ ہم نے اس موقع پر دونوں ممالک کو پیغام بھجوایا کہ ہمیں عراق نہ سمجھنا، ہم خاموش نہیں رہیں گے اور ہم نے جوابی اہداف کا بھی تذکرہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ یہ ہم نے ہر صورت میں کرنا ہے۔ اس لیے اپنے عزائم کا اظہار کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو پھر ہم آسانی سے نشانہ بن جائیں گے اور قوم بھی کسی ان ہونی سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔

☆ ہمیں اندرونی اور بیرونی دوستوں کو بھی شناخت کر لینا چاہیے۔ ہمارے دوست وہی ہو سکتے ہیں جو ملک کی خاطر مصوبتیں برداشت کر سکیں۔ اغراض کے بندے اور غیر ملکی مفادات کے محافظ پاکستان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اب موجودہ حکومت میں اکھاڑ پچھاڑ شروع ہوگئی ہے۔ ان لوگوں کو پہچان ضروری ہے۔ جو گود میں بیٹھ کر داڑھی نوچتے ہیں۔ نظریہ پاکستان اور فوج کے مخالف جتنے جلدی الگ ہو جائیں گے، پاکستان کو فائدہ ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو متحرک کریں اور ان سے کام لیں۔ ان کے لیے ایک بھرپور تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ اس سیناریو میں جہاں خطرات اور خدشات کے کانٹے ہیں وہیں امکانات اور امیدوں کے شگوفے بھی ہیں۔ سب سے اہم امکان یہ ہے کہ ہم حقیقی آزادی کی منزل حاصل کر سکتے ہیں، مگر اس کے لیے مربوط منصوبہ بندی اور ایثار کیش ٹیم کی ضرورت ہے۔

☆ ہمیں تنہائی کا خوف جھٹک دینا چاہیے۔ آج ہمیں کچھ مہربانوں کی طرف سے یہ کہہ کر ڈرایا جا رہا ہے

کہ دنیا بھر میں تنہا ہونے سے ہماری ترقی رک جائے گی حالانکہ خود امریکہ کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس نے ایک وقت از خود تنہائی قبول کی تھی۔ روس چین اور جاپان نے بھی آہنی پردوں کے سائے میں ارتقاء اور عروج پایا...... امریکہ نے ایران، کیوبا، لیبیا اور شمالی کوریا کو تنہا کر کے ان کا کیا بگاڑ لیا۔ ان ممالک کے حکمران گزشتہ تیس تیس سال سے مسند اقتدار پر فائز ہیں لیکن جو حکمران امریکہ کے سامنے جھک گئے ان کے اقتدار کی اوسط عمر تین سال سے زائد نہیں۔ یہ تو حکمرانوں کی بات ہے اگر قوموں کا تذکرہ کیا جائے تو معاصرہ دنیا میں کوئی قوم تنہائی حاصل کیے بغیر ترقی نہیں کر سکی۔ اس لیے تنہائی کا ہوا کھڑا نہ کیا جائے۔ اول تو پاکستان کو تنہا کیا ہی نہیں جا سکتا اور اگر تنہا کر بھی پا لیا گیا تو کچھ نقصان نہیں ہوگا، فائدہ ہی پہنچے گا۔ آج تک ہمیں جو نقصان پہنچا، وہ نام نہاد ''دوستوں'' کے ہاتھوں ہی پہنچا ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

☆ جہاد دشمن عناصر جہاد کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جہاد انشاء اللہ تا قیامت جاری ہے گا تاہم وہ جہادی قوتوں کو کمزور کرنے کی کوشش ضرور کریں۔ اگر جہادی قوتیں متحد اور مضبوط رہیں گی تو دشمن مدافعت پر مجبور ہو جائے گا لیکن خدانخواستہ اگر جہادی قوتوں کی صفوں میں دراڑیں ہوں گی تو پھر دشمن کا کام آسان ہو جائے گا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ جہادی قوتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا جائے۔ ان کی ایک ہی پالیسی ہونی چاہیے۔ جہادی قوتوں میں ان دونوں جو سر پھٹول جاری ہے وہ بہت خطرناک ہے۔ ہمیں چاہیے کہ مجاہدین کو ایک پرچم کے تلے متحد کر لیں۔ مجاہد تنظیموں اور مجاہدین کی قیادت میں وحدت فکر و عمل بہت ضروری ہے۔

☆ حکومت کا طرز عمل بھی بہت مدافعانہ (Defensive) ہے۔ یہ فیصلہ کن (Deadly Purpose) فکر و عمل اختیار کرنے کا وقت ہے۔ آپ جرأت و ہمت کا مظاہرہ کریں، تو نہ صرف آپ کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا، بلکہ آپ دنیا بھر کے کمزور اور بے سہارا ملکوں کے لیے قوت و استحکام کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس طرح محروم اور غریب ممالک کی قیادت بھی پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی گود میں آ گرے گی۔ ضرورت اتنی سی ہے کہ ہماری قیادت جرأت مندانہ کا مظاہرہ کرے۔

☆ حکومت کے مضبوط اقدامات اپنوں کی حمایت و محبت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اغیار اور مخالفین کے منہ بند کر دیتے ہیں۔ پچھلے سال ان ہی دنوں میں جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالا، اس میں امریکی مرضی شامل نہیں تھی، لیکن قوم ان کی پشت پر موجود تھی۔ یہ بہت بڑا اخلاقی جواز تھا لیکن گزشتہ ایک برس کے اقدامات نے اس اخلاقی جواز کو کمزور کر دیا ہے۔ اس لیے انہیں باہر دیکھنے کے بجائے اندر دیکھنا چاہیے۔ قوم کو کس طرح ساتھ ملایا جا سکتا ہے، یہ حکمت کا اہم ترین نکتہ ہے۔ اللہ کے بعد سب سے بڑا سہارا قوم ہے، امریکہ ہرگز نہیں۔

......❁......

# پاک فوج امریکی ڈھال کیوں؟

## (روزنامہ جنگ 10 جولائی 2003)

1993ء میں امریکی صومالیہ میں بری نیت سے گئے تھے۔ اصل مقصد کو سوڈان کو تقسیم کر کے تیل سے مالا مال جنوبی سوڈان کو عیسائی باغیوں کے تسلط میں دینا تھا۔ اسرائیل کے تحفظ کے لیے بحیرہ احمر کے مغربی کنارے پر واقع ارٹریا میں یہودی نواز حکومت کا قیام تھا لیکن بہانہ صومالیہ کے فاقہ زدہ بچوں کو بنایا گیا۔ بین الاقوامی میڈیا پر قحط سالی کے شور اور ٹی وی پر دن رات بھوک سے سوکھے ہوئے ڈھانچوں کی نمائش نے ایسا ماحول فراہم کیا کہ عالمی برادری بھی اس چکمے میں آ گئی اور امریکہ آپریشن کو یو این او کی تائید حاصل تھی۔ قبائل کی جنگ میں 43 ہزار امریکہ اور 26 ہزار دیگر ممالک کے فوجی جھونک دیئے گئے لیکن جنرل فرح عدید کے ننگے پاؤں اور ننگے بدن جنگجوؤں نے اسامہ بن لادن (جو اس وقت سوڈان میں مقیم تھے) کے ساتھیوں کی مدد سے ایسی مزاحمت دکھائی کہ دو سال بعد صومالیہ سے بھاگنے پر بن پڑی۔ سب سے بڑا معرکہ موغادیشو کے جنوب میں واقع جہاں اسامہ کے کمانڈر عاطف نے سنگر میزائل سے ایک امریکہ بلیک ہاک امریکہ ہیلی کاپٹر مار گرایا۔ جس میں ۱۷ امریکہ مارے گئے۔ مرنے والے امریکیوں کی لاشوں کو ننگ دھڑنگ صومالی بچے گلیوں میں گھسیٹتے رہے پھر یہ تمام مناظر دنیا کے ٹی وی چینلز پر دکھائے گئے۔ صدر کلنٹن کا عزم صرف ان تصویری مناظر کے سامنے منہدم ہو گیا۔ صومالیہ کے تمام آپریشن میں تقریباً 29 امریکہ اموات ہوئی ہوں گی۔ صومالیہ سے امریکیوں کا پسپا ہونا تھا کہ فاقوں کے قصے اور مدقوق اجسام کی ٹی وی پر نمائش بھی تمام ہوئی البتہ ارٹریا پر صیہونی قدم جم چکے تھے اور اسامہ کے ساتھ جنگ ابھی جاری ہے۔

اس داستان کا ایک پوشیدہ پہلو یہ بھی ہے کہ صومالیہ میں امریکی معاونت کے لیے پاکستان نے بھی پیدل فوج اور بکتر بند دستے فراہم کی تھے۔ پاکستانی سپاہیوں جہاں خوراک کی تقسیم میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں وہاں امریکی فوج کو کئی مرتبہ جنگجوؤں کے حملے سے بچایا۔ جس کے لیے امریکہ سنٹرل کمان نے پاکستانی فوج کی بہت زیادہ تعریف کی۔ اور ہمارے نوجوانوں کا دنیا کا بہترین سپاہی قرار دیا۔ لیکن جب ہالی ووڈ نے امریکی فوج کے تعاون سے "Black Hawk Down" نامی مشہور فلم بنائی تو اس میں پاکستانیوں کا سرسری ذکر تو تھا مگر تحسین پر مبنی ایک جملہ بھی نہیں تھا۔ اس کام میں پاکستانی ملت کے ۳۰ خوشنما پھول امریکیوں کو بچاتے ہوئے نثار ہو گئے۔ صرف ایک موقع پر آ کر امریکیوں کو اگر پاکستان کی کمک نہ پہنچتی تو فوجی مبصرین کے مطابق اس دن کم

از کم ڈیڑھ سو امریکہ فوجی مارے جاتے۔ میری مستند اطلاع کے مطابق صومالیہ میں امریکہ مخالف دھڑے مختلف ذرائع سے پاکستانی کمانڈروں اور خود GHQ کو یہ پیغام بھجواتے رہے کہ "خدارہ تم ہمارے مسلمان بھائی ہو امریکہ درندوں کے ڈھال مت بنو اور ہمیں ان سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔"

آج پھر عراق میں تعاون کا حکم آ گیا ہے۔ آج پھر پاکستان کی فوج کی ڈھال کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ لیکن کوئی لاکھ احتجاج کرے فیصلہ وہی گا۔ جو جی ایچ کیو اور پینٹا گون کے درمیان طے ہوگا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ ایک طویل اور دل سوز داستان ہے۔ جسے مستقبل پر اٹھا رکھتا ہوں۔ پاکستان کا ہر دانشور کہہ اور لکھ چکا ہے کہ عراق میں فوج نہ بھیجی جائے۔ لبرل دانشور بھی اس رائے میں شریک ہیں۔ حالانکہ امریکہ کی پسپائی ان کے تصورات کے محل مسمار کر ڈالے گی۔ جیسا کہ افغانستان میں سے روس کے نکلنے کے بعد ترقی پسند دانشوروں کی امیدوں کا حشر ہوا۔ لیکن اپنے بہادر اور غیور فوجیوں کو "کرائے کے سپاہی" کہلوانا کسی کو گوارہ نہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ عراق کے خلاف ایک تاریخی جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ افغانستان کے خلاف بھی ایسا ہی جرم ہوا۔ لیکن عملیت پسندوں کی بصارت اس وقت دبیز پردوں کو چاک نہ کر سکی۔ اور طالبات بیچارے تو ویسے ہی زیر عتاب تھے۔ اگر صومالیہ کے بچے ساز گار ماحول پیدا کر رہے تھے۔ تو افغانستان میں ٹینٹ برقعے میں ملفوف خواتین اور لمبی داڑھیوں نے واردات کا پس منظر تخلیق کیا۔ ہمارے "ارباب بصیرت اس پوشیدہ حقیقت کو نہ دیکھ پائے۔ فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ۔"

افغانستان پر کیا بیتی ہے اور اس غیور عوام کا کیا مستقبل ہے۔؟ آج کسی کو بھی اس سے غرض نہیں۔ طالبان پر سفاکانہ حملے کے وقت ہمارے اس وقت کے وزیر خارجہ جناب عبدالستار نے فرمایا تھا۔ ٹونی بلیئر نے ہمیں (حملے کے حق میں) تسلی بخش ثبوت فراہم کر دیئے ہیں۔ لیکن حال ہی میں مَیں نے ان کا ایک انٹرویو پڑھا ہے جس میں انہوں نے تسلیم کیا کہ ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت قوم سے جھوٹ کیوں بولا اور کس کے کہنے پر بولا۔ اس سے پہلے وہ سی ٹی بی ٹی کے حق میں دلائل کے انبار لگایا کرتے تھے۔ اسے عین قومی مفاد میں بتاتے تھے۔ اب وہ قومی مفاد کہاں گیا۔ آج پھر یہ کہا جائے گا کہ عراق میں فوج بھیجنا قومی مفاد میں ہے۔ مگر کل جب نفع نقصان ہوگا تو کوئی ستم ظریف معصومیت سے مان لے گا کہ اس میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔ مگر پچھتانے سے فائدہ نہیں ہوگا۔ آئیں ذرائع ونقصان کی کسوٹی پر اس معاملے کو آج ہی پرکھتے ہیں۔

## ممکنہ نقصانات

۱۔ عراق پر امریکہ اور برطانیہ کا حملہ اور غاصبانہ بلا جواز، غیر قانونی اور غیر اخلاقی تھا اور ہے۔ دنیا کے کروڑوں انسانوں نے بر وقت مخالفت کر کے اس کا کھلا اظہار کر دیا۔ اس جرم میں کسی طرح کا عملی تعاون شراکت جرم کے مترادف ہوگا اور ہمارے لیے تاریخی شرمندگی کا باعث ہوگا۔ قائداعظم کے اسلامی پاکستان کے لیے یہ کردار کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

۲۔ عراق میں تحریکِ آزادی (جہاد) کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس لپیٹ میں پورا خطہ

آجائے گا۔ اس صورت میں وہاں موجود پاکستانی افواج کا اصل کام غاصبانہ قبضے کو مستحکم کرنا اور امریکہ کے لیے سلامتی کی ڈھال فراہم کرنا ہوگا۔

۳۔ عراق میں امریکہ اہداف دو طرح کے تھے۔ تیل کی دولت پر قبضہ اور اسرائیل کی ناجائز ریاست کو تحفظ فراہم کرنا گہرائی میں جھانکیں تو ہماری فوج اس مقصد سے تعاون کر کے ہمارے قبلہ اول پر صیہونی قبضے کو تقویت فراہم کرے گی۔ اور تحریک پاکستان کے تمام احساسات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صیہونیوں کے ''گریٹر اسرائیل'' کے خواب کو پروان چڑھا رہی ہوگی۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہونی چاہیے کہ ''گریٹر اسرائیل'' کا جو نقشہ اسرائیلی پارلیمنٹ کے باہر لٹک رہا ہے اس میں مدینہ بھی صیہونی ریاست میں شامل ہے۔

۴۔ عراق میں مزاحمتی تحریک عرب قوم پرست، اسلامی احیائے نو اور اسلامی انقلاب ایران کے جذبوں کا امتزاج ہوگی افواج پاکستان کا ان جذبات سے تصادم کسی طور پر بھی موزوں نہ ہوگا۔

۵۔ عراق میں شدید مزاحمت سامنے آئے یا امریکہ قبضہ مستحکم ہو ہر دو صورتیں امریکی عقابوں کو ایران پر حملے کے لیے اُکسائیں گی۔ مزاحمت کی صورت میں وہ دلیل دیں گے کہ ایران کو قابو کیے بغیر عراق میں اسٹریٹیجک پوزیشن برقرار نہیں رہ سکتی۔ اور اسرائیل کے لیے خطرات پیدا ہوں گے۔ کامیابی کی صورت میں ایران کو بھی ساتھ لپیٹ دینے کا استدلال مضبوط ہوگا۔ ان حالات میں پاکستانی افواج بالواسطہ ایران کے خلاف شریک کار ہوں گی۔

۶۔ عراب عوام میں امریکہ اور اپنے حکمرانوں کے خلاف جذبات روز افزوں ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں جس نے انقلاب کے آثار ہویدا ہیں ان میں حکمران غیر اہم ہو جائیں گے۔ حکومتیں ناپائیدار ہو جائیں گی۔ پاکستان کو بالآخر عرب عوام سے ہی رابطہ کرنا ہوگا۔ عوامی سوچ کے خلاف پاکستان کا کردار ہمارے لیے مسائل پیدا کرے گا۔ یاد رہے کہ عرب عوام نے حسین شہید سہروردی کے صفر + صفر = صفر کو ابھی فراموش نہیں کیا۔

۷۔ عرب قوم پرستی کے متضاد رویے پر مشرق وسطیٰ میں ۲۰ لاکھ پاکستانیوں کے کاروبار اور روزگار مجروح ہوں گے۔

۸۔ پاکستانی فوج امریکہ کمان کے ماتحت ہوگی۔ ہوسکتا ہے وہاں بھارتی فوج کے ساتھ مل کر بھی کام کرنا پڑے دونوں طرح ہماری فوج کی نفسیات پر مضر اثرات مرتب ہوں گے۔

۹۔ اندرون ملک انتشار میں اضافہ ہوگا بالخصوص فوج کی قیادت اور ادارے سے اعتبار اُٹھ جائے گا۔ عوام اپنی فوج سے پوچھیں گے ہمارے خون پسینے میں پلے ہوئے اور ہماری دعاؤں سے شاداب ہونے والے آخر کرائے کے سپاہی کیوں بن گئے اور وہ بھی اسلام دشمنی کے لیے۔

۱۰۔ عراق کی تحریک آزادی کے مراکز، مساجد اور اسلاف کے مزار ہوں گے ان کے خلاف استعمال پاک فوج کے لیے بڑا امتحان ہوگا۔

## ممکنہ حقیر فوائد

۱۔ امریکہ کچھ شخصیات سے خوش ہو جائے گا (پاکستان سے نہیں) اور ان کے جائز و ناجائز کام سے صرف نظر کرے گا لیکن وقتی طور پر مطلب نکلنے کے بعد ایسا ہی کرے گا جیسا کہ ماضی میں کرتا آیا ہے۔

۲۔ پاکستان کو مزید کچھ ڈالروں کی امداد مل جائے گی۔ جس سے معاشرے میں خوش حالی تو کیا آئے گی البتہ چند افراد مزید خوشحال ہو جائیں گے۔

۳۔ پاکستان کے مٹھی بھر ''بین الاقوامی شہریوں'' کی نوکریاں مزید پکی ہو جائیں گی۔

نفع نقصان اس پیمانے پر جانچیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آخری ایسی کونسی آفت آ پڑی ہے کہ حقیر مفاد کے لیے ہم ایمان و ضمیر کے ساتھ جان و مال بھی قربان کر دیں۔ عراق ہو یا افغانستان امریکیوں نے یہ مصیبت خود ہی گلے ڈالی ہے اس سے نمٹنا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ "They must carry their own burden" ایک بے وفا سے وفا شعاری کسی اصول کی رو سے جائز نہیں۔ اگر عراق ویت نام بنتا ہے تو بنا کرے۔ اگر افغان قوم ایک سپر پاور کا غرور خاک میں ملاتی ہے تو اس پر ہم کیوں تڑپیں۔ اگر ''سب سے پہلے پاکستان'' کو ہم نے ہی حرز جان بنالیا تو کم از کم اس اصول سے ہی وفا کریں۔ امریکہ کے سامنے سب اصول کیوں دم توڑ جاتے ہیں۔ اور حمیت و شجاعت دم توڑ جاتی ہے۔ اس سوال کا جواب ہماری قیادت کے ہر دعویدار کو اپنے ضمیر میں جھانک کر دینا ہوگا قوم جواب مانگ رہی ہے۔

اور آخر میں عملیت پسندوں کے لیے ایک مشورہ۔ غور کریں تو امریکہ ایک ڈھلتی ہوئی طاقت ہے اس کا سورج غروب ہونے میں کتنا وقت لگے گا میں یہ نہیں کہہ سکتا لیکن عرصہ زیادہ طویل ہرگز نہیں ہوگا۔ اس لیے ہر جائز و ناجائز میں اس کا ساتھ دینا درست نہیں۔ قوموں کے لیے مختلف ادوار آیا کرتے ہیں۔ مگر مشکلات انہیں ہرگز سرنگوں نہیں کرتیں پورے قد سے کھڑے رہنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ انہیں اپنی بقاء اور آزادی کے اصول پرستی کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے ہم سب کے لیے سوچنے کی بات ہے۔ سامنے کا سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ کا موجودہ غرور کے ساتھ دنیا پر پھیلتے جانا پاکستان، اسلام اور انسانیت کے اتنا ضروری ہے کہ ہم اپنا قیمتی لہو اس پر نچھاور کر دیں......؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر امریکہ مستقبل قریب میں پسپائی اختیار کر کے اپنائی تنہائی کی طرف واپس لوٹتا ہے اس سے پیدا شدہ خلاء کو کیسے پر کیا جائے گا؟ اس صورت میں اسلام اور عالم اسلام کا کردار مرکزی ہوگا۔ لیکن تب ہم کہاں کھڑے ہوں گے؟ امریکہ کے پرچم بردار بن کر اگر ہم ہار گئے تو جشن مسرت کون منائے گا۔ اگر ہم جیت گئے تو فاتح کون کہلائے گا؟

# پاک بھارت تجارت......خطرناک مضمرات

پاک ہند تجارت کا مسئلہ اپنے مضمرات اور نتائج کے اعتبار سے کثیر الجہتی ہے جبکہ عموماً اسے سطحی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ سطحیت موجودہ حالات میں خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر اچھے طریقے سے غور غوض کر لیں۔

## تاریخی پس منظر

اس سے پہلے کہ ہم براہ راست اس موضوع کی طرف آئیں میں اس کا مختصر پس منظر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ پاکستان اور ہندوستان صنعتی اور تجارتی لحاظ سے اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں برصغیر پر مغل حکومت تھی۔ اس وقت یہ بہت بڑا ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور اس کی پیداوار بہت زیادہ تھی۔ اصل اعداد و شمار تو دستیاب نہیں لیکن پال کینیڈی امریکہ کے بہت بڑے اور نامور تاریخ دان ہیں۔ اپنی کتاب "Rise and Fall of Western Power" میں دلچسپ اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔ اس میں انہوں نے اڑھائی سو برس پہلے کے ہندوستان کی دولت و ثروت کی جھلک دکھائی ہے۔ اس کے مطابق 1750 میں یعنی جنگ پلاسی سے سات سال پہلے دنیا کی کل پیداوار کا 24.5% فیصد ہندوستان مہیا کرتا تھا۔ گویا پوری دنیا کی پیداوار کا تقریباً چوتھائی حصہ برصغیر پیدا کرتا تھا۔ لیکن اس کے دو برس بعد یعنی جب انگریز ہندوستان چھوڑ کر گئے تو یہ پیداوار 0.5% سے بھی کم رہ گئی جس زمانے میں مغلوں کا اقتدار تقریباً ختم ہو چکا تھا اور انگریز غلبہ حاصل کر رہے تھے۔ اس دور زوال میں بھی پیداوار کا یہی حال تھا لیکن استعماری دور آیا تو ہندوستان کا صنعتی اور تجارتی عروج ختم ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور مغرب کی پیداوار میں اضافہ ہوا لیکن دوسری طرف ہندوستان جیسے بڑے علاقے کا اچانک زوال پذیر ہونا اتنی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا تجزیہ گہرائی میں جا کر کرنے کی ضرورت ہے۔

برصغیر کی صنعتی اور تجارتی زوال کی یوں تو کئی وجوہ تھیں مگر بنیادی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کو اس کے روایتی زمینی راستوں سے محروم کر دیا۔ ہندوستان کی تجارت چین کے ساتھ تھی اور اس کے لیے ہندوستان شاہراہ ریشم والا راستہ اختیار کرتا تھا۔ زمینی راستوں سے ہی یورپ کے ساتھ تجارت ہوتی تھی۔ مشرق وسطیٰ کے ساتھ بھی تجارت کے زمینی راستے سے ہوتی تھی۔ اس لیے ہندوستان نے کبھی سمندری راستوں کا سہارا نہیں لیا لیکن جب ایک سمندری قوت نے غلبہ حاصل کر لیا۔ یعنی انگریزوں نے سمندر کے ذریعے تجارت

شروع کر دی جو بری راستے استعمال ہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تو دنیا بھر سے ہندوستان کے روابط منقطع ہو گئے۔ اس کے بجائے انگریز نے ہندوستان کو سمندری راستے یعنی صرف یورپ سے منسلک کر لیا۔ اس زمانے میں زار روس۔ سلطنت برطانیہ اور سلطنت ہند کے درمیان کافی عرصے تک سرد جنگ کی کیفیت رہی شمال سے روسی وسط ایشیاء میں بڑھتے چلے جا رہے تھے تو جنوب سے برطانیہ نے شمال کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں یورپی تو تیں تھیں ایک زمینی راستہ استعمال کر رہی تھی اور دوسری سمندری لیکن "Great Game" (بڑی بھاری چال) کے نتیجے میں زمینی راستے منقطع ہوتے چلے گئے حالانکہ زمین کے راستے سے محفوظ، موزوں اور منافع بخش تھے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان ان زمینی رابطوں اور ان خطوں کی تجارت سے محروم ہو گیا جو اس سے جڑے ہوئے تھے۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ تاریخ نے دوبارہ اپنا پورا چکر کاٹ لیا ہے اور پھر اسی مقام پر آ کھڑی ہوئی ہے حالانکہ "Great Game" ختم ہو چکی ہے۔ بیچ میں کمیونسٹ روس کا دور آیا۔ اس کا بہت زور و شور دیکھنے اور سننے میں آیا لیکن یہ معجزہ افغان جہاد نے دکھایا کہ ایشیاء پر دوبارہ دوبارہ استعماریت کا پرچم لہرائے کا خواب دیکھنے والی روسی ایمپائر اپنے خوابوں سمیت ٹوٹ گئی۔ اس خطے کے ممالک میں دوبارہ روابط پیدا ہونے لگے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وسط ایشاء کے وسیع و عریض ممالک پر مشتمل بہت بڑا ایک خطہ زمین اپنے قدرتی وسائل اور صنعت و تجارت کے بے شمار امکانات سمیت ہمارے سامنے کھلا ہے۔ یہ دنیا کا واحد ایسا خطہ ہے جہاں وسائل اور ذرائع بے شمار ہیں اور آبادی بہت کم۔ توانائی کے وسائل جو آج کے جدید صنعتی دور میں صنعتی پیداوار کے کلیدی ضرورت سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بھی وسط ایشیا میں موجود ہیں اور یہ وسط ایشیا ہم سے متصل ہے۔ اس تناظر میں پاک بھارت اقتصادی حالات کو دیکھیں اور امکانات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے ہندوست افرادی قوت کے لحاظ سے وسیع ذرائع رکھتا ہے اور خود ایک مارکیٹ بھی ہے۔ پاکستان اپنے محل وقوع کے لحاظ سے بھارتی مین پاور مارکیٹ اور تجارتی و صنعتی لحاظ سے وسیع امکانات کے حامل وسط ایشیاء کے بیچ ایک زنجیر کی حیثیت رکھتا ہے اس خطے کے اندر وہ تمام عوامل یکجا ہو گئے ہیں جو اقتصادی طور پر مستقبل کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بالکل واضح ہو گیا ہے کہ پاکستان کو مستقبل کی عظیم اقتصادی قوت "Economic Giant" بننا ہے اور بہت مضبوط طاقت حاصل کرنی ہے۔

## پاک بھارت تجارت کیوں؟

اس پس منظر کے بعد آیئے اب دیکھتے ہیں اس وقت جب کہ تحریک آزادی کشمیر زوروں پر ہے۔ بھارتی افواج کی طرف سے کشمیری عوام پر مظالم کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان یہ براہ راست تجارت کا ایشو کیسے اُٹھا، کیونکہ ہندوستان کے ساتھ تو پچھلے پچاس سالوں سے ہمارا تجارتی حجم (Volume of Trade) بہت کم ہے۔ اس کی بڑی وجہ وہی ہے جو ہم کہتے آئے ہیں کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا بھارت کے ساتھ تجارت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اگر تجارت ہوگی تو ثقافتی روابط بڑھیں گے آنا جانا بھی شروع ہو جائے گا اور کشمیر کا مسئلہ انتہائی پس منظر میں چلا جائے گا۔ کشمیر کی موجودہ تحریک آزادی اور اس کے خلاف بھارت کے

ظالمانہ ردعمل نے تو اسے مزید مشکل بنا ڈالا ہے۔ ہم پچاس ہزار شہیدوں کے لہو سے کیسے بے وفائی کر سکتے ہیں۔؟ ہم نے پچاس سال تک تجارت نہیں کی آج محض ہم پیاز آلو اور چینی کی خاطر اپنی آزادی اور اپنی شہ رگ کو قربان کر دیں۔؟ جہاں تک صنعتی اشیاء کا تعلق ہے تو اس سے اگر ہم تاجروں کو تحفظ فراہم نہیں کرتے تو ہماری صنعت اس پوزیشن میں نہیں کہ ہم برآمدات بڑھا سکیں۔ ہم نے بار بار اپنے روپے کی قیمت میں اس لیے کمی کی تا کہ ہماری برآمدات بڑھ سکیں۔ جیسے بھٹو صاحب نے ۷۷ میں روپے کی قیمت کو ۳۷ فیصد ڈی ویلیو کر دیا محض اس مفروضے پر کہ برآمدات میں اضافہ ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی انڈسٹری کو قومیا لیا۔ ڈی ویلیو کرنے سے آپ کی ایکسپورٹ بڑھتی ہے لیکن جب آپ نے تحفظ ہی ختم کر دیا تو ایکسپورٹ کیا ہوتی؟ یہ ایسی غلطی ہے جس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ برآمدات میں اضافے کے امکانات کے بغیر گھٹیا آلو پیاز اور پھلی چینی کے لیے پاکستان تجارت کیوں کرے؟ بھارت کی صنعتی اشیاء کیوں منگوائے جبکہ ہمارے صنعت کاروں کو تحفظ بھی حاصل نہیں۔؟

## بھارت کے پردے میں امریکہ

دراصل اس پورے کھیل کے پردے میں امریکہ کی اپنی خواہشات پوشیدہ ہیں۔ بھارت کے خصوصی حالات اور کشمیر کے پس منظر میں بھارت کی یہ اپنی خواہش بھی ہے کہ وہ ہم سے تجارتی تعلقات استوار کر لے۔ یہ اس کی دیرینہ خواہش تھی جس کو ہم رد کرتے آئے ہیں لیکن آج محض بھارت نہیں یہ امریکہ کی اشد ضرورت بن گئی ہے۔ امریکیوں کا اپنا مسئلہ ہے کہ دنیا بھر میں ان کی تجارت فروغ پائے ان کی اشیاء فروخت ہوں۔ ہندوستان کے بارے میں امریکیوں کا غلط یا صحیح تصور ہے کہ اس کی ۳۵۰ ملین (۳۵) کروڑ آبادی مڈل کلاس میں داخل ہو چکی ہے۔ اس آبادی کے پاس چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے کی طاقت موجود ہے۔ اس صورت حال میں امریکہ کے اندر بیٹھ کر ۳۵ کروڑ خریداروں کے لیے اشیاء تیار نہیں کی جا سکتی۔ امریکہ میں مزدوری (Labour Charges) کے مصارف بہت زیادہ ہیں اس لیے وہ بیرونی منڈیوں میں سستی اشیاء بیچنے والے ممالک سے مسابقت نہیں کر سکتا۔ ہندوستان، پاکستان اور وسطی ایشیائی منڈی میں امریکی اشیاء اس صورت میں فروخت ہو سکتی ہے کہ اس کی تیاری پر لیبر چارجز کم سے کم ہوں اور یہ مقصد اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ اس کی بین الاقوامی صنعت ساز کمپنیاں اس افرادی قوت اور مارکیٹ (بھارت) میں اپنی صنعتیں قائم کریں۔

اب تک امریکہ سے باہر صرف ہتھیار بنانے کی صنعت میں امریکہ کو برتری حاصل تھی لیکن سرد جنگ ختم ہونے کے بعد اس کی وہ برتری بھی ختم ہو گئی ہے۔ بڑے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں رہی چنانچہ اب امریکہ صنعتی پیداوار میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک جاپان وغیرہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ کھلی مارکیٹ میں یہ مقابلہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی انڈسٹری باہر نہ لے جائیں۔ ان کا خیال ہے اگر وہ اپنی صنعت کو ہندوستان لے جائیں تو انہیں ہندوستان میں بہت بڑی مارکیٹ ملے گی اور پاکستان کی مارکیٹ بھی ہاتھ آئے گی۔ اس کے ساتھ وسط ایشیاء کی طرف خام مال کے ذرائع بھی مل جائیں گے۔ یہاں وہ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ انہیں

سستا مزدور بھی مل جائے۔ پہلا مقصد حاصل کرنے کے بعد امریکہ ہندوستان کے راستے وسط ایشیاء میں داخل ہو کر بہت سے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلا کر انہوں نے اپنے سرمایہ کاروں کو پہلے ہی یہاں آنے سے روک دیا ہے۔ کراچی کو انہوں نے ایک طویل عرصے سے بند کر دیا ہوا ہے۔ اسی طرح افغانستان میں پائیدار امن قائم نہیں ہونے دیا۔ اب اس خطے میں چین کی تیز رفتار اقتصادی ترقی اور روس کی موجودگی سے اسے احساس ہوا ہے کہ وہ یہاں مفادات حاصل کرنے کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔ چنانچہ پاک بھارت تجارت کی شروعات امریکی کے لیے اس سلسلے میں بنیادی قدم ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ پاکستان اور ہندوستان کی تجارت نہیں بلکہ امریکہ ملٹی نیشنل کی وسط ایشیاء تک رسائی اور اس کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کا جامع منصوبہ ہے۔ اگر وہ اس منصوبے پر عمل نہیں کرتے تو وہ سمجھتے ہیں۔ ابھرتا ہوا چین وسطی ایشیاء پر حاوی ہو جائے گا اور اس خطے کی مارکیٹ قابو کریگا۔ ان کا یہ خدشہ بے بنیاد نہیں چین پہلے ہی بہت آگے جا چکا ہے۔ صرف گزشتہ برس اس کی صنعت نے ۲۳ فیصد ترقی کی اور اتنی زیادہ ترقی حاصل کرنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ امریکہ چین کی خطرناک ترقی کا راستہ روکنے کے لیے جلد از جلد حکمت عملی پر عمل کرنا چاہتا ہے۔

اس منصوبہ بندی کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ امریکہ کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ روس اب دوبارہ اُٹھ نہیں سکے گا۔ اور سرد جنگ کا دور اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ سرد جنگ ختم نہیں ہوئی بلکہ سرد جنگ کے نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ اب چین اور روس باہمی ملاپ سے آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ قبل امریکیوں کو محسوس ہوا کہ روس ان کے دباؤ کی حرارت محسوس کر رہا ہے اور چین بھی اس حرارت کو محسوس کر رہا ہے۔ دوسری طرف جاپان بھی ایک بڑی صنعتی قوت ہے اس کے بھی اپنے مفادات ہیں۔ چنانچہ اب امریکہ نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ اس سے پہلے کہ چین اور روس کا حال ہی میں ہونے والا معاہدہ عملی شکل اختیار کر لے ہم اس سے پہلے وسطی ایشیا میں داخل ہو جائیں۔ یہ امریکہ کی اشد خواہش ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ امریکہ بھارت کو ابھرتے ہوئے چین کے خلاف سرد جنگ میں ملوث کرنا چاہتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے پاکستان کی طرف سے ہندوستان کو جو خطرات اور خدشات لاحق ہیں وہ انہیں دور کرنے میں کوشاں ہے۔ اسی منصوبے کے ایک حصے کے طور پر وہ پاکستانی افواج کو محدود کرنے کی تگ ودو کر رہا ہے لیکن جب تک کشمیر کا مسئلہ موجود ہے اس وقت تک پاکستانی فوج کے کردار کو محدود نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی پاکستانی عوام ایسا کرنے دیں گے۔ چنانچہ امریکہ چاہے گا کہ مسئلہ کشمیر کو جعلی اور مبہم طریقے حل کر کے ہندوستان کو ریلیف دیا جائے۔ اس طرح مسئلہ کشمیر حل تو نہیں ہوگا لیکن پاکستانی حکمران عوام کو یہ تاثر دے سکیں گے کشمیر کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ عوام بھی ان حالات میں مطالبہ کر سکتے ہیں ان حالات میں اتنی بڑی فوج اور دفاعی اخراجات کا کیا جواز ہے۔ اس طرح کی باتیں آج کل بھی ہمارے دانشور کر رہے ہیں۔ وہ کھلے عام یہ کہہ رہے ہیں پاکستان زیادہ اہم ہے یا کشمیر۔!

پاکستان کے بعض دانشوروں اور ماہرین کی نظر میں پاکستانی کی اقتصادی پوزیشن اس قدر گر چکی ہے کہ اگر ہم کشمیر پر خدانخواستہ کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تو پاکستان کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ ایک انتہائی غلط

اور مہلک تصور ہے جس ہندوستان کی پوزیشن کو تقویت ملتی ہے اور امریکہ مفادات کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس تجارت سے ہندوستان اچانک مضبوط اقتصادی لحاظ سے بہت مضبوط اور توانا ہو جائے گا اور پاکستان مزید کمزور۔ اگر پاکستان کو اقتصادی توانائی دلانا مقصود ہے تو پھر دشمن ملک سے ہی تجارت کو کیوں ضروری تصور کیا جارہا ہے۔ ایران سے کیوں تجارت نہیں کی جاتی۔؟ اسے تیل کے بدلے ہم اپنی مصنوعات فروخت کر سکتے ہیں۔ عراق ایک اسلامی ملک ہے اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ہم اسے برآمد کر سکتے ہیں اور بدلے میں اپنی تیل کی ضروریات پوری کر سکتے ہیں لیکن ان اسلامی ممالک پر تو نام نہاد دہشت گردی کا الزام لگا کر ان سے ہمارا زمینی تجارت کا راستہ بند کر دیا گیا ہے اور ہمیں مجبور کیا جارہا ہے کہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے قاتلوں سے تجارت کرو۔ وہ ہم پر دباؤ بڑھاتے رہیں گے جب تک ہم ہندوستان سے تجارت کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔

اس ساری کوشش کا اہم ہدف یہ ہے کہ پاکستان دفاعی بجٹ کو کم کرے اور مسئلہ کشمیر کو پس منظر میں رکھنا تسلیم کر لے۔ ہمیں کسی قیمت پر یہ بات قبول کرنی چاہیے۔ یہ ایک مدافعانہ اور غیروں کی مسلط کردہ پالیسی ہوگی۔ خطرناک بات یہ ہے کہ اس حوالے سے بازگشت ابھی سے سنائی دے رہی ہے اور اگر ایسا ہوا تو ہم یہ تصور کر لیں کہ ہم نے ہندوستان کو بالادستی کا سرٹیفیکیٹ دے دیا۔ اس کے بعد ہر شعور شخص یہ سمجھ سکتا ہے پاکستان کے وجود کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس صورت میں پاکستان کو اپنے نظریے کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ اور اسے اپنے دفاع سے بھی ہاتھ کھینچنا پڑے گا۔

امریکی پروگرام کا چوتھا پہلو کشمیر کی تحریک جہاد کو ختم کرنا ہے۔ کشمیر میں اس وقت عملی جہاد جاری ہے جس نے پورے خطے کے مسلمانوں کو ایک نئی سوچ دی ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اگر چہ وہ اس جہاد میں عملی طور پر شریک نہیں لیکن ان میں بیداری ضرور پیدا ہو رہی ہے۔ امریکہ اس جہاد کو کچلنا چاہتا ہے۔ اگر بھارت سے پاکستان کی تجارت کے یہ اقدامات کامیابی سے ہمکنار ہو گئے تو کشمیر کا جہاد خود بخود کمزور پڑ جائیگا۔ امریکہ بیک وقت چار شکار کرنا چاہتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اپنے ملٹی نیشنلز کے ذریعے وسط ایشیاء تک رسائی حاصل کر کے اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتا ہے اور اس ضمن میں یہ قطعی اور واضح بات ہے کہ امریکہ کا پاکستان کو مفاد کوئی عزیز نہیں۔

۲۔ قبل اس کے کہ چین اور روس کے باہمی تعلقات اس قدر مضبوط ہو جائیں کہ وسط ایشیاء میں تجارتی اور دفاعی لحاظ سے کوئی اہم حیثیت اختیار کر لیں امریکہ وہاں قدم جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایران کو بھی قابو میں لانا چاہتے ہیں۔

۳۔ پاکستانی دفاعی بجٹ میں کم ...... پاکستانی حکمران معاشی تباہ حالی سے نجات ذیل میں بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ چوری ہونے والی اور باہر منتقل ہونے والی رقوم اس سے کہیں زیادہ ہیں لیکن آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے چھوڑے ہوئے دانشور اس سچائی کو بھلا کر محض دفاعی بجٹ کو کم کرنے کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔

۴۔ مسئلہ کشمیر کو پس منظر میں لے جانا ...... اس طرح کہ اس تحریک آزادی اور تحریک جہاد کو ختم کرنے کی

کوشش کرنا جو بھارت کی بالادستی کے لیے مستقل خطرہ ہے۔

میری اطلاع کے مطابق پاکستان کے دفاعی بجٹ میں ۳۰ فیصد کی کمی کی باقاعدہ تجویز پہلے ہی دے دی گئی ہے۔ اب آپ خود اندازہ کریں ۳۰ فیصد کمی کی تجویز بھی دیتے ہیں اور ایف سولہ بھی نہیں دیتے، ہماری رقم بھی کھا جاتے ہیں اور پھر ہم سے اپنی تمام شرائط بھی منواتے ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے مالیاتی ادارے یہ سارے معاملات طے کرتے ہیں۔ جب کہ ہندوستان ہر بار بجٹ میں روز افزوں اضافہ کر رہا ہے۔ ان کو آخر کیا خطرہ ہے کہ اپنے بجٹ میں اضافہ کر رہے ہیں لیکن ان کے دفاعی بجٹ کو کم کرنے کے لیے کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ صرف ہم پر ہی بجٹ کم کرنے کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجارت کا یہ کارڈ امریکہ کھیلنا چاہتا ہے۔ بھارت کے پردے میں امریکہ بول رہا ہے۔ ہمارا بھی یہی ٹرمپ کارڈ ہے۔ میں نے حکومت پاکستان کو یہ تجاویز دی ہیں۔ اور کہہ دیا ہے کہ ہمارا ٹرمپ کارڈ یہی ہے اس کا ضائع نہ کریں۔ ہم تجارت کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے بنیادی مسائل حل کریں۔ ہمیں آنکھ بند کر کے دوسروں کے ایجنڈے پر عمل کرنے کے بجائے بھارت سے تجارت کے خطرناک مضمرات پر غور کرنا ہوگا۔ آج اگر ہم نے امریکہ سے کوئی بات منوانی ہے ہمارے پاس کوئی کارڈ نہیں سوائے تجارت کے کیونکہ تجارت میں اصل مفاد امریکہ کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا امریکہ اس کے ذریعے وسط ایشیاء پر قبضہ کر کے اپنی اقتصادی پوزیشن اور دفاعی پوزیشن بہتر کرنا چاہتا ہے اور اپنے عوام اور سرمایہ داروں کو بھی خوش کرنا چاہتا ہے۔ جہاد کو بھی کچلنا چاہتا ہے۔ اور پاکستان کے دفاعی بجٹ کو کم بلکہ ختم کرنا ہی اس کی تمنا ہے۔ اس کے ساتھ وہ پاکستانی افواج کو بھی اس حالت پر لانا چاہتا ہے محض امن قائم کرنے والی فوج (Peace Keeping) بن کر اس کے تابع فرمان رہے۔

یاد رکھیے! ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے امریکہ خود قربانی دینے کو تیار نہیں یہ حقیقت صومالیہ میں امریکی فوج کے کردار نے واضح کر دی ہے۔ امریکی اپنے مفادات کے لیے دوسری قوموں کو قربانی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ استعماری منصوبہ سازی کا سبق انہوں نے انگریز سے سیکھا ہے تاہم انگریز اپنے زیر تسلط ممالک سے جانی و مالی قربانی لینے کے ساتھ ساتھ خود بھی قربانی دیتا تھا مگر امریکیوں کی بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ خود قربانی نہیں دیتے۔ عراق کی کامیاب مہم کے بعد ان کا خیال تھا کہ وہ اب کمزور اقوام پر چڑھ دوڑیں گے تو کوئی مزاحم نہ ہوگا لیکن صومالیہ پر چوٹ پر بلبلا اُٹھے۔ اب وہ ہماری فوج کو قربانی دینے کی پوزیشن میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستانی فوجی محض کرائے کے فوجی بن کر رہ جائیں ہمیں امریکیوں کی خواہشات کا ایندھن بننے سے بچنا ہوگا۔

ہمیں تجارت کے مصنوعی اعداد و شمار سے فیصلہ نہیں کرنا چاہیے اور نہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں ہمارا فائدہ ہے۔ بڑے مقاصد میں محض مادی مفادات کو سامنے نہیں رکھا جا سکتا۔ اس وقت تجارت کا کارڈ ہندوستان نہیں امریکہ کھیل رہا ہے۔ جو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو اس کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان مالیاتی اداروں میں رقم دوسروں کی جاتی ہے مگر آئی ایم ایف کے بورڈ میں امریکہ کو ۲۷ فیصد نمائندگی حاصل ہے۔ یعنی ان کا ایک ووٹ ۲۷ ووٹوں کے برابر گنا جاتا ہے۔ اس طرح دراصل

امریکہ کو آئی ایم ایف میں ویٹو حاصل ہے۔ یہ ویٹو پاور سلامتی کونسل کی پاور سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس میں زیادہ رقم عربوں کی ہے لیکن اس کے سرمائے پر ویٹو پاور امریکہ استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن قائم کر کے بھی اپنے ذاتی مفادات کو تحفظ دیا ہے۔ اب تک ان کے اقدامات میں کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس میں کسی دوسرے کو کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ محض امریکہ فائدہ دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں تجارت ضرور کرنی چاہیے یہ سنت نبوی ﷺ ہے لیکن جب تجارت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس میں دوروں کو فائدہ اور ہمارا نقصان ہو تو پھر ہمیں اس تجارت کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیے۔

یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان نے آج تک کبھی کسی معاہدے کو نہیں نبھایا۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنی اشیاء برآمد کریں گے ان کو سبسڈائز کریں گے کیونکہ وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ اپنی اشیاء کو امدادی قیمت پر خرید کر ہمیں کم قیمت پر فروخت کریں۔ اس سے ہماری صنعت کا بھٹا بیٹھ جائے گا۔ یہ حقیقت حکومت پاکستان کے علم میں ہے کہ غیر منقسم پاکستان کے دور میں وہ مشرقی پاکستان کو یہ باور کراتے رہے کہ تمہاری پٹ سن سے مغربی پاکستان پل رہا ہے مگر بنگلہ دیش بن جانے کے بعد وہاں کی پٹ سن کی صنعت کو سب سے زیادہ نقصان ہندوستان نے پہنچایا۔ اس وقت شیخ مجیب الرحمٰن کہتا تھا اسلام آباد کی سڑکوں سے اپنے سنہری ریشے کی خوشبو آ رہی ہے آج اسی پٹ سن کی صنعت ہندوستان نے برباد کر کے رکھ دی ہے۔ گارمنٹس کی صنعت نے انہیں بچا لیا ورنہ ہندوستان نے اس مکمل اقتصادی تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بھارت نے بنگلہ دیش کے ساتھ ہر معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ فرخا بیراج کے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی کی۔ حال ہی میں اس نے بنگلہ دیش کا پانی ان ایام میں بند کر دیا جب بنگلہ دیش کو پانی کی سخت ضرورت تھی۔ اس طرح ان کا سستا چاول خرید کر انہی کو مہنگا فروخت کر دیا جاتا ہے۔ نیپال جو دوسرا ہندو ملک ہے۔ اس کی اقتصادی ناکہ بندی کی گئی ہے۔ سری لنکا کی تجارت بڑھی تو وہاں دہشت گردی شروع کرا دی۔ سری لنکا کی نوے فیصد آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ جے وردھنے کے زمانے میں وہاں کی صنعت زبردست ترقی کر رہی تھی۔ ہندوستان نے ان کا بھی بیڑا غرق کر دیا ہندوستان کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ تجارت کے ذریعے پاکستان جیسے دشمن ملک کو خوشحال بنا دے۔

بقول گجرال کے پاکستان اور بھارت کے درمیان چوتھی جنگ جاری ہے!

# عراق کے خلاف امریکی جارحیت

## روزنامہ پاکستان اسلام آباد مورخہ 24 مارچ 2003ء بروز پیر

20 مارچ 2003ء کے بعد دنیا مختلف ہوگئی تاریخ ایک نئی کروٹ لے رہی ہے، اس تبدیلی کو رد کا نہیں جا سکتا، لیکن ضروری نہیں کہ اس کے تمام نتائج تباہ کن ہی ہوں، یہ ایک تاریخی تغیر ہے، اس کے مثبت نتائج بھی نکل سکتے ہیں، امریکہ نے اپنی بصیرت کے مطابق دنیا کا ایک نقشہ سوچ رکھا ہے اس نے اس کے مطابق چند کام کرنے ہیں اور وہ بڑی سختی سے اپنے تیار کردہ نقشے پر عمل درآمد کر رہا ہے اس سے وہ ٹلے گا نہیں۔ امریکی عزائم کے خلاف پوری دنیا میں جو ردعمل پیدا ہوا ہے اس کے نتیجے میں امریکہ کے عزائم میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ وہ مزید قوت کے ساتھ حملہ آور ہوگا تاکہ اس بات کو ہمیشہ کے لیے بند کر دے دوسری طرف فرانس، جرمنی سمیت تمام دوسرے بڑے ممالک کو اپنی معیشت بچانے کے لیے تیل کی ضرورت ہے اگر امریکہ آگے بڑھ کر تیل پر قبضہ کر لیتا ہے تو پھر دوسرے ممالک قطار میں کھڑے ہو کر اپنا حصہ مانگنے پر مجبور ہوں گے امریکی دانشور بڑے عرصے سے اس موضوع پر بحث کر رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر مغربی ممالک ساتھ نہیں دیتے تو اکیلے ہی ہمیں یہ کام کر گزرنا چاہیے اگر ہم نے اس قوت یہ کام کرنے میں کوتاہی کی تو پھر کبھی نہیں کر سکیں گے وہ اسے Window of Opportunity کہتے ہیں ان کا خیال ہے اگر یہ تاریخی موقع نکل گیا اور وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکے تو یہ ان کی بدترین غلطی ہوگی اس لیے اخلاقی جواز کی تلاش اور دوستوں اور حواریوں کی منت سماجت میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے یہ کام ہم خود کریں۔ البتہ انہیں موقع دیں کہ وہ ہماری شرائط پر ہماری صف میں شامل ہو جائیں اسی سوچ پر امریکہ میں پالیسیاں بن رہی ہیں اس میں شبہ نہیں کہ مخالف سوچ بھی کافی طاقتور ہے، لیکن پالیسی سازی میں اس کا سوچ کا کوئی کردار نہیں۔

امریکی نصب العین یہ ہے کہ دنیا کے توانائی کے تمام وسائل اس کی گرفت میں آ جائیں ایک مرتبہ امریکہ توانائی کے ان وسائل پر قبضہ کر لیتا ہے تو دنیا کی جتنی ابھرتی ہوئی معیشتیں ہیں (خصوصاً چین کی معیشت) ان سب کو اپنی مرضی سے چلا سکتا ہے پھر یہ اس کی مرضی ہوگی کہ کوئی معیشت کتنی اور کس حد تک ترقی کرے تیل کی قیمتوں میں کنٹرول کرنے کے بعد دنیا بھر کی معیشت کو اپنی مٹھی میں لے لینا ایسے ہی ممکن ہے جیسے کسی منڈی میں تنہا آڑھتی کے پاس تمام اشیاء کی قیمتوں کے گھٹانے بڑھانے کا اختیار ہو۔ ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ آئندہ پچیس سال میں چین کی معیشت سولہ گناہ بڑھ جائے گی اور یہ آج کی امریکی معیشت سے دگنی ہو جائے گی

یہ تخمینہ چین کی معیشت کی تیز رفتار ترقی کے تناسب سے لگایا گیا ہے امریکی معیشت بلندی پر پہنچنے کے بعد سست رفتار ہوگئی ہے تاہم چین کی ابھرتی ہوئی معیشت کو بھی تیل کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی امریکہ کو تیل کے ذخائر پر قبضہ کر کے چین کی معاشی ترقی پر امریکی مرضی کے مطابق قدغن لگائی جا سکتی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر آئندہ 40,35 برس تک چلیں گے، جب کہ اس کے بعد وسط ایشیا کے وسائل استعمال کرنے کی باری آئے گی جو 125 برس تک کام آئیں گے یہ عجیب بات ہے کہ تیل کے سارے ذخائر مسلمان ممالک میں ہیں امریکہ تیل کے ان تمام ذخائر کو اپنی گرفت میں لے لینا چاہتا ہے لہٰذا مسلم ممالک سے تعلقات بگاڑنا اس کی ''مجبوری'' ہے اس مقصد کے لیے امریکہ نئے خود ساختہ اصول پر کاربند ہے یعنی اسے دوسروں کا یہ حق تسلیم نہیں کہ یہ میرا علاقہ، میرا خطہ میرا ملک ہے اور اس کے وسائل بھی میرے ہیں امریکی دلیل بڑی دلچسپ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ڈوبتی ہوئی مغربی تہذیب کو جو خوراک مل رہی ہے وہ تیل کے ذریعے مل رہی ہے۔ تیل سے محرومی اس کی بقا کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے اس لیے تیل پر کسی دوسرے کا تسلط نا قابل قبول ہے امریکی کہتے ہیں کہ یہ آپ کے علاقے میں تو ہو سکتا ہے لیکن آپ کی ملکیت نہیں ہو سکتا اب وہ کھلم کھلا اس کا اظہار تو نہیں کر سکتے مگر یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے ہم کہتے ہیں کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے ہمارا پانی وہاں سے آتا ہے ہماری معیشت، ہماری زندگی اور ہمارے دفاع کا تمام تر انحصار اس پر ہے۔ اگر پانی کسی اور کے ہاتھ میں ہوگا تو ہماری اقتصادی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اگرچہ کشمیر اور پاکستان کا اصل رشتہ نظریاتی ہے، جبکہ مغربی تہذیب کا تمام تر دارومدار توانائی کے ذرائع پر ہے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان ذرائع پر ان کا قبضہ ہونا چاہیے۔

امریکہ کا ایک ویژن یہ بھی ہے کہ آنے والے برسوں میں چین اس کے بلاشرکت غیرے اقتدار کے لیے چیلنج بن سکتا ہے روس دوبارہ بیدار ہو سکتا ہے۔ روس اور چین دونوں مل کر بھی ایک قوت بن سکتے ہیں اور ممالک کا مشرقی وسطیٰ سمیت دفاعی اہمیت کے علاقوں میں داخل ہونا امریکہ اپنے مفادات کے لیے مضر خیال کرتا ہے۔ اس لیے امریکی سوچ یہ ہے کہ ان علاقوں میں اپنے فوجی اڈے قائم کر کے ان کی امداد کو روکا جائے جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اگر مسلمان ممالک کے ساتھ امریکہ کی دوستی تھی تو دشمنی کی ضرورت کیوں پڑی؟ مسلمان ممالک اور امریکہ کے درمیان فاصلے بڑھانا کیوں ضروری ہو گیا اور امریکہ مسلمان ممالک کو تباہ کرنے پر کیوں تل گیا ہے......؟ تو دراصل اس دشمنی کے پیچھے اسرائیل کا ہاتھ ہے اسرائیل اپنی سلامتی کی خاطر امریکہ کو مسلم ممالک سے ٹکراؤ کے راستے پر لے جا رہا ہے وہ امریکہ کی طاقت کو استعمال کر کے اپنے راستے کی رکاوٹوں کو دور کر رہا ہے اسرائیل ہر اس ملک کو ہتھیاروں سے محروم کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔

## عراق کے بعد!

میں سمجھتا ہوں عراق اسرائیل کے لیے اتنا خطرناک نہیں جتنا پاکستان ہے، بلکہ وہ تمام مسلم ممالک جہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مزاحمت ہو رہی ہے، اسرائیل ان کو بہت بڑا خطرہ ہے خیال کرتا ہے ان کو ختم

کرنا اور وہاں موجود جہاد کی روح کو کچل دینا اسرائیلی اہداف میں شامل ہے پاکستان جہاد کی روح سے آشنا ہے اور اس سے جہاد کے سوتے پھوٹ رہے ہیں یہ پاکستان اسلام کے انصاف پر مبنی نظام کے نفاذ کا داعی ہے اس کے پاس ایک مضبوط فوج ہے اور سارے خطے پر اس کے اچھے خاصے اثرات ہیں لہٰذا پاکستان بھی اسرائیلی عزائم کی زد میں آسکتا ہے وہ موقع سے فائدہ اُٹھانے سے کبھی نہیں چوکے گا۔

جب ہم تیل کی بات کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ عراق کے پاس دنیا کا بارہ فیصد تیل ہے، جبکہ سعودی عرب کے پاس چھبیس ستائیس فیصد ہے۔ اگر تیل کی ہوس ان کو عراق لے جارہی ہے تو پھر تیل کی پیاس سعودی عرب اور ایران بھی لے جائے گی۔ اگر ان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے خوف ہے تو بھی سعودی عرب ان کا نشانہ ہوسکتا ہے ''فنڈا منٹلسٹ اسلام'' کے تمام تر سرچشمے تو سعودی عرب سے پھوٹتے ہیں جہاد افغانستان کے لیے سعودی عرب نے سب سے زیادہ سرمایہ فراہم کیا لہٰذا اسرائیل اس ملک سے سب سے زیادہ خطرہ محسوس کرے گا پھر اسرائیل تو اس سرزمین پر دعویٰ بھی رکھتا ہے لہٰذا ان کے اہداف اس وقت تک پورے نہیں ہوں گے جب تک وہ سعودی عرب کو جارحیت کا نشانہ نہیں بنالیں گے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اگر سعودی عرب ان کا دوسرا ہدف بنتا ہے تو پھر سعودی عرب کا دفاع کون کرے گا؟ سعودی عرب کی پوزیشن سب سے کمزور نظر آتی ہے ایران کی پشت پر روس کھڑا ہے، اس لیے کہ روس خلیج کے علاقے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے جو ایران کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہ ایک ایٹمی ملک ہے اور یہ چین کا دوست اور اس کے پڑوس میں واقع ہے۔ چین بے شک کوئی سرگرم کردار ادا نہ کرے پھر بھی امریکہ کو ایک بار نہیں سو بار سوچنا ہوگا کہ پاکستان کے معاملے میں چین کا ردعمل کیا ہوسکتا ہے۔ جیسے وہ شمالی کوریا کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے چین کا ردعمل دیکھتے ہیں پاکستان میں بارے میں بھی چین کی وجہ سے ہچکچاہٹ ہوگی۔ سعودی عرب اپنے نظریے میں اور اسرائیل کی سلامتی کے حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے، لیکن سعودی عرب نے خود کو امریکہ کے ساتھ ملحق کر رکھا ہے اس لیے وہ بے سہارا ہوکر رہ گیا ہے آج میں کھل کر کہتا ہوں کہ اگر سعودی عرب کی کوئی مدد کرسکتا ہے تو وہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت، جذبہ جہاد اور ملک کے اندر دفاع کرنے کی خواہش بہت اہمیت کی حامل ہے سعودی عرب کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ امریکہ کے بجائے قوم کے جذبہ حریت جہاد اور شوق شہادت پر انحصار کرے۔

اس بغاوت کے پیچھے ''عالم گیریت مخالف'' (Anti Globalization) عناصر متحرک ہیں یہ طاقت در تحریک ہے جو پوری سامراج اور مغربی استعمار کے خلاف یورپ میں اٹھی ہے دراصل یہی سوشلسٹ موومنٹ کا دوسرا نام ہے۔ روس کی شکست و ریخت کے بعد سوشلسٹ تحریک کا نظریہ غتربود ہوگیا، لیکن وہ حالات تو موجود ہیں جن سے یہ نظریہ زندگی حاصل کرتا تھا لوگوں کے مسائل حل تو نہیں ہوئے تو آبادیاتی سوچ بھی زندہ ہے اور انسانی استحصال پہلے سے بدتر شکل میں موجود ہے۔ عالم گیریت کے نام پر فروغ دینے کی مغربی تمدن کی کوششوں کی مخالفت یورپ، افریقہ اور ایشیا میں موجود ہے اس تحریک کا نیا نام ''اینٹی گلوبلائزیشن'' ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا بھر میں دو سابق حریف اسلامسٹ اور سوشلسٹ اکٹھے ہورہے ہیں اس تحریک کے زیر اثر مغربی طاقتوں کے اندر خود دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ فرانس اور جرمنی کھل کر سامنے آگئے ہیں برطانیہ میں ٹونی بلیئر کے خلاف بغاوت

ہو رہی ہے امریکہ کے خلاف سب سے بڑے جلوس برمنگھم، برسلز اور روم میں نکلے، اس کا مطلب یہ ہے کہ معاہدہ بحر اوقیانوس ٹوٹنے کو ہے۔

دوسری طرف اقوام متحدہ کا ڈھانچہ بھی لرز رہا ہے اقوام متحدہ لیگ آف نیشن کا نیا روپ تھی دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے حملے کے بعد وہ ختم ہوئی تو 1945ء میں اقوام متحدہ بنی۔ امریکہ واحد سر پاور کے طور پر ابھرا تو اس ادارے کو جنگ روکنے کے بجائے جنگ چھیڑنے کا ادارہ بنا دیا، امریکہ اسے اپنے مفادات پروان چڑھانے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ وہ طاقت ور ہے اس لیے آج تک سارے ادارے اس کے ہاں میں ہاں ملاتے رہے، لیکن اب ہوا کا روخ بدل رہا ہے ہم نے پہلے عراق میں دیکھا پھر صومالیہ اور افغانستان میں یہ منظر دیکھا کہ اقوام متحدہ نے امریکہ کو کمزور ملکوں پر حملے کی کھلی اجازت دی کوسوا پر حملہ ہوا۔ جہاں اقوام متحدہ سے اجازت لینے کا اصول توڑ دیا گیا اسی کو بنیاد بنا کر اب وہ اعلانیہ اقوام متحدہ سے بالا عراق پر حملے کا اعلان کر رہے ہیں۔ تاہم یہاں جارج بش سے ایک فاش غلطی ہوئی اگر وہ کہ سوا پر حملے کی طرح قرارداد نمبر 1441 کا سہارا لے کر عراق پر حملے کر دیتا تو اپنے مقاصد حاصل کر چکا ہوتا اس کے بجائے اسے اقوام متحدہ کا راستہ دکھایا گیا جہاں مخالفت سامنے آ گئی اب وہ اقوام متحدہ کو دھمکی دے رہا ہے کہ اگر تم میری نہیں مانو گے تو میں اپنے طور پر یہ کرلوں گا۔ عراق پر حملے میں تاخیر امریکہ کو مہنگی پڑی ہے دوسرے ممالک نے موقعے سے فائدہ اٹھالیا عراق کے معاملے کے خلاف اس طرح کی بغاوت ہو جاتی وہ صریحاً ایک ناجائز کام تھا اقوام متحدہ کوئی بہانہ کرنے کے بجائے کہہ دیتی کہ اسامہ بن لادن کو عدالت میں پیش کیا جائے وہاں ہمارے صدر صاحب سے فاش غلطی ہوئی اب امریکہ اس دام میں آ گیا اپنے اتحادیوں کی بغاوت فرو کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ امریکہ ''واردات'' کر گزرے، اگر ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ دنیا کی سپر پاور نہیں رہے گا اگر ان کی مرضی نہ چل سکی جسے وہ ضروری سمجھتے ہیں تو پھر مغربی دنیا کے لیے اور مغربی تہذیب کے لیے ان کا قائدانہ سٹیٹس متاثر اور مجروح ہو جائے گا، اگر ''سپریم'' ہونے کا تصور ٹوٹ گیا ہے تو پھر ان کے پیچھے راستہ ہوگا'' آگے نہیں۔

### ورلڈ آرڈ

امریکہ کے لیے عراق کی کمزوری سب سے بڑی ترغیب ہے اگر عراق کے پاس مزاحمت کی معمولی صلاحیت بھی ہوتی تو اسرائیل بھی امریکہ کو حملہ کی ترغیب نہ دیتا۔ اگر عراق کے پاس واقع دس ہزار لیٹر انتھراکس اور کیمیکل ہتھیار ہوتے تو اسرائیل خوف کا شکار ہوتا کہ حملے کی صورت میں عراق اسے ملیا میٹ نہ کر دے۔ اگر اسرائیل امریکہ کو اکسا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے عراق کے پاس کچھ نہیں، شمالی کوریا کہ پاس ''کچھ'' ہے تو اس سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی۔ اس کے پاس تھوڑے ہی جوہری ہتھیار سہی، مگر اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا خطرہ مول لینا مشکل ہے دوسری طرف خلیج میں فوجوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک بڑا منصوبہ ہے ورنہ اتنی فوج کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایک عسکری نظریہ بھی سامنے آ رہا ہے کہ ایک ایکشن اور دوسری ایکشن کے درمیان زیادہ وقفہ نہ ہو۔ جیسے افغانستان اور عراق کے ایکشن میں کافی وقفہ پیدا ہو گیا، جس سے ان کے لیے مسائل پیدا ہو رہے ہیں

اگر یہ وقفے کم کردیئے جائیں اور ایک ہی حملے کی لپیٹ میں اس خطے کے سارے اہداف آجائیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے۔

عین ممکن ہے اسی حملے میں عراق کے ساتھ دوسرے ممالک سے نمٹنے کا فیصلہ بھی کرلیا گیا ہو اسی لیے امریکی فوج کی تعداد تین لاکھ ہوگئی ہے حالانکہ انہوں نے شروع میں کہا تھا کہ فوجوں کی تعداد دو لاکھ سے کم ہوگی اب تین لاکھ سے بھی بڑھانے پر غور کررہے ہیں۔ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے سے بھی باز نہیں آئیں گے ظاہر ہے نیوکلیئر ہتھیار عراق کے خلاف تو استعمال نہیں ہوگا۔ یہ کسی اور طرف اشارہ ہے چنانچہ اب بات بڑی واضح ہوگئی ہے ہم سب کو اس پر نظر رکھنی چاہیے عین ممکن ہے۔ وہ ایک ہی حملے میں سب کو ختم کرنا چاہتے ہوں وہ زیادہ وقت بھی نہیں لینا چاہتے۔ ہمارے پاس بھی زیادہ وقت نہیں یہ معرکہ بالکل فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب نیو ورلڈ آرڈر کا فلسفہ پیش کیا گیا تو اس وقت ہی طے کردیا گیا تھا کہ دنیا میں اپنی مرضی کا ایک نیا نظام قائم کرنا ہے۔ نیا نظام اس نظریے کی عملی تشکیل پر مبنی تھا کہ امریکہ دنیا کی تاریخ کا طاقت ور ترین ملک ہے امریکی عقل و دانش کے مطابق اس کی تہذیب سب سے بہتر ثابت ہوچکی ہے اس کے سامنے باقی تہذیبیں ثقافتیں اور طاقتیں ناقص اور کم تر ہیں۔ ان کم تر تہذیبوں کا فرض ہے کہ اس کے سامنے سر جھکائیں دنیا ایک گلوبل ویلج ہے اور اس کا چوہدری امریکہ ہوگا جو سارے فیصلے کرے گا۔ چوہدری اپنا یہ فیصلہ دنیا سے منوانا چاہتا ہے کہ اس کے مفادات دنیا کے مفادات ہوں گے کسی کو امریکہ کی چوہدراہٹ پر اعتراض نہ ہوتا بشرطیکہ چوہدری اپنی رعایا کے معاملے میں انصاف کرتا۔ اس کا نظام چل سکتا تھا اگر وہ منصفانہ ہوتا لیکن یہ جنگل کا قانون رائج کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس نظریے سے پرانے تصورات ختم ہوجاتے ہیں یہ تصور بھی مسترد کر دیا گیا کہ ہر ریاست کی خودمختاری اور آزادی کا احترام کیا جائے۔ آج اس انسانی آزادی کا بنیادی اصول بھی قبول نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم چوہدری ہیں اس لیے ہر جگہ صرف ہمارا حکم چلے گا۔ دنیا جس سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی بنیاد پر قائم تھی امریکہ اس کو بدلنے پر تلا ہوا ہے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں ٹیرف کا اصول اس کی مرضی سے آیا ہے، کوٹا سسٹم شامل کیا گیا، کام اپنی صوابدید پر تقسیم کردیئے۔ یہ میں کروں گا وہ تم کرو اس ورلڈ آرڈر میں یہ بھی طے پایا کہ ہمیں ایسی جمہوریت بھی قبول نہیں جو ملکوں کو آزادی دلائے اور وہ اپنی من مانی کرتے پھریں۔ کمزور ممالک کو اپنی مرضی پر چلانے کا فیصلہ ہوا کہ ہم اپنی مرضی کے حکمران تیار کریں۔ ہر ملک سے کہا گیا ہمارے لیے جو حکمران ناپسندیدہ ہیں وہ تم بدل دو یا ہم بدل دیں گے، آئندہ جو بھی حاکم ہوگا، وہ ہماری ماتحتی کرے گا۔ نیو ورلڈ آرڈر ایک گلوبل ڈکٹیٹر شپ کا فلسفہ پیش کرتا ہے جس میں بہت سے ممالک شریک ہیں ان میں سے بعض کو ''اتحادی'' کہا جاتا ہے اور بعض کو ''پارٹنر'' کہا جاتا ہے مثلاً پاکستان ''اتحادی'' ہے مگر اسے پارٹنر نہیں کہا گیا۔ کچھ کو پارٹنر کہا جاتا ہے جن میں چین اور بھارت شامل ہیں روس کو بھی پارٹنر کہا گیا دراصل جس کے پاس طاقت ہے، وہ پارٹنر ہے اور جو کم طاقتور ہے، اسے اتحادی قرار دیا گیا۔ اسی نیو ورلڈ آرڈر کے تحت عالم اسلام کو آپشن دیا گیا کہ وہ ماتحت رہ کر کام کرے ورنہ تباہ ہونے کے لیے تیار ہوجائے۔

## کامیابی میں ناکامی

امریکہ ماضی قریب میں کئی بار غلطیاں کر چکا ہے کئی باراس کی مہم جوئی امریکیوں نے ناکام بنادیا ایک مرحلے پر امریکی خود جنگ میں کودنے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن واپسی پر بھی خود ہی مجبور کرتے ہیں۔ اس لیے جنگ اکثر مہنگی پڑتی ہے اور امریکی عوام ہی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ویت نام کی مثال ہمارے سامنے ہے چنانچہ اب کی بار امریکی حکومت نے جہاں باہر کی مزاحمت کو روکنے کی تیاری کی ہے وہاں اندرونی مزاحمت کے خلاف بھی پیش بندی کی ہے۔ امریکی عوام کو خوف زدہ کرنا اسی تیاری کا حصہ ہے امریکیوں کو اس وقت تک خوف میں جتلا رکھنا ضروری ہے، جب تک سارے اہداف پورے نہیں کر لیے جاتے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ نظر آیا کہ انہیں دہشت گردی سے خوف زدہ کیا جائے لیکن دہشت گردی کی ایک خوراک ہی کافی نہیں، مسلسل خوف میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف قسم کے خوف بار بار کاشت کیے جائیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں موقع پر حملہ ہوگا، فلاں شہر میں یہ حادثہ ہوگا، فوج میں حملہ ہوگا یا سرکاری تنصیباب کو نشانہ بنایا جائے گا کہیں انتھراکس کا خوف پھیلایا جاتا ہے تو کہیں جوہری حملے کا جھانسہ جس روز امریکی خوف سے باہر نکل آئیں گے حکمران عوام کی تائید سے محروم ہو جائیں گے پھر وہ ان سے پوچھیں گے کہ ہمارے بچوں کو کیوں مروا رہے ہو؟

یقیناً اس پالیسی کے امریکہ پر منفی نتائج مرتب ہوئے ہیں دراصل امریکہ کے پاس کوئی کلچر اور کوئی تمدن نہیں رہا۔ امریکہ کا اپنا کوئی ویژن نہیں امریکی سماج کا جینا مرنا ''ہل من مزید'' تک محدود ہو چکا ہے امریکی ویژن میں سکھ چین ...... آسائش زندگی، جنس اور میوزک، گاڑیاں اور عیش ہی سب کچھ بن گیا ہے عیش پرستی سے قومیں کردار سے محروم ہو جاتی ہیں اس سے امریکی دانش وشعور پر گہری ضرب لگی ہے امریکہ اپنے بلند آدرش سے محروم ہو رہا ہے ...... جس امریکن ویژن میں شہری آزادیاں بدرجہ اتم تھیں، وہ دھندلا گیا ہے کسی امریکی پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا جب تک اس نے کوئی جرم نہ کیا ہو، تم سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ تم کون ہو کیا کر رہے ہو؟ یہ اس معاشرے کی خوبی تھی ...... امریکہ چونکہ دو بہت بڑے سمندروں بحرالکاہل اور بحراوقیانوس کے درمیان واقع ہے، اس سے امریکہ خود کو محفوظ سمجھتا تھا لیکن امریکہ کو اندر سے جس سے خوف میں مبتلا کیا جا رہا ہے اس کے بعد وہ ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے محصور ہو گئے ہیں وہ سمندروں نے جو تحفظ دے رکھا تھا وہ ختم ہو گیا ہے انہوں نے ہوم لینڈ سیکورٹی فورس کے نام سے ایک ایجنسی قائم کی ہے جو غیر ملکیوں کی نقل وحرکت پر نظر تو رکھتی ہے خود امریکی بھی اس کی زد میں رہے ہیں۔ عوام کے لیے مصنوعی طور پر پیدا کیے گئے خوف نے ان کی آزادی بھی سلب کر لی ہے امریکہ کا ہر سفارتخانہ ایک چھوٹا سا قلعہ بن گیا ہے امریکی جمہوریت میں کسی کو مقدمہ چلائے بغیر جیل میں نہیں رکھا جا سکتا لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں لوگ بغیر کسی جرم کے جیلوں میں بند ہیں ان کی سپریم کورٹ انصاف دینے میں مشہور تھی اس نے بھی بے بسی کا اظہار کر دیا ہے۔ کہاں تو وہ نکاراگوا کے صدر نوریگا کو اٹھا کر لے آئے اور کہا کہ یہ ہمارے مجرم ہیں۔ پاکستان سے بھی بعض لوگوں کو مجرم قرار دے کر اٹھا لیا گیا، لیکن آج ان کی عدالت کیوبا کے پاس گوانتانا موبے میں رکھے گئے چھ سو قیدیوں کو انصاف دلانے سے عاجز ہے۔ امریکی

عظمت کو گہن لگ گیا ہے۔ معیشت تباہ ہو رہی ہے، ساری دنیا میں امریکہ کے لیے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔

میرے خیال میں اس مہم میں پہلا راؤنڈ صدام حسین نے پہلے ہی جیت لیا ہے۔ مغربی اتحاد میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور ساری دنیا کی رائے عامہ کھلم کھلا امریکہ کی مخالف اور عراق کی حامی بن گئی ہے دوسرے راؤنڈ کا ابھی آغاز نہیں ہوا، لیکن یقیناً امریکہ اسے جیت جائے گا اس کے پاس بے پناہ طاقت ہے تاہم راؤنڈ کے بعد تیسرا راؤنڈ ہوگا جو بہت پھیلے گا اور اس کے دوران تشدد اور دہشت گردی میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوگی اور اس کا عنوان بھی بدلے گا مستقبل میں دہشت گردی امریکہ کے خلاف عالمی مزاحمت کا حصہ تصور ہوگی یعنی Global war of attrition جسے آج امریکی ڈراؤنا خواب خیال کرتے ہیں حقیقت بن جائے گا اس راؤنڈ میں امریکی کانوں کی وہ فصل کاٹیں گے جو آج بو رہے ہیں۔ راؤنڈ تھری کافی عرصے تک چلے گا اور اس کے بعد چوتھا راؤنڈ بھی ضرور ہوگا جو میرے حساب میں چین جیتے گا کیوں کہ راؤنڈ تھری کے بعد امریکہ کو بھی تاریخ کے جبر کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ واپسی ناگزیر ہو جائے گی اس وقت امریکی عوام اس کی پالیسیوں پر لعن طعن کریں گے واپسی سے جو خلا پیدا ہوگا وہ خلا چین بغیر جنگ لڑے بھر دے گا۔

## پاکستان کی بقا کے لیے

میرے خیال میں آزادی کی حفاظت، قومی سلامتی اور ہر دشمن کے خلاف کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے...... اور وہ ہے قومی اتحاد قومی اتفاق رائے اور نظریے وابستگی ہماری قابل تسخیر قوت ہے قومی اتحاد بنیادی بات ہے۔ باقی تمام چیزیں ثانوی نہیں، قومی یکجہتی نظام سے نہیں بلکہ جمہوری طرز عمل سے آئے گی جمہوری نظام مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہم بھی اپنی دانش کے مطابق کوئی سا نظام اختیار کر سکتے ہیں وہ نہ چلے تو اسے بدل بھی سکتے ہیں لیکن جمہوری فکر اور کلچر پیدا کرنا ضروری ہے۔ اسلامی فلسفہ حیات کے مطابق شورائیت کا بطور طرز زندگی اختیار کیا جانا ضرور ہے رسول اللہ ﷺ نے جسے ''اجماع'' کہا ہے۔ ہمارے پاس قرآن وسنت موجود ہے، لیکن اجماع نہیں ہے یہ ہمارا قومی ضمیر ہے۔ اسے ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہونا چاہیے جمہوریت ہمارے اندر سے پھوٹنی چاہیے میرے خیال میں ہماری قومی وحدت کی عمارت تین ستونوں پر استوار ہوگی۔ جہاد...... جمہوریت...... اور جوہری صلاحیت ان تین عناصر سے ہماری قومی سلامتی اور بقا وابستہ ہے۔ ان تینوں پر ہم ڈٹ جائیں تو ہمیں کوئی نہیں مٹا سکتا 11 ستمبر کے بعد جو حالات پیش آئے صدر پاکستان نے جو فیصلے کیے ان کا بدترین نتیجہ یہ تھا کہ ہماری وحدت میں انتشار برپا ہو گیا قوم بٹ گئی ہم نظریاتی اعتبار سے تقسیم ہو گئے۔ اس ڈیڑھ برس میں اہم ترین کام جو ہم نے کرنا تھا وہ نہیں کیا اقوام کو متحد نہیں کیا گیا، بلکہ آج مزید منتشر کرنے پر تلے بیٹھے ہیں اس کے لیے ایک بار پھر میری تجویز ہے کہ قوم کے اکابرین (council of elders) کی ایک کونسل بنائی جائے۔ وہ لوگ جن کو اقتدار سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور نہ وہ اقتدار کا حصہ ہوں، وہی قوم کو متحد کرنے کے لیے پیشرفت کر سکتے ہیں، وہ جب تک میدان عمل میں نہیں آئیں گے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ متحدہ مجلس عمل قابل تعریف ہے کہ وہ قوم کو یکجا کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے، لیکن ان کے ساتھ پوری قوم کی وہ قربت اور لگاؤ پیدا ہیں ہوا جس کی ضرورت تھی آج ہمیں ایک ایسی سوچ کی ضرورت ہے قوم جس کا برضا اور غبت ساتھ دینے کو تیار ہو داخلی سطح پر اس وقت تمام

ادارے اور سیاسی دھڑے شریک اقتدار ہیں، ایم کیو ایم اور ایم ایم اس سے لیکر پیپلز پارٹی اور دیگر چھوٹی بڑی دینی اور سیاسی جماعتوں تک سب اقتدار میں شامل ہیں۔ مگر ان میں وحدت فکر و عمل مفقود ہے دوسرے قومی ادارے کا بھی یہی عالم ہے عدلیہ، انتظامیہ اور فوج سب ہی اقتدار میں شریک ہیں۔ عدلیہ نے توسیع ملازمت کے لیے حکومت کے سارے فیصلوں کو سند توثیق عطا کی فوج سول میں موجود ہے ایسا ہماری تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انتظامیہ اور این جی اوز کے ایماء پر نیا بلدیاتی نظام معرض وجود میں آیا ہے اب اگر قوم انقلاب کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو اسٹیبلشمنٹ سے اس کا ٹکراؤ یقین ہے۔ اس سے پہلے لوگ مایوس ہو کر بعض اداروں کا سہارا لیتے تھے کبھی فوج تو کبھی عدلیہ سہارا دیتی تھی۔ اب چونکہ ہر ایک جماعت اور ادارہ اقتدار کا حصہ ہے اس لیے متبادل ختم ہو گئے ہیں۔ اب دوٹوک فیصلہ ہوگا اور یہ وقت زیادہ دور نہیں، امن حالات میں اگر ایم ایم اے کی طرف سے بھی مایوسی پیدا ہوئی تو صورتحال بہت خوفناک ہو جائے گی۔ یہ امید کی ایک کرن ہے اور فی الوقت یہی ایک متبادل دکھائی دیتی ہے اس میں جہادی عناصر کا کردار سب سے اہم ہے۔ ایم ایم اے کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے جہاد کے اثرات کا ووٹ ملا ہے مولویت کا نہیں۔ یہ افغانستان کا درس تھا جس سے جہادی روح اور فکر بیدار ہوئی لہٰذا جہاد پر اب خاموشی اختیار کرنے کا وقت نہیں اس کی روح بیدار رکھنے کا وقت ہے جہاد ان کی اصل قوت ہے مگر کوئی اس کی بات نہیں کرتا جیسے ہم نے مغرب کی جہاد کے لیے دہشت گردی کی اصطلاح قبول کر لی ہے۔ فوج حکومت اور دوسرے سرکاری ادارے جہاد کے حوالے سے خاموش ہیں تو ان کا دباؤ قبول کرنا سمجھ میں آتا ہے لیکن ایم ایم اے نے مصلحت کی چادر کیوں تان لی ہے۔

زندہ قومیں مشکل وقت بھی اپنے عقائد ترک نہیں کرتیں، جہاد ہمارے لیے آپشن نہیں ہمارا عقیدہ ہے، فتح و شکست کی کوئی اہمیت نہیں اور فزیکل شکست خطرناک بھی نہیں، البتہ شکست تسلیم کرنا تباہی ہے جرمنی اور جاپان دوسری جنگ عظیم میں تباہ و برباد ہو گئے لیکن بیس سال بعد یہ دونوں دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی قوت بن کر ابھرے۔ جب کہ جنگ میں فاتح قرار پانے والے شرمندہ پھر رہے تھے اب یہ ہمارے لیے ایک موقع ہے بعض لوگ اسے بحران خیال کرتے ہیں لیکن میں ان سے اتفاق نہیں کرتا ایک بڑا چیلنج ہوگا اور قوم متحرک ہوگی تو پھر ہم کسی طرح بھی ناکام نہیں ہوں گے، بلکہ بڑے چیلنج کو قبول کرنے سے عظمت ملے گی لیکن ہماری مصلحت کوشی سے اگر قوم خوابیدہ ہوگئی تو پھر بحران ہمارے لیے تباہ کن بن جائے گا۔ یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں ہمارے پاس وافر خوراک ہے دنیا میں کم ملک ہیں جو خوراک میں خودکفیل ہیں بڑے بڑے امیر ممالک میں بھی خوراک کی کمی کا مسئلہ درپیش ہے۔

# ایران کے متعلق امریکی عزائم اور ہماری ذمہ داری

## (روزنامہ جنگ لاہور 13 نومبر 1995ء)

مسز رابن رافیل نے اپنے حالیہ دورہ پاکستان کے دوران اس سوال کے جواب میں کہا ''کہ امریکہ ایران سے مفاہمت کے لیے پاکستان کو کوئی خصوصی رول سونپنا چاہتا ہے''؟۔ برملا طور پر کہا کہ ہم تو ایران کو تنہا کرنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ ایران افغانستان میں مداخلت کر رہا ہے۔ البتہ انہوں نے اس سوال کا جواب دینے میں پہلو تہی کہ اور'' کون کون سے ممالک افغانستان میں مداخلت کر رہے ہیں۔'' مسز رابن رافیل کو بخوبی علم ہے کہ افغانستان میں مداخلت کہاں کہاں سے ہو رہی ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔ جنرل رشید دوستم اپنے ایک انٹرویو میں کہہ چکے ہیں کہ روس، ازبکستان اور ایران ان پر ربانی حکومت کی حمایت کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔

امریکی نائب وزیر خارجہ کے اس بیان سے ایک بار پھر وہ تمام خدشات ابھر کر سامنے آگئے ہیں جو اس خطے، بالخصوص پاکستان کی سیاست و معیشت پر گہرے اثرات ڈال سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں رابن رافیل کے نقطہ نظر (ایران کو تنہا کرنا) کو حالات اور واقعات کو وسیع تر تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ میں کچھ عرصے سے مسلسل یہ کہہ رہا ہوں کہ ایک بار پھر بڑی طاقتوں کے درمیان چپقلش یا آویزش کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ میں اسے سرد جنگ کا نام تو نہیں دیتا لیکن مفادات کا ٹکراؤ ناگزیر دکھائی دے رہا ہے۔

بلاشبہ امریکہ بالخصوص اور مغربی طاقتیں بالعموم خلیج پر اپنا غاصبانہ قبضہ مکمل کرنے کے لیے ایران کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانا یا کسی نہ کسی طرح سے اپنے حلقہ اثر میں لانا ضروری خیال کرتی ہیں۔ خلیج پر قبضہ مکمل ہونے کی صورت میں یہی ہے کہ ایران کنٹرول میں آجائے یا کم از کم وہ مغربی اثر و نفوذ کی کوششوں کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہے۔ اور کسی نوع کی مزاحمت سے کلیتاً دستبردار ہو جائے۔ ایران کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے مغرب کے مساعی مسلسل جاری ہیں۔ اور گزشتہ ایک سال سے اسلامی جمہوریہ ایران اہل مغرب کی نگاہ التفات کا خصوصی مرکز ہے۔ سب سے پہلے تو ایران کو ایک دہشت گرد ملک قرار دیا گیا۔ اور اسے تمام پابندیوں میں جکڑ دیا گیا جو'' دہشت گرد ملکوں'' کے لیے مخصوص تھیں اس کے ساتھ ہی اسرائیلی جرنیل کا بیان آیا کہ ''ایران ایٹمی پروگرام کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ضروری ہوا تو ہم حملہ کر کے ایران کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کر دیں گے۔'' افغانستان میں طالبان کے عنصر کو بھی اس حوالے سے دیکھا جانے لگا ہے۔ طالبان ابتدا میں امن کے علمبردار بن

کر اُٹھے ہیں اور باہمی جنگ وجدل میں مصروف قوتوں کی شدید مذمت کی لیکن عملاً وہ امن کے سفیر نہ بن سکے بلکہ افغانستان کی خانہ جنگی میں ایک اور کردار کا اضافہ ہوگیا۔ اسماعیل خان کے زیر اثر پانچ صوبوں، نمروز، فرح، ہرات، بدغیس اور غور پر طالبان کی لشکر کشی اس تاثر کی نفی کرتی ہے۔ ان صوبوں پر اسماعیل خان کے کنٹرول کو عملی طور پر تمام جماعتوں نے تسلیم کرلیا تھا اور اس بارے میں کوئی تنازعہ نہ تھا۔ ان صوبوں میں احکام شریعت کا نفاذ تھا۔ کسی طرح کوئی اندرونی جنگ یا بدامنی نہ تھی۔ تعلیمی ادارے کھلے ہوئے تھے۔ کاریزوں کی صفائی شجرکاری اور رفاہ عامہ کے دوسرے صوبوں پر کسی نہ کسی طریقے سے کام ہورہا تھا۔ تجارتی اور کاروباری سرگرمیوں میں بھی کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ اس لیے ان منصوبوں پر طالبان کی یلغار کا کوئی شرعی جواز بھی نہ تھا۔ ان کے استدلال امن کے حوالے سے بھی یہ قبضہ کسی قدر غیر ضروری نظر آتا ہے۔ تاہم ان پانچ صوبوں پر طالبان کے قبضے کا ایک اہم سٹریٹجک پہلو سے جسے پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اب افغانستان سے ملحقہ سرحدی پٹی پر ایسے عناصر کا غلبہ ہوگیا ہے جن سے ایران کے باہمی تعلقات اچھے نہیں۔ اس سے پہلے طالبان ہی ہاتھوں، ایران کی حمایت یافتہ تنظیم حزب وحدت کے سربراہ آیت اللہ عبدالعلی مزاری قتل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ حزب وحدت بامیان کے محاذ پر کابل کی حکومت کے ساتھ برسرپیکار ہے لیکن مغرب کے عزائم کو بھانپتے ہوئے ایران کچھ ایسے فیصلے کرنے پر مجبور ہوگیا جن کے سبب وہ الگ تھلگ یا تنہا ہونے سے بچ سکے اور کسی جال میں گرفتار نہ ہوجائے۔ ان فیصلوں یا اقدامات میں روس سے تعلقات، چین کے ساتھ گرمجوشی، بھارت سے معاملات سدھارنا افغانستان میں ربانی حکومت کے ساتھ ورکنگ ریلیشن شپ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ایران نے ربانی حکومت کے ساتھ راہ رسم اس لیے بڑھانے شروع کردیئے ہیں کہ ایران پر دباؤ پڑنے کی صورت میں اسے افغانستان کے اندر ریلیف زون میسر آسکے لیکن مغربی افغانستان میں طالبان کی حالیہ کامیابیوں نے اس ریلیف زون سے کٹ جانے کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح شمال میں آذربائیجان کے ساتھ ایران کے تعلقات میں بھی کچھ رخنے پڑ گئے ہیں اور آذربائیجان کے نام پر دونوں ملکوں کے درمیان ایک تلخ سفارتی بحث چھڑ گئی ہے شمال ہی میں ترکمانستان کے ساتھ مواصلاتی رابطہ قائم کرنے کے لیے ایران نے 276 ملین ڈالر کی لاگت سے مشہد اشک آباد ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ شروع کیا ہے۔ جو تکمیل کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے لیکن کام کی رفتار میں بڑی حد تک کمی آئی ہے۔ ترکی کے ساتھ بھی ایران کے تعلقات میں زیادہ گرمجوشی نہیں رہی۔ عراق کا معاملہ تو کھلی مخاصمت اور عداوت کا ہے۔ لے دے کہ واحد ملک پاکستان رہ جاتا ہے۔ جو کسی افتاد کے وقت ایران کے لیے ریلیف زون بن سکے۔ یا اس کی اسودگی کا سامان فراہم کرسکے۔ فی الحال ایران بعض یورپی ممالک کو سستا تیل بیچ کر اور وسط ایشیاء میں روسی مفادات کا احترام کرکے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اسی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ ایران نے شروع میں چیچنیا کے مسئلے پر اصولی موقف اختیار کیا، بعد میں اس نے پسپائی اختیار کرلی۔

رابن رافیل نے پاکستان کی سرزمین پر بیٹھ کر جو کچھ کہا اس کے پس منظر اور پیش نظر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی طاقتیں خلیج کے بائیں فلینک پر جنوب سے شمال تک اپنا قبضہ خاصا مستحکم کر چکی ہیں۔ عمان سے مصر تک اس کی راہ میں سوڈان کی معمولی سی مزاحمت کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں۔ درمیان میں

اسرائیل کے مسئلے کو بھی وقتی طور پر حل کر دیا گیا۔ البتہ خلیج کا دایاں فلینک اس وقت تک مغرب تسلط میں نہیں آ سکتا جب تک ایران کا دم خم نکال نہ دیا جائے۔ ایران کی روس کے ساتھ ایٹمی ری ایکٹر کی ڈیل اور چین کے ساتھ بڑھتے ہوئے مراسم مغرب کی آنکھ میں کھٹکتے ہیں۔ خطے میں اور بھی ایسی تبدیلیاں آ رہی ہیں جس کے باعث امریکہ اور اس کے حواری ایران کا کانٹا نکال پھینکنے کے لیے بے تاب ہیں۔ بورس یلسن ابھی تک برضا و رغبت مغربی ایجنڈے پر چلنے کے لیے تیار تھا لیکن اب اسے آثار دکھائی دینے لگے ہیں کہ یلسن روس کے سیاسی منظر سے ہٹ جائے گا۔ دسمبر میں انتخابات کا اعلان ہو چکا ہے۔ یلسن کی پوزیشن کافی کمزور ہے اور یوں بھی پچھلے کچھ ماہ سے ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ نئی سیاسی قوتیں مغربی ایجنڈے سے لاتعلقی کا انتخابی منشور لیکر میدان میں آ رہی ہیں اور ان کی کامیابی کے روشن امکانات موجود ہیں۔ نیا ابھرتا ہوا روس اپنا پروگرام اور اپنے اہداف خود متعین کرے گا۔ اس کے پاس آج بھی ستائیس ہزار سے زائد ایٹمی ہتھیار موجود ہیں اور وہ آج بھی دفاعی اور اقتصادی مقاصد کے لیے وسط ایشیاء کے ذرائع پر کنٹرول کا دعویدار ہے۔ وہ صدمے کی کیفیت سے نکل رہا ہے۔ اپنی حکمت عملی کے اعتبار سے روس، ایران کو خصوصی اہمیت دے رہا ہے روس پاکستان کو بھی خصوصی اہمیت دے رہا ہے لیکن ہمارے پالیسی ساز معاملے کو سنبھالنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دو سال قبل روس نے پاکستان کو دفاعی ٹیکنالوجی فراہم کرنے کی فراخدلانہ پیش کش کی ہمیں سستے داموں اپنی عسکری ضروریات مل رہی تھیں۔ لیکن ہم نے بات چیت کو آگے بڑھانے کے بجائے سیاسی چال کے طور پر آگے بڑھایا تا کہ امریکہ کے کان کھڑے ہو جائیں اور وہ ہمیں ایف 16 طیارے مل جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج روس کو بھی فوجی ساز و سامان دینے میں ہچکچاہٹ ہے کیونکہ بھارت کی لابی نے اس دوران اپنا کام کر دکھایا ہے۔ ادھر ایف 16 طیارے بھی ہماری دسترس سے باہر ہو چکے ہیں۔ اب مجبوراً ہم میراج 2000 خریدنے جا رہے ہیں۔ جو مہنگا ترین طیارہ ہے۔ ایک جہاز کی قیمت 85 ملین ڈالر ہے ہماری کھوکھلی معیشت یہ بوجھ کس طرح سہارے گی۔ کیا یہ پالیسی سازوں کی صریحاً ناکامی نہیں کچھ عرصہ قبل روسی وفد ہمارے ہاں آیا اور ہمیں بعض شعبوں میں تعاون کی پیش کش کی۔ آج تک ہماری طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں دیا جا سکا۔ روس میں مغربی ایجنڈے سے انحراف کے کئی شواہد واضح طور پر نظر آنے لگیں ہیں۔ روس کی سٹیٹ ڈیوما (پارلیمنٹ) نے نیٹو کی طرف سے سرب پوزیشنوں پر حملوں پر تلخی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ روس نے ایران کو ایٹمی ری ایکٹر سپلائی کرنے کے خلاف مغربی دباؤ ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ امریکہ کے ساتھ مشترکہ فوجی مشقیں یکطرفہ طور پر منسوخ کر دی ہیں۔ انہیں اپنی ایٹمی تنصیبات سے سویلین انسپکٹر ہٹا کر انہیں دوبارہ وزارت دفاع کے کنٹرول میں دے دیا ہے۔ روس نے کھلے لفظوں میں وارننگ دی ہے۔ اگر نیٹو کو مشرق کی طرف پھیلانے کی کوشش کی گئی تو مشرق اور مغرب ایک بار پھر سرد جنگ کے زمانے کی طرف لوٹ جائیں گے۔ ادھر روس نے ایک بار پھر افغانستان میں اپنی دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ وہ پروفیسر ربانی کی حکومت کی ہمنوائی کر رہا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اسے اچانک ربانی سے ہمدردی ہو گئی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ روس اور ایران کے مشترکہ مفاد میں ہے۔ یہ محض روس اور امریکہ کی روایتی مخاصمت نہیں بلکہ صدیوں سے شاہی روس اور پھر کیمونسٹ روس کی اس خواہش کا زاویہ ہے جو گرم پانیوں تک رسائی کے بارے میں رکھتا ہے

جس خواب کی تکمیل عسکری ذرائع سے نہ ہو سکی۔ آج روس اس خواب کو دوستانہ انداز سے اور تجارتی تعلقات کی بنیاد پر پورا کرنا چاہتا ہے مغرب اور روس کے درمیان اقتصادی اور تجارتی معرکہ آرائی میں لامحالہ روس ایران کو اہمیت دینے پر مجبور ہے۔ مشہد اشک آباد ریلوے لائن بچھ جانے کے بعد اور روس کے پرانے سسٹم کی رسائی بندر عباس تک ہو جائے گی لینن گراڑ اور بندر عباس مربوط ہو جائیں گے۔ یہ یورپین سائبرین ریلوے نظام، وسط ایشیاء کے وسیع خام مال کی بنیاد پر روسی معیشت کے لیے بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ روس آج بھی جغرافیائی اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اس کی آبادی 200 ملین سے زیادہ ہے۔ اس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی فوج ہے۔ اس کے پاس سائنسدانوں کا بڑا اپول ہے۔ خلائی ٹیکنالوجی میں وہ بہترین صلاحیتوں کی حامل افرادی قوت رکھتا ہے۔ جب روس کی معیشت کو بھی توانائی مل جائے گی تو وہ یقیناً ایک نئی قوت کے ساتھ ابھرے گا اور مغرب و مشرق کی چپقلش نئے باب میں داخل ہو جائے گی۔

امریکہ کے پیش نظر ایران پر دباؤ ڈالنے کا ایک اور بھی محرک ہے دنیا جان چکی ہے کہ اسرائیل اور پی ایل او کے درمیان کرایا جانے والا معاہدہ مصنوعی اور کمزور ہے۔ شام کے ساتھ گولان کی پہاڑیوں کے سلسلے میں ابھی تک مفاہمت نہیں ہو سکی۔ حماس اور دیگر جہادی تنظیمیں اس معاہدے کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ مصر میں حسنی مبارک کی ساکھ بری طرح گر رہی ہے۔ عرب غم غصہ کسی وقت بھی سامنے آ سکتا ہے اور صبر و ضبط کے بند ٹوٹ سکتے ہیں۔ اسرائیل وزیراعظم کے قتل کے بعد پورا تانہ بانہ بکھرانے کا خدشہ ہے۔ امریکہ یہ چاہتا ہے کہ عرب دنیا کے غم و غصہ کو اسرائیل کو رخ نہ کرنے دیا جائے اور اسے ایران کی طرف موڑ دیا جائے۔ عراق تو پہلے ہی استعمال ہو چکا ہے۔ اس لیے اس بار کوئی نیا ہدف سامنے رکھا جائے۔

ایران کی قیادت پاکستان کے بارے میں بعض تحفظات رکھتی ہے۔ ایران کو شکوک و شبہات ہیں کہ ہم امریکن مرعوبیت میں حد سے گزرے جا رہے ہیں ہم نہ صرف اپنی سوچ بلکہ اپنی زمین بھی امریکی استعمال کے لیے وقف کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہیں۔ ایران پر آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو یہ کسی بھی پاکستانی قیادت کے لیے بھی امتحان کا مرحلہ ہوگا۔ بارے اندرونی عوامل اور پاکستانی عوام کی ذہنی ساخت ایسی ہے کہ ہم ایران کے خلاف کسی بھی طاقت کا دم چھلہ بننے کی جسارت نہیں کر سکتے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس سلسلے میں شیعہ سنی تلخیاں بھی حائل نہیں ہوں گی۔ ہمارے ایران کے ساتھ مذہبی، تہذیبی، ثقافتی، جغرافیائی اور دفاعی رشتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں نے اپنے مفاد کے لیے کسی مہم جوئی کا راستہ اختیار کیا تو یہ بڑی بدقسمتی ہوگی۔ اس سے خود پاکستان کے اندر وسیع تصادم کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر امریکہ واقعی پاکستان سے ہمدرد ہے تو اسے ہماری قیادت کو ایسا راستہ نہیں سمجھانا چاہیے۔ ایران کے خلاف فرنٹ لائن اسٹیٹ کے کا کردار ادا کرنا بہت دور کی بات ہے ہم تو غیر جانبدار بھی نہیں رہ سکتے۔ ایران کی مشکل سے دوچار ہوتا ہے تو ہمارے کرداروں کا تعین ہمارے عوام کریں گے اور اگر ہماری سیاسی قیادت اپنے عوام کی نبض پہچانتی ہے تو اس اپنے کردار کو تعین کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیے ایران پر آزمائش آتی ہے۔ تو پاکستان ہر حال میں اسے ریلیف فراہم کرتا ہے۔ چاہے یہ ریلیف فوجی نوعیت کا ہو یا اسلامی بنیاد پر انسانی بنیاد پر یہ مت بھولیں کہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں

ایران نے کس طرح کھل کر ہماری مدد کی تھی اور اپنے ہوائی اڈوں سمیت تمام وسائل ہمارے حوالے کردیے تھے۔ ہم ایرانی قوم کا یہ احسان کیسے بھول سکتے ہیں۔

میں گزشتہ چار سالوں سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ امریکہ، افغانستان کے موضوع پر پاکستان اور ایران کے درمیان کش مکش اور محاذ آرائی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ طالبان کے عنصر نے مغربی عزائم کو پورا کرنے میں مدد دی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے وہ اس کا آلہ کار نہ بنیں گے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں افغانوں کے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ پاکستان اور ایران کا دفاع باہم مربوط ہے اور اگر خدانخواستہ کسی ایک ملک پر افتاد پڑتی ہے تو دوسرا اس کے منفی اثرات سے بچ نہیں سکے گا۔ اسی نکتے کی بنیاد پر ہم نے افغانستان میں روسی مداخلت کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ رابن رافیل نے ایران کو تنہا کرنے کے جس عزم کا اظہار کیا ہے وہ ہماری قیادت کے لیے لمحہ فکریہ ہونا چاہیے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ ہماری ترجیحات ہی کچھ اور ہیں قوم اور ملک کا مفاد ان ترجیحات میں بہت نیچے آتا ہے۔ حکمرانوں اور اپوزیشن کی باہمی محاذ آرائی نے قومی افق کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حکمران شاید اس پیش آمدہ چیلنج کا شعور نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو قومی موقف کا بھرپور اظہار کرنے کی جرأت سے محروم ہیں۔ اگر ہماری سیاسی قیادت کا یہی رنگ ڈھنگ رہتا ہے تو قوم کو یکسو ہو کر اپنی امنگوں کا دوٹوک اظہار کرنا ہوگا۔ ایران پر امریکہ یا اسرائیل کے حملے کی صورت میں ہم امریکہ کو کسی طرح کی مادی، سیاسی یا سفارتی امداد نہیں دیں گے۔ بلکہ ہم ایران کو ہر قسم کا ریلیف دیں گے۔ اگر عسکری امداد نہیں کر سکتے تو باقی ہر قسم کا تعاون و امداد فراہم کریں گے۔ اس قومی عزم کا اظہار بہت ضروری ہے۔ تاکہ امریکہ اپنی حدود کو اچھی طرح جان لے۔ ہمیں ماسکو کے ساتھ بھی اپنے تعلقات سدھارنے پر توجہ دینی چاہیے۔ چین کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ ایرانی قیادت کے ساتھ بہتر مفاہمت پیدا کرنا چاہیے۔ اور افغانستان میں بھی ایسا کردار ادا کرنا چاہے۔ جو فتنہ فساد کو بڑھانے کے بجائے امن وسکون کی ضمانت فراہم کر سکے۔ محمود مسطری اور اقوام متحدہ کا فارمولا ناکام ہو چکا ہے۔ پاکستان اس کی پشت پناہی چھوڑ دے۔ اس لکیر کو پیٹنے سے اب کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہمیں ایک بار پھر اسلامی کانفرنس کو متحرک کرنا ہوگا۔ جس طرح افغانستان پر روسی حملے کے وقت کیا تھا اور مئی 1980ء میں اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کا اجلاس بلاکر متفقہ لائحہ عمل اختیار کیا گیا تھا آج ایک بار پھر پاکستان پر لازم آتا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کا طواف چھوڑ کر اسلامی کانفرنس سے رجوع کرئے اور افغانستان میں کسی ایک دھڑے کا پشتیبان بننے کے بجائے اسلامی ممالک کے ساتھ مل کر متفقہ پالیسی پر گامزن ہو۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے۔ پاکستان اور بعض دوسرے اسلامی ممالک کے سلسلے میں ایرانی حکومت کے بعض رویوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ہماری امت مسلمہ کے اندرونی معاملات ہیں۔ جو مکالمے کے ذریعے سلجھائے جاسکتے ہیں ہم اس میں استعمار کو دخل اندازی کی اجازت کیوں دیں۔ اصل مسئلہ تو استعمار ہے۔ جس کا اثر ورسوخ اور غلبہ بڑھتا جارہا ہے۔ ہمیں اس کی یلغار سے بچنا ہے۔ اور جب ہم خدا کا نام لیکر اُٹھ کھڑے ہوں گے تو انشاء اللہ اس کی رحمت و برکت ہم پر اپنے دروازے کھول دے گی۔

❁

# آئی۔ایم۔ایف ہماری زراعت کیوں تباہ کرنا چاہتا ہے؟

ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نے اپنے دباؤ کے تحت ہماری صنعتی صلاحیت کو پہلے ہی تباہ کر دیا ہے اور ہمارے بیشتر قومی وسائل قرضوں کے عوض گروی رکھ لیے ہیں۔ ہماری قومی پالیسیوں خصوصاً خارجہ پالیسی پر ان اداروں کا گہرا عمل دخل ہے۔ اب ان کا نیا ہتھیار ''کارپوریٹ فارمنگ'' کی شکل میں سامنے آیا جو پہلے سے کہیں بڑھ کر مہلک ہے خدانخواستہ اس منصوبے پر عمل درآمد ہو گیا تو یہ ہماری قومی سلامتی اور بقاء دونوں کے لیے دورس خطرات کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ تاریخ عالم کا یہ عبرت آموز سبق ہے کہ جو قومیں خوراک میں خود کفیل نہیں ہوتیں بالآخر اپنی سلامتی اور آزادی سے محروم ہو جاتی ہیں خدانخواستہ کیا ہمارے ساتھ یہی واردات ہونے والی ہے۔

گزشتہ برس گندم کی پیداوار غیر معمولی طور پر اچھی رہی لیکن اضافی پیداوار کو بوجوہ برآمد نہ کیا جا سکا۔ یہی معاملہ چاول کی برآمد کے سلسلہ میں پیش آیا۔ ایسا لگتا ہے اس فاضل پیداوار سے آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ان اداروں کے آقا اداروں کو خاصی تکلیف پہنچی ہے۔ وہ پاکستان کو جس شکنجے میں جکڑنا چاہتے تھے۔ خوراک میں خود کفیل ہونے سے یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ پاکستان اس شکنجے سے نکل نہ جائے۔ چنانچہ فوری اقدام یہ کیا گیا کہ مارکیٹنگ کو پرائیوٹائز کر دیا گیا۔ اس سے زرعی شعبے کو سخت چوٹ لگی۔ گندم کی سرکاری قیمت خرید تین سو روپے تھی اچانک سرکاری چھتری ہٹ جانے سے چھوٹے زمیندار بے سہارا ہو گئے نئی فصل آنے پر گندم 250 اور 270 روپے کے درمیان بک رہی ہے۔ ظاہر ہے اس کا تمام تر خسارہ گندم اگانے والوں کو ہو گا جو پہلے ہی شدید مہنگائی کے دسے ہوئے ہیں۔ گزشتہ برس گندم کی قیمت میں اضافے کے ساتھ ہی انہیں ٹریکٹر ڈیزل اور کھاد اور زرعی ادویات کی مہنگائی کے بحران سے دو چار کر دیا گیا۔ اب اگر نئی فصل مل مالکان اونے پونے اٹھالیں گے تو چھوٹے کسان تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ انہیں اس سال قدرتی آفات کا بھی سامنا رہا۔ بارشیں نہ ہونے اور دریاؤں میں پانی خشک ہونے کے باعث غلے کی فصلوں میں خاصی کی متوقع تھی کہ اوپر سے ''کارپوریٹ فارمنگ'' کے نام پر غریب کسان کے منہ کا نوالہ چھین لینے کا اعلان سامنے آ گیا۔

پانی کے بحران کی وجہ سے زرعی اجناس کی پیداوار میں کمی کا ازلہ کرنے کی ضرورت تھی لیکن اس کے بجائے عالمی مالیاتی اداروں کی طرف سے امداد قیمت سے محروم کر دینے کا ظالمانہ حکم تسلیم کر لیا گیا۔ حالانکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی خوراک پر سبسڈی کا نظام موجودہ ہے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسان غلہ اگانا بند کر دیں گے۔ اسی طرح اس سے پہلے چینی کی فصل کا بیڑہ غرق کیا جا چکا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے ادارے ہماری زراعت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

شوکت عزیز جن دنوں نئے نئے وزیر بنے تھے میں نے ایک ملاقات میں ان سے کہا تھا کہ حکومت کسی قیمت پر آنے کی قیمت میں اضافہ ہونے دے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم سبسڈی جاری رکھیں گے اور ایسا نہیں ہونے دیں گے لیکن وہ عالمی مالیاتی اداروں کا شدید دباؤ برداشت نہ کرپائے اور سبسڈی ختم کرنے اور خود کفالت کے خلاف پالیسیاں بنانے کے حکم کو نہ رد کر سکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حکومت ساڑھے تین کروڑ ایکڑ زمین ''کارپوریٹ فارمنگ'' کے لیے مخصوص کر رہی ہے۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اس سے پہلے ہماری صنعت کو اپنے کنٹرول میں لے چکی ہیں۔ اب اگر خوراک کی پیداوار بھی ان کے کنٹرول میں چلی جائیگی تو پاکستان کے عوام کا جینا مرنا ان کے رحم وکرم پر ہوگا۔ وہ ہمارے دماغوں پر تو پہلے ہی تسلط رکھتے ہیں۔ اب منہ کے نوالے پر دسترس حاصل کر کے شکم کے راستے روح پر بھی قابض ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد پوری قوم بندر کی مانند مداری کے اشارے پر ناچنے پر مجبور ہوگی۔

تین برس پہلے معروف ادارے نیشنل جیوگرافک نے ایک تفصیلی رپورٹ میں یہ ثابت کیا تھا کہ رومن ایمپائر کے زوال کا سب سے بڑا سبب خوراک میں دوسروں پر انحصار تھا۔ دور کیوں جائیں ابھی دس برس پہلے سویت یونین کے زوال کا مشاہدہ ہم نے اپنی آنکھوں سے کیا ہے۔ روس میں خوراک کی پیداوار میں کمی نہیں ہوئی تھی لیکن تقسیم کا نظام بگڑ گیا تھا۔ جانوروں کی خوراک تک امریکہ سے لائی جانے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ غیروں پر انحصار بڑھتا چلا گیا اور سوویت یونین ٹوٹ گیا۔ چھوٹے ممالک کو زیر تسلط رکھنے کے لیے خوراک کا ہتھیار مدتوں سے استعمال ہوتا چلا آرہا ہے۔ آج اگر کوئی چھوٹا ملک خوراک میں خود کفالت حاصل کر لے تو مغرب خصوصاً امریکہ کو اس سے سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ انقلاب کے بعد سوڈان نے گندم میں خود کفالت حاصل کر لی تو امریکہ اس سے ناراض ہوگیا۔ پہلی بار سوڈانیوں نے ڈیڑھ لاکھ ٹن گندم درآمد کی تو امریکہ نے اس پر باقاعدہ احتجاج کیا۔

شمالی کوریا میں دو برس پہلے شدید قحط پڑا تو ان پر مغربی دباؤ بڑھ گیا کہ خوراک کے بدلے انہیں نیوکلیئر صلاحیت سے دستبردار ہونے کا اقرار کرنا پڑا۔ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے سے ہمارا انکار اقرار میں بدلنے کے لیے خوراک کا ہتھیار استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ پاکستان بلاشبہ بیرونی قرضوں کے بے پناہ دباؤ کا سامنا کر رہا ہے۔ ہمارے حکمرانوں میں اتنی ہمت نہیں کہ یہ غیر منصفانہ قرضے ادا کرنے سے انکار کرسکیں یا چند برسوں کے لیے مہلت ہی مانگ سکیں۔ لیکن ہمیں ایسی بزدلی تو نہیں دکھانی چاہیے کہ قرضوں کی وجہ سے ظالمانہ شرائط قبول کر لیں۔ چونکہ ہم عالمی ساہوکاروں کے ظالمانہ قرضے ادا نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنے وہ شعبے عالمی مالیاتی اداروں کے حوالے کر دیں جن سے ہماری موت اور زندگی وابستہ ہے۔ ہمارے چند لاکھ امراء تو ہر حال میں گزارہ کر لیں گے۔ لیکن پندرہ کروڑ غریب بری طرح مارے جائیں گے۔ اس پالیسی سے قوم کا اعتماد بری طرح مجروح ہوگا۔ تصور کریں اس دن کا کہ جب ہمارے اپنے کھیتوں میں پیدا ہونے والی پیداوار غیر ملکی ساہوکار منہ مانگے داموں ہم ہی فروخت کریں گے۔ اور اپنی مرضی سے غلے میں کمی اور اضافہ کریں گے۔ تو کیا شاید نفسیاتی دباؤ کا شکار قوم اغیار کی غلامی سے دوچار نہیں ہو جائے گی؟

بڑے فیصلے کرنے کے لیے قومی سطح کی مشاورت کی ضرورت ہے۔ موجودہ حکمرانوں کے پاس سپریم

کورٹ کی جانب سے مہلت میں صرف سولہ ماہ باقی رہ گئے ہیں۔لہٰذا وہ کوئی ایسے طویل الاثر فیصلے نہ کریں جن کے منفی نتائج برسوں تک ملک و قوم کو بھگتنے پڑیں۔ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ایسے اقدامات کریں جن سے ہماری زراعت ترقی اور عروج کی طرف گامزن ہو۔ ''کارپوریٹ فارمنگ'' جو جاگیرداری کی بدترین شکل ہے اس کے بجائے ''کوآپریٹو فارمنگ'' کریں جو کہ ایک متعارف طریقہ ہے۔ ماضی سے رائج رہ چکا ہے۔ کروڑوں غریب کسانوں کو بے روزگار کرنے کے بجائے ان کے کھیت کھلیان کو زیادہ سے زیادہ منافع بخش بنایا جائے۔ زراعت کا شعبہ کسی قیمت پر غیر ملکی سرمایہ کار اداروں کو فروخت نہ کریں۔ یہ بات تو کسی شک و شبے سے بالاتر ہے کہ ''کارپوریٹ فارمنگ'' سے عالمی سرمایہ دار کا ہاتھ ہماری اقتصادی شہ رگ پر مضبوطی سے جم جائیگا۔ زرعی کارکن جن کی اکثریت پہلے ہی غریب ہے بے سہارا ہو کر رہ جائے گی کروڑوں لوگ محتاجی اور غربت سے دوچار ہو جائیں گے۔

غیور قومیں عزت اور غیرت سے مر تو سکتی ہیں لیکن بڑی سے بڑی قیمت کے بدلے اپنی آزادی سے محرومی گوارہ نہیں کر سکتیں۔ آج چین ترقی کے جس مقام پر ہے۔ جو صنعتی اور ٹیکنالوجی میں اس نے کامیابی حاصل کی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ خوراک میں خود کفالت ہے۔ تیس برس تک چینی خوراک میں خود کفالت کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ صنعتی ترقی کی طرف تو وہ 1982ء میں آئے آج وہ بڑے فخر سے یہ کہہ رہے ہیں وہ دنیا کی آبادی کے پانچویں حصے کو لباس چھت اور وافر کر رہے ہیں۔ اگر چین نے بھی آئی ایم ایف جیسے عالمی اداروں کی نصیحت اور ڈکٹیشن پر عمل کیا ہوتا تو کبھی اس مقام پر نہ پہنچتے، موجودہ حکومت اگر جرأت مندانہ فیصلوں کا شوق رکھتی ہے اور اسے اپنے مختصر عرصے میں یاد رکھا جانے والا کریڈٹ مطلوب ہے تو پھر آئی ایم ایف کے سامنے بھی جرأت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یوں آنکھیں بند کر کے ہر کام میں سر تسلیم خم کرنے سے تو اسے غیروں کی غلامی قبول کرنے اور غربت کا تحفہ دینے والی حکومت کے طور پر ہی یاد رکھا جا سکے گا۔

# کیمپ ڈیوڈ کے سائے

ملت اسلامیہ کو ایک اور کیمپ ڈیوڈ کا سامنا ہے اور اس سامنا کا ملک کے سب سے طاقتور ملک کو ہے۔ لیکن اس حالت میں کہ قیادت امریکن ناراضگی کے امکان سے خوفزدہ ہے۔ تمام اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں ہیں۔ ملکی کی اجتماعی دانش کے سامنے نشان منزل مفقود اور سیاسی وحدت پارا پارا ہے۔ اس حالت میں قوم کا ہر ذی شعور فرد اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں لیکن قائد مصر ہے کہ وہ کیمپ کے طوفان بلا خیز سے تن تنہا نمٹ سکتا ہے۔ قوم سے کٹ کر اس کی شب بیداری کی دعاؤں سے کٹ کر سنجیدہ ٹھوس اور بے باک مشاورت کے بغیر۔ یادر ہے تنخواہ دار مشاورت ایسے اوصاف کی حامل نہیں ہوا کرتی ہر چند کہ اداروں کے درمیان کسی نہ کسی طور پر مشاورت کا انتظام موجود رہتا ہے۔

بلاشبہ اس فرد واحد نے آگرہ میں کمال استقامت کا مظاہرہ کیا تھا اور اس کے لیے قوم سے داد بھی پائی تھی لیکن وہ گیارہ ستمبر سے پہلے کی بات تھی۔ اور کیمپ ڈیوڈ بھارت میں نہیں امریکہ میں واقع ہے۔ یہاں تو "معاملہ سخت و جان عزیز" کا مرحلہ درپیش ہے کیمپ ڈیوڈ کی داستان بھی تو بڑی دلخراش ہے۔ انوار السادات جان اور ایمان دونوں سے گئے لیکن جمال عبد الناصر کا عظیم مصر ابھی تک سنبھل نہیں سکا یا سر عرفات بھی ابھی تک حالت نزاع میں ہیں اور ٹونی بلیئر برطانوی قوم کے لیے شرمندگی کا اتنا سامان اکٹھا کر چکے ہیں کہ دھونے میں صدیاں لگ جائیں گی۔

یہ زمانہ تو امریکن روڈ میپ کا ہے، جس کا دیا ہوا ہر روڈ میپ تباہی (Disaster) کی طرف لے جاتا ہے۔ پاکستان کے لیے روڈ میپ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا لیکن اس کی موجودگی کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے خفیہ سفارتکاری کافی عرصے سے جاری ہے۔ جس کے پردے میں کمزوری قوموں کے خلاف جرائم ہی پروان چڑھائے جاتے ہیں۔ ہم کمزور قوم ہرگز نہیں لیکن ضروری نہیں کہ کمزور اسباب میں ہو۔ اصلاً کمزور اعصاب میں ہوا کرتی ہے۔ بالخصوص لیڈروں کے اعصاب میں نہ جانے ہمارا روڈ میپ کن راہوں سے گزار کر ہمیں کہاں لے جائے گا۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ یہ تخلیق پاکستان کے خوابوں آرزوؤں اور قوم کے خواہشات کا عکاس نہیں ہوگا۔ کچھ رنگ تو اس روڈ میپ میں پہلے ہی بھرے جا چکے ہیں۔

افغانستان میں بھارت اور اسرائیلی انٹیلی جنس کے ڈیرے پڑ چکے ہیں۔ کوئٹہ کی واردات کو اس پس منظر میں دیکھنے کی کافی گنجائش موجود ہے۔

کشمیر میں ہمارے دیرینہ موقف میں قابل ذکر تبدیلی آچکی ہے اور ابھی بات چیت شروع بھی نہیں ہوئی۔

1- جہاد اور دہشت گردی کے جس فرق پر شدت سے اصرار کیا کرتے تھے اس سے تائب ہو چکے ہیں۔

2- لائن آف کنٹرول کے تقدس (امریکن اصطلاح) کو ہم نے دل و جان سے تسلیم کر لیا ہے۔

3- اسلام کی روشن خیال مغربی تشریح پر بھی ہماری آمادگی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیمپ ڈیوڈ میں ہم سے اور کیا تقاضے ہوں گے؟ کیونکہ ہر بار ان کا ایک ہی جملہ سامنے آتا ہے "You have to Do more" آپ کو مزید کچھ کرنا ہے۔ اس More سے کیا مراد ہے۔؟ کیا عراق میں امن قائم کرنے کے لیے فوجی دستوں کی فراہمی؟ ایران کے خلاف امریکی پلان میں افغانستان کے طرز پر معاونت؟ نفاذ شریعت کو روکنے کا عہد آیا اور کچھ بھی۔ اور یہی تو اصل تقاضا ہے۔ سب تقاضوں کی ماں یعنی جوہری پروگرام کی نگرانی؟ کونڈا لیزا رائس نے حال ہی میں کہا تھا ہم ہر اس طاقت کو کچل دیں گے جو اسرائیل کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

کیا ہم کیمپ ڈیوڈ سے کچھ وصول بھی کر سکتے ہیں؟ بظاہر اس کا امکان کم ہے۔ ہماری گراں قدر خدمات اپنی جگہ لیکن وہ تو قصہ پارینہ ہو چکیں۔ یاد کریں گیارہ ستمبر کے فوراً بعد جنرل محمود کو رچرڈ آرمٹیج نے کہا تھا ''ماضی کو بھلا دو تاریخ آج سے شروع ہوتی ہے۔'' 1.8 ارب کے قرضوں کی معافی ہو جائے گی لیکن پاکستان کے دس ارب ڈالر کا اقتصادی نقصان جو سنٹرل کمانڈ نے خود تسلیم کیا ہے اس کا مطالبہ بھی نہیں کیا جائے گا۔ پاکستان کا تو اور بھی بہت نقصان ہوا ہے مگر اس کا معاوضہ بھلا کون دے گا۔ کچھ فاضل پرزے اور کچھ روائتی ہتھیار البتہ ضرور مل جائیں گے لیکن اس قدر نہیں کہ امریکہ کے اسٹریٹجک پارٹنر بھارت سے کسی طرح کی مسابقت ہو سکے۔

اصل میں Do More کی گردان پر اگر مزاحمت دکھائی گئی......تو ایسا بالکل ممکن ہے......تو معاملات کو کیسے سنبھالا جائے گا۔؟ اس کا ایک حل ہے جائز اور جمہوری حل جسے امریکن بخوبی سمجھتے ہیں، اور تسلیم بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ منتخب پارلیمنٹ موجود ہے جو 11 ستمبر کو نہیں تھی، جس کے سامنے تمام معاملات رکھے جا سکتے ہیں۔ عراق کے خلاف جنگ میں ترکی نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا، اور وہ نقصان کے بغیر سرخ رو ہو گیا لیکن کیمپ ڈیوڈ میں سوال اٹھایا جائے گا کہ آپ کی پارلیمنٹ کی حیثیت آپ سے بالاتر تو نہیں، لہٰذا یہ جواز نہ قابل قبول ہے۔ ایسی صورت میں ایک متبادل غور طلب ہے۔

اول تو جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کیا جائے اگر دباؤ برداشت نہیں کر سکتے تو معاہدہ کی توثیق کا طریقہ کار بدل دیا جائے یعنی معاہدوں کی توثیق کے لیے پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت کو ضروری قرار دیا جائے اور اس کے لیے کم از کم تین سال میعاد مقرر کی جائے۔ فی الحال ہمارا معاہدوں کی توثیق کا طریقہ (Instrument of Ratification) بہت ناقص ہے۔ حکومت وقت معاہدے کرتی ہے۔ اور وہی توثیق بھی جیسا کہ کیمیائی ہتھیاروں کے کنٹرول (CWC) اور تجارتی معاہدوں WTO کے ضمن میں ہوا۔ نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں سرکاری افسروں نے چپکے سے سی ڈبلیو سی پر دستخط کیے اور دوسرے دور میں جاوید ہاشمی نے توثیق کے کاغذات پر مہر ثبت کر دی۔ دونوں وقت پارلیمنٹ موجود تھی لیکن معاہدوں پر بحث تو درکنار کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ رہا قومی مفادات کا معاملہ تو سب کو یاد ہوگا کہ موجودہ اور نواز شریف حکومت کس شدومد کے ساتھ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کو قومی مفاد میں قرار دیتی تھی لیکن امریکہ کا دباؤ ہٹا تو قومی مفاد بھی بدل گیا۔

میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ کیمپ ڈیوڈ کی ملاقات کے پہلے جہاں پیش بندی کے دوسرے اقدامات ضروری ہیں وہاں توثیق Ratification کے طریقہ کار کو بدلنا بھی اہم ہے۔ چاہے اس کے لیے ایک آرڈیننس ہی جاری کیوں نہ کرنا پڑے۔

......❁......

# بی جے پی، بھارتی مسلمان اور پاکستان

ہندوستان میں لوک سبھا کے انتخابات کے نتائج سامنے آچکے ہیں، بھارتی عوام نے ایک بار پھر کسی بھی جماعت کو واضح مینڈیٹ نہیں دیا، تاہم بھارتی جنتا پارٹی سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھر ہے۔ تادم تحریر بی جے پی سمیت مختلف جماعتیں حکومت بنانے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت مسئلہ یہ نہیں کہ بی جے پی یا کوئی دوسری جماعت کس طرح حکومت بنا سکے گی، حکومت کتنی دیر پا ہوگی اور حکومت بنانے کے بعد اس کا رویہ کیا ہوگا؟ اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستان نے سیکولر سیاست ترک کر کے بنیاد پرست اور عسکریت پسند ہندو سیاست اپنالی ہے۔ لوک سبھا میں بی جے پی کی ۶۸ نشستیں تھیں تو انہوں نے بابری مسجد شہید کرادی، اس کے عوض انہیں ۱۱۹ نشستیں ملیں۔ ان کی مذہبی انتہا پسندی میں شدت آئی تو لوک سبھا میں ان کی نشستیں بڑھ کر ۱۹۵ ہوگئیں۔ حالیہ انتخابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو ووٹر کا رجحان بنیاد پرستی کی طرف مزید بڑھا ہے، جس سے بی جے پی کو ۲۵۰ کے قریب نشستیں ملیں ہیں۔ اس مرتبہ وہ حکومت بنانے کی بہتر پوزیشن میں ہے پچھلی مرتبہ کسی سیاسی جماعت نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا لہٰذا اس کا اقتدار صرف تیرہ ایام پر محیط رہا تھا۔

بھاریہ جنتا پارٹی کے اتحادیوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ، مہا سبھا، وشوا ہندو پریشد، جن سنگھ اور بعض صوبوں میں علاقائی جماعتیں بھی شامل ہیں۔ تاہم جے پی کی اصل اتحادی عسکری ہندو تنظیمیں ہیں اور بی جے پی ان کا سیاسی ونگ ہے۔ حالیہ انتخابات کے نتائج سے ہندوستان کا سیکولرازم کا لبادہ بالکل ہی اتر گیا ہے۔ نام نہاد سیکولرسٹوں کے بجائے بنیاد پرستوں کو زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ بی جے پی ہندو انتہا پسندی کی نمائندہ سوچ ہے۔ اس سوچ سے ہر ذی شعور شخص واقف ہے۔ اس کا مطلب ہے ہندوستان کو ہندو بنانا (Hinduise) اور ہندو پر عسکریت کا رنگ چڑھانا۔

ہندو جب ''رام راج'' یا ''ہندوتا'' کی بات کرتے ہیں تو اس کی تشریح وہ یہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک مذہب کے لوگ رہیں گے اور وہی اس ملک کا نظم ونسق چلائیں گے اور یہ بہت پرانی سوچ ہے، آج کی نہیں۔ ۱۹۳۳ء میں کانگرس کے ایک لیڈر پاٹیکر نے ایک کمیشن قائم کر کے سپین بھیجا تھا کہ وہ ان حالات اور واقعات کا مطالعہ کر سکے جن کی وجہ سے سات سو سال تک اندلس پر شان وشوکت سے حکومت کرنے کے باوجود سپین سے مسلمانوں کا بیج تک ختم ہوگیا۔ ہندو کا مقصد آج بھی ہندوستان سے مسلمانوں کو منانا ہے، اس مقصد کے لیے وہ ہر ہندو کو فوجی بنانے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی سیاست پر کانگرس کا غلبہ رہا جس نے سیکولرازم کا نعرہ اپنایا جو فراڈ اور فریب تھا۔ کانگرس اس دھوکے کی آڑ میں مسلمانوں کی بیخ کنی کرتی رہی۔ اب

ہندوؤں کی اصل اور حقیقی سوچ کی نمائندہ بھارتیہ جنتا پارٹی سامنے آئی ہے۔ بی جے پی ہی ہندوؤں کی فلاسفی اور فکر کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے۔ یہ کانگرس کا اصل روپ ہے، یہ قول وفعل کا تضاد دور کرنے کی کوشش ہے۔

آج کل گجرال Doctrine کا بڑا چرچا ہے۔ جس کی بنیاد ہمسائیوں سے بہتر تعلقات ہے لیکن ہندوؤں کی سوچ اس نظریے سے میل نہیں کھاتی۔ ہندوستان کی موجودہ اجتماعی سوچ ''اندرا ڈاکٹرائین'' کا مظہر ہے۔ ''اندرا ڈاکٹرائن'' علاقے کے ممالک پر بالادستی، توسیع پسندی، ہندوستان پر ہندو کی ملکیت اور اقلیتوں کی غلامی وغیرہ کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اسی سوچ کی بنیاد پر سری لنکا پر حملہ کیا گیا۔ پاکستان کو دولخت کیا گیا۔ کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا گیا۔ نیپال کی ناکہ بندی کی گئی۔ چین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی۔ مالدیپ کے داخلی معاملات میں مداخلت کی گئی۔ سکم اور بھوٹان کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی اور اب برما پر محاذ آرائی کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ اندرا ڈاکٹرائن ہے۔ جس کی بنیاد پر ہندو برصغیر کے ان تمام علاقوں پر قبضے کا جتن کر رہا ہے جو کبھی انگریز کی سلطنت میں شامل تھے۔ یہ ہندوؤں کی حقیقی سوچ ہے یہ پہلی مرتبہ بی جے پی کے ذریعے کھل کر سامنے آرہی ہے۔ یہ بات باعث حیرت ہے کہ اندرا گاندھی کانگرس کی لیڈر تھی لیکن اس کے اصول ونظریات کی پیروی بی جے پی کر رہی ہے۔

بی جے پی دوقومی نظریے کی سچائی کی بھی تصدیق کر رہی ہے، قائداعظم اور نظریہ پاکستان کی سچائی بیان کر رہی ہے۔ وہ ثابت کر رہی ہے کہ خدانخواستہ پاکستان نہ ہوتا تو برصغیر کے مسلمانوں کا قومی تشخص ہی مٹ چکا ہوتا۔ نہ صرف مسلمانوں، بلکہ آج اگر ہندوستان کے شودروں اور پسے ہوئے طبقات کو بھی کوئی حقوق دلا سکتا ہے تو وہ پاکستان ہے، جو دوقومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لیے کہ بی جے پی تو غیر ہندو اور نچلی ذات کے دلتوں سے جینے کا حق ہی چھین لینا چاہتی ہے۔ آپ بی جے پی کے کارکنوں اور قائدین کا مشاہدہ کریں۔ برسوں پہلے سے یہ معمول ہے کہ ہندوستان کی بری، بحری اور فضائی فوج کے ریٹائر ہونے والے تمام افسر بی جے پی میں شامل ہوتے ہیں۔ عام فوجی سے لیکر جرنیل تک ریٹائرڈ ہو کر بی جے پی کی صفوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ عمل اس وقت سے جاری ہے جب یہ ایک ناقابل ذکر جماعت تھی۔ اس کا مطلب ہندوؤں میں عسکریت کا بیج بونا ہے اور انہیں جنگجو بنانا ہے۔

دوسری طرف پاکستان میں نواز شریف ''گجرال ڈاکٹرائن'' یعنی ''ہمسائیوں سے امن'' کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ اس نظریے کا مطلب ہے ہندوستان کے ساتھ مل کر آگے بڑھو، کشمیر کو بھول جاؤ اور دفاعی صلاحیت کم کردو۔ دراصل نواز شریف مسلم لیگ کی سوچ کے بجائے عوامی نیشنل پارٹی کے نظریے کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے درمیان نو برس تک اتحاد رہا۔ عوامی دباؤ میں آکر اگرچہ انہوں نے یہ اتحاد توڑا لیکن پھر بھی ان کی محبت کم نہیں ہوئی۔ یہ تو نظریہ پاکستان تھا جس کے سامنے نواز شریف کو سر جھکانا پڑا اور نہ نواز شریف ڈاکٹرین تو دوقومی نظریے سے متصادم ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گجرال ڈاکٹرائن (یعنی نواز شریف ڈاکٹرائن) اس ماحول میں زندہ رہ سکے گی، جبکہ واضح ہے کہ پاکستان میں بی جے پی کی پالیسیوں کے خلاف ردعمل پیدا ہوگا اور پاکستان میں دوقومی

نظریے کے قابل عمل ہونے میں اگر کوئی ابہام تھا تو وہ انشا اللہ ختم ہو جائے گا۔ پاکستان کے نقطہ نظر سے یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ کانگرس نے سیکولرازم کے پردے میں جو ڈھونگ رچا رکھا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ ہندوستان کا مسلمان اب اپنی اصل حیثیت کو شناخت کر سکے گا۔ ہندوستانی مسلمان پوری دنیا میں کشمیر کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے اور جہاد افغانستان سے دور رہے۔ اب ان کو اپنا طرز عمل بدلنا ہوگا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی سولہ کروڑ سے زیادہ ہے جو پاکستان اور بنگلہ دیش سے بھی زیادہ ہے۔ بھارتی مسلمانوں کا دین سے اٹوٹ رشتہ موجود ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں ردعمل پیدا ہوگا تو لامحالہ اس کے اثرات دوسرے خطے کے مسلمانوں پر بھی پڑیں گے۔ یہ دوقومی نظریے کی سچائی کی مزید تصدیق ہوگی۔ اس پر ایک نئی فکر کی تعمیر ہوگی۔ اس کے مثبت اثرات کشمیر پر بھی پڑیں گے، ہندوستان کا مسلمان جو ابھی تک تحریک آزادی کشمیر سے عدم دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا، اب اپنی بقا کے لیے اس کا عملی طور پر ساتھ دے گا۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک پاکستان پر دفاعی بجٹ کم کرنے کے لیے اصرار کر رہا ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں حقائق چھپائے جا رہے ہیں، لیکن درحقیقت ڈاؤن سائزنگ کی جا رہی ہے۔ بجٹ پر دباؤ ڈال کر اور قرضوں تلے دبا کر ہمیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنا دفاعی حجم اور دفاعی صلاحیت کم کر دیں۔ ممکن ہے امریکہ میں یہ خیال بھی ابھرے کہ ہندو عسکریت کہیں ان کے لیے کسی مصیبت کا باعث نہ بن جائے اور ہندو عسکریت کو روکنے کے لیے غالباً ان کی سوچ میں تبدیلی آئے، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پہلے وہ مسلمان مخالف ہیں۔ چاہے ہندوستان میں بی جے پی کی حکومت ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں اس خوش فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیے کہ ہم امریکہ کی ہمدردی کے مستحق ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنے طور پر اپنی توانائیاں اکٹھی کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں جوابی اقدام کرنا ہوگا۔ پہلا جوابی قدم تو یہ ہے کہ خود ہندوستان کے مسلمانوں میں مثبت ردعمل ہو...... بیداری پھیلے کہ وہ بکھر کر مختلف جماعتوں میں پھیل جانے کے بجائے ایک نئی سوچ وفکر کے ساتھ ایک جماعت میں ڈھل جائیں۔ پھر، ہندوستان کے دلتوں سے مل کر اپنے لیے راہ عمل تلاش کریں، دلتوں اور مسلمانوں کا اتحاد فطری ہوگا جبکہ مسلمانوں کے لیے کانگرس اور بی جے پی کے ساتھ چلنا خطرناک ہوگا۔ ہندوستانی حکومت کے اعداد وشمار کے مطابق اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بارہ فیصد ہے، بی جے پی نے ثابت کر دیا ہے ہندوستان میں سیاست کو مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندو اپنی سیاست مذہب کے نام پر کر رہے ہیں۔ پھر کیوں نہ مسلمان مسلم سیاست کریں؟ اگر مسلمان دوسروں کے دست نگر ہونے کے بجائے یک جا ہو جائیں۔ اور اپنی سیاست کریں تو آبادی کے حوالے سے ان کی ۶۵ نشستیں بنتی ہیں۔ موجودہ انتخابات میں تمام سیاسی پارٹیاں پندرہ آزاد اور متفرق ممبران کی محتاج ہیں۔ مسلمانوں کی ۶۵ نشستیں ہوں تو آئندہ برسوں میں ہندوستانی سیاست کی لگام مسلمانوں کے ہاتھ میں آ سکتی ہے۔ پھر ان کی ایک مضبوط بنیاد ہوگی۔ مسلمانوں کو فوری طور پر جداگانہ ووٹ کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر دولت بھی ان کا ساتھ دیں، یہ ایک بہت بڑی قوت بن سکتے ہیں۔ بہار اور اترپردیش سمیت بہت سی ریاستوں میں دلتوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔

اب ہندوستان کے مسلمان کو اعلانیہ کشمیر کاز کی حمایت کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے ان کو

باہر سے مدد و حمایت نہیں ملے گی۔ مسلمانان ہند کو چاہیے کو دنیا کو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے آگاہ کریں۔ ان کو ملازمتوں میں نظر انداز کیا جارہا ہے، امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جارہا ہے، ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی جارہی ہے اور ان کی ثقافت اور زبان کو ختم کیا جارہا ہے۔ ان زیادتیوں سے وہ دنیا کو آگاہ کریں۔

بھارت کے مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں بھی بی جے پی کے عزائم کے خلاف بھرپور ردعمل ابھرے۔ ہمارے نوجوان متحرک ہوں، کشمیر میں تحریک آزادی کے پشتیباں بنیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم مسئلہ کشمیر کی بھرپور حمایت کریں۔ اب بی جے پی وہاں جا کر پھنسے گی، انہوں نے اپنے منشور میں جو ارادے ظاہر کیے ہوئے ہیں وہ نفرت کے پانچ نکات پر مشتمل ہیں۔

۱۔ کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم ہونا چاہیے۔

۲۔ بی جے پی نے ایٹمی ہتھیار بنانے کا اعلان کیا ہے، جس کا لازماً نشانہ پاکستان ہوگا۔

۳۔ کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا عہد کیا گیا ہے۔ جبکہ ہم نے اس پر دستخط کر کے اپنے ہاتھ خود کاٹ دیے ہیں۔

۴۔ بی جے پی نے بابری مسجد کی طرح تین ہزار دوسری مساجد کو شہید کر کے مندروں میں تبدیل کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔

۵۔ مسلمانوں کا پرسنل لا ختم کرنے کا ارادہ ہے تاکہ مسلمان کا تشخص ختم ہو جائے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سپین سے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا تھا۔

ان منظر نامے میں ہم دیکھتے ہیں کہ آئندہ کا ہندوستان عسکریت پسند، توسیع پسند اور جارحیت پسند ہوگا۔ اس کے راستے کی واحد رکاوٹ پاکستان ہوگا کیونکہ یہ اپنے شہریوں کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی تقویت کا باعث بن سکتا ہے۔ وسط ایشیاء تک جانے کے لیے بھارت کے رستے کی رکاوٹ پاکستان ہوگا۔ مشرق وسطیٰ اور عرب ممالک سے تیل اور وسائل حاصل کرنے میں بھی پاکستان بھارت کے راستے کا پتھر ہوگا۔ لہٰذا بھارت کا ہدف پاکستان بنے گا، آج نہیں تو کل۔ بدقسمتی سے ہمارا اپنا نظام سیکولر ہے، اس نظریاتی کنفیوژن کو ختم کرنے کے لیے ایک تحریک کی ضرورت ہے۔ انقلابی روح پیدا کیے بغیر اندرونی اور بیرونی چیلنجز کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا، فوج کو بھی اس کا ساتھ دینا ہوگا۔ فوج کو سٹیٹس کو کے بجائے ایک عظیم سماجی تبدیلی کی حمایت کرنا ہوگی۔ فعالیت یا غیر جانبداری کے بجائے ایک تاریخ ساز کردار ادا کرنا ہوگا۔ ہمیں اس تحریک کو جنم دینا ہوگا۔ ایک انقلابی پاکستان ہی بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہم جب گزشتہ حالات اور واقعات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ امریکہ کے ساتھ ہمارا معاملہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ اس لیے ہمیں روس اور چین کے ساتھ تعلقات کو فوقیت دینی چاہیے، مسلمان ممالک سے روابط کو مضبوط بنانا چاہیے اور سب سے بڑھ کر اپنے نظریاتی تشخص کو بحال کر کے پاکستان کو سچا پاکستان بنانا ہوگا...... ایک ایسا مضبوط پاکستان جس کے ساتھ ہمارے دشمن ٹکرانے کی ہمت بھی نہ کر سکیں۔

# برصغیر پاک و ہند اور نئے امریکی عزائم

عراق میں ''آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم'' کامیابی سے مکمل ہوا تو امریکی سنٹرل کمان کے جنرل نارمن شیوازکوف(Norman Schwarzkoff) نے اپنے دفاعی اتاشی کے ذریعے مجھے ایک وڈیو کیسٹ بھیجی۔ اور اس سے کہا کہ وہ مجھے ملتان میں پہنچا دے تاکہ میں اس آپریشن کی فنی خوبیوں کی داد دے سکوں۔ میں اس وقت ملتان میں کور کمانڈر تھا۔ (جنرل سے میری افغان جنگ کے زمانے سے شناسائی تھی)۔ میں نے امریکی اتاشی سے پوچھا: ''کرنل!! اگر صدام تمہاری ڈیڈ لائن سے پہلے کویت خالی کر دیتا تو تمہاری اس مہم کا کیا حشر ہوتا؟'' کرنل نے کہا یہ سوال جنرل سے بھی پوچھا گیا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

"We had made sure that: he would not pull out" (ہم نے پورا انتظام کر رکھا تھا کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔)

فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ۔

آج جب میں غور کرتا ہوں کہ امریکہ نے اچانک جنوبی ایشیاء کے اندر اپنے رویے میں اتنی بڑی تبدیلی کیوں کر دی ہے۔ تو مجھے ''آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم'' میں امریکی کی منصوبہ سازی یاد آتی ہے۔ برصغیر میں امریکی پالیسی میں اچانک اتنا بڑا تغیر بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ کیا اس کا سبب محض ہندوستان کی بہت بڑی مارکیٹ ہے جس کا ان دنوں ابلاغ میں چرچا ہے۔؟ کیا امریکی سوچ سچ مچ ہندوستان کو اپنا دفاعی حلیف (Strategic Partner) بنانا چاہتے ہیں؟ امریکہ دفاعی حکمت عملی کے بارے میں میرا ماضی کا مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ بات بھارتی مارکیٹ اور دفاعی حکمت عملی سے بڑھ کر ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً ضرور کوئی مخفی ارادہ موجود ہے۔ ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا کہ وہ مخفی ارادہ کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بات ہر امریکی جانتا ہے اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھنے والا کوئی بھی فرد اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ امریکہ کی موجودہ یک قطبی (unipolar) حیثیت تا دیر باقی نہیں رہ سکتی۔ چین جونی الوقت اپنی اقتصادی پوزیشن بہتر کرنے میں لگا ہوا ہے اور کچھ ہی عرصے بعد امریکہ کی حریف طاقت کے طور پر ابھرنے کو ہے۔ اس طرح صدر پیوٹن کے حالیہ اقدامات سے صاف نظر آتا ہے کہ روس بھی مستقبل میں امریکہ کے گلے پڑ سکتا ہے۔ جیسے ہی تیزی سے ترقی کرتا ہوا چین حقیقی سپر پاور میں ڈھل جائے گا اور روس وسط ایشیاء کی ریاستوں پر دوبارہ رسوخ اور نفوذ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا، امریکہ کی عالمی توسیع پسندی اور غلبے کو حقیقی چیلنج درپیش ہوگا۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ مستقبل میں ماسکو اور بیجنگ امریکہ کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی بالادستی کے خلاف ایک مضبوط اتحاد قائم کر لیں۔ لہٰذا امریکہ کسی حقیقی حریف کے وجود

میں آنے سے پہلے دنیا بھر میں مفادات کی جھولیاں بھر لینا چاہتا ہے۔

دنیا کے نقشے پر نظر دوڑانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تمام اہم خطوں میں امریکہ پہلے ہی فوجی اور سیاسی غلبہ قائم کر چکا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں وہ بہت بڑی طاقت کے طور پر موجود ہے۔ شمال اور جنوب مشرقی ایشیاء (جاپان، کوریا، تائیوان، فلپائن وغیرہ) میں اس کی موجودگی بلا شرکت غیرے ہے۔ اسی طرح معرکہ کسووا کے بعد مشرقی یورپ میں روسی حصار کے اندر داخل ہو گیا ہے صرف جنوبی ایشیاء ایسا علاقہ ہے جہاں امریکہ کا فزیکل وجود نظر نہیں آتا ہے۔ اِدھر امریکی مفکر اور حکمت کار کچھ عرصے سے یہ خیال پیش کر رہے ہیں کہ ہمیں اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے دنیا میں اپنی سطوت کے جھنڈے گاڑ لینے چاہیے تاکہ ہمارے مفادات کو کوئی چیلنج باقی نہ رہے۔ موجودہ کیفیت کو وہ موقع کے کھلے جھروکے (Window of oppurtinity) سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے بند ہونے سے پہلے پہلے تمام کامرانیاں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ ۴ مئی کو بوسٹن میں امریکی نائب صدر (صدارتی امیدوار) الگور نے اپنی تقریر میں اس نئی ڈاکٹرین کا یوں اظہار کیا دنیا بھر میں جہاں بھی امریکی مفادات کو نقصان کا اندیشہ ہوگا امریکہ وہاں قبل از وقت مداخلت کر سکتا ہے۔ اس کا نام انہوں نے (Forward Engagement) رکھا ہے۔ ماضی میں امریکی توسیع پسندی کے لیے منرو ڈاکٹرین (Minro Doctrine) کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اس نظریے کے مطابق شمالی جنوبی اور وسطی امریکہ کے ممالک کو امریکہ کی منظوری کے بغیر کوئی ایسا اقدام کرنے کا حق نہ تھا، جس سے اس کے مفادات متاثر ہوتے ہوں۔

الگور نے اب منرو ڈاکٹرین کو عالمی سطح پر توسیع دینے کا اعلان کیا ہے۔ جس کی عملی صورت یہ ہے کہ سوائے جنوبی ایشیاء کے بیشتر خطوں پر پہلے ہی امریکی تسلط کا پرچم لہرا رہا ہے۔ تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ منرو ڈاکٹرین کی عالمگیریت کا عملی اظہار جنوبی ایشیاء میں ہوگا۔ اب آیئے ماضی قریب میں تاریخ کے چند مناظر کی مدد سے مستقبل کے امکانات اور مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

☆ پہلا منظر...... یہ وسط 1979ء ہے افغان عوام حفیظ اللہ امین کی کیمونسٹ حکومت کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہیں۔ پاکستان میں بھٹو کو پھانسی ہونے کے بعد سیاسی انتشار کی کیفیت ہے۔ ہے۔ امریکہ صدر کارٹر دن رات پاکستان کو دشنام ترازی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ انقلاب ایران ابھی اضطراری صورت حال سے دوچار ہے۔ اِدھر روس اپنی فوج کے کئی ڈویژن ماسکو کے قرب و جوار سے اُٹھا کر افغان سرحد پر متعین کر دیتا ہے۔ امریکہ حکمران سیٹلائٹ پر خاموشی سے یہ منظر دیکھتے ہیں۔ اور کسی خاص لمحے کا انتظار کرتے ہیں۔ ایک مصنوعی تاثر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ افغانستان کے خطے میں کوئی "امریکی دلچسپی موجود نہیں"۔ پاکستان تنہا ہے اور ایران غیر موثر پھر اچانک روس اس دام ہم رنگ زمین میں آ پھنستا ہے۔ مچھلی کانٹا نگل جاتا ہے۔ اس منظر کو نگاہ میں رکھیے۔

☆ دوسرا منظر...... عراق کا صدام حسین مشرق وسطیٰ میں امریکہ پسندیدہ شخصیت ہے۔ جس نے امریکہ کے اکسانے پر ایران پر حملہ کر کے ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اب صدام تیل کے تنازعے پر کویت سے ناراض ہے۔ وہ اپنے غم اور غصے کو چھپا کر نہیں رکھتا۔ دریں اثناء عراق میں متعین امریکی

سفیر اپریل گلیسپی(April Glaspie) صدام حسین سے ملنے جاتی ہے۔صدام اس سے شکایت کرتا ہے کہ کویت حد سے گزر رہا ہے، مجھے اس کے خلاف کچھ کرنا پڑے گا۔امریکی سفیر کہتی ہے''جناب صدر! یہ عربوں کا اندرونی معاملہ ہے، ہم اس میں ہرگز مداخلت نہیں کریں گے۔۲ اگست ۱۹۹۰ کو صدام کویت پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور پھر آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم کا آغاز ہوتا ہے، چین اور روس دبی زبان میں احتجاج کرتے ہیں، لیکن کوئی ٹھوس مزاحمت نہیں ہوتی۔عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی ہے اور امریکہ کو طے شدہ منصوبے کے مطابق خلیج میں اپنی فوجی قوت جمع کرنے اور اپنے مفادات پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔اب یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم کی ریہرسل دس برس پہلے ایروزونا(Arizona) کے صحرا میں کی گئی تھی۔یعنی کانٹا ڈالنے کے لیے دریا اور مچھلی کا انتخاب بہت پہلے کرلیا گیا تھا۔

☆ تیسرا منظر......مشرقی یورپ کا ہے۔یوگا سلاویہ ٹوٹنے کے بعد مختلف حصوں میں تقسیم ہوگیا۔یہاں بھی بساط سیاست کے شاطر ہر مہرہ پہلے سے طے کردہ منصوبے کے مطابق چل رہے تھے۔انہیں معلوم تھا کہ سربیا میں ملازوچ مسلمانوں کی نسل کشی کرے گا تو بہت کوسود کا معاملہ اُلجھ جائے گا۔وقت کا خاموشی سے انتظار کیا گیا پھر مسئلہ پیدا ہوگیا تو اس سے نمٹنے میں بھی غیر معمولی مہارت دکھائی گئی۔اگر مداخلت کاری کے لیے اقوام متحدہ کو استعمال کیا جاتا تو خدشہ تھا کہ روس اور چین اپنے دفاعی حصار میں مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے اور سلامتی کونسل میں ویٹو کا حق استعمال کر کے امریکی منصوبے کو ناکام بنادیں گے۔چنانچہ نیٹو(NATO) کو استعمال کیا گیا۔روس اور چین احتجاج کرتے رہ گئے۔امریکہ نے دیکھ لیا کہ وہ دونوں اس کی پیش قدمی پر ناراضگی کا اظہار تو کرسکتے ہیں مگر اس کے عزام کے راستے میں مزاحم نہیں ہوسکتے۔

اب نیا منظر برصغیر میں کھلتا ہے۔پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان کو دنیا بھر میں تنہا کیا جارہا ہے۔دونوں پر دہشتگردی کی اعانت کے الزامات ہیں۔پاکستان کے قریبی دوست بھی کھل کر اس کے موقف کی حمایت کی پوزیشن میں نہیں۔ہندوستان اور پاکستان کے مابین کشمیر کی شکل میں تنازعہ موجود ہے۔اس تنازعے کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھنے کے بجائے جوہری جنگ کے شدید خطرے نیوکلیئر فلیش پوائنٹ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔صرف دنیا کو دکھانے کے لیے کلنٹن نے براہ راست اس خطے میں آ کر میں خطاب کیا اور اعلان کیا کہ دونوں ملکوں کی جنگ اس خطے کو جلا کر بھسم کرسکتی ہے۔اسی ہزار کشمیریوں کے لہو کی کوئی قیمت نہیں، بلکہ اپنے حق کا دفاع کرنے والوں کو دہشت گرد کہا جارہا ہے۔ہندوستان کو اس ''دہشت گردی'' کا خاتمہ کرنے کے لیے مدد کی پیش کش کی جارہی ہے۔پاکستان پر حملے کی ترغیب دی جارہی ہے۔اس طرح دراصل اس خطے میں امریکی ''امن فوج'' کی آمد یا کسی اور آپریشن ''ڈیزرٹ اسٹارم'' کا جواز ڈھونڈا جارہا ہے۔دوسری طرف مسٹر کلنٹن ہندوستان کو اسی طرح کا کانٹا پیش کررہے ہیں، جس طرح روس اور صدام کو پیش کیا گیا تھا۔ہندوستان کو تسلی اور تھپکی دی جارہی ہے کہ وہ پاکستان پر حملہ کرتا ہے تو امریکہ پاکستان کو تنہا چھوڑ دے گا۔کارگل کے شکست خوردہ بھارتی جرنیل اس

کانٹے کو نکلنے کے لیے پہلے ہی بے تاب ہیں، تاہم ہندوستان کی کہنہ مشق سیاسی قیادت شاید اس پر متفق نہیں ہوئی۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ وزیر اعظم واجپائی کے متبادل کے طور پر جسونت سنگھ کو امریکہ آگے لائے۔ اگر پاکستان کے خلاف بھارت مہم جوئی شروع کر دیتا ہے تو امریکہ کے من کی مراد پوری ہو جاتی ہے ورنہ ایٹمی جنگ کے خطرے کا بہانہ بھی امریکی مداخلت کا جواز بن سکتا ہے۔ یاد رہے کہ 1996ء دلی میں مقیم امریکی سفیر کشمیر میں الیکشن کرانے کے سلسلے میں بہت سرگرم تھے۔ انہوں نے پاکستان کے دورے کے دوران سٹاف کالج کوئٹہ سے خطاب میں مَیں کشمیر میں نام نہاد الیکشن کی پرزور وکالت کی تھی، بظاہر نمائندہ چہرہ ان کی سخت ضرورت ہے۔ صرف ایک کشمیری چہرہ چاہیے جو امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں کو مداخلت کی دعوت۔ حریت کانفرنس کے موجودہ رویے سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے گھناؤنے مغل میں شریک نہیں ہوگی۔ لیکن کٹھ پتلی وزیر اعظم فاروق عبداللہ کے کچھ بعید نہیں۔

پاکستان پر بھارت کے حملے یا امریکی مداخلت کاری کے راستے میں واحد روکاوٹ اس خطے میں موجود جذبہ جہاد کا پھیلاؤ ہے پاکستان کی ایٹمی صلاحیت جہاد کے ساتھ مل کر دشمن کے لیے ایک سخت چیلنج بنی ہوئی ہے اور امریکہ اسے ختم کرنے کے لیے بھارت سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سلسلے میں خود پاکستان پر بھی شدید دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ دینی مدارس کے خلاف اقدامات کرنے اور جہادی تنظیموں پر روک لگانے کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔ جہاد کی موجودگی میں ہندوستان کو عالم اسلام سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کرتا ہے تو اس مرتبہ بات پاکستان تک محدود نہیں رہے گی بلکہ یہ اسلام کے خلاف جنگ بن جائے گی۔ خود پاک فوج بھی ایک جہادی تنظیم ہے، اس کا رسمی نعرہ ''ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ'' ہے تو کیا اصل ہدف پاک فوج ہے؟ پاکستان کے عوام اور حکومت کو دشمن کے ناپاک عزائم سے خبردار رہنے کے ساتھ ساتھ اپنی اصل قوت بھی آگاہ رہنا چاہیے۔ خدانخواستہ دشمن ہمارے جذبہ جہاد، دینی مدارس اور جہادی تنظیموں پر وار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا............

# ڈیورنڈ لائن اور امریکی نقش راہ

2240 کلومیٹر طویل ڈیورنڈ لائن پاکستان اور افغانستان کے درمیان معروف معنوں میں سرحد ہے بھی اور نہیں بھی۔ پاک بھارت سرحد کے برعکس ڈیونڈ لائن دو ملکوں اور قوموں کے درمیان تقسیم کے بجائے ملاپ کی علامت ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے جسے سمجھنے کے لیے مسلم قومیت کے بنیادی تصور سے آشنا ہونا ضروری ہے یعنی خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ قائداعظم اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اوائل 1948ء میں جب آپ طورخم بارڈر پر تشریف لے گئے تو وہاں نصب زنجیر کے پاس کھڑے افغان سنتری سے ہاتھ ملایا کہ یہ انگریز کی بنائی ہوئی مصنوعی رکاوٹیں ہیں۔ مسلمان ہمسایہ ممالک کے درمیان ان کی چنداں ضرورت نہیں۔ مطلب واضح تھا کہ قائد افغانستان کے ساتھ نرم (soft) بارڈر کے حامی تھے۔ باوجود اس کے کہ ظاہر شاہ کا افغانستان وہ واحد ملک تھا جس نے پاکستان کی اقوام متحدہ میں داخلے کی مخالفت کی تھی۔ انہی دنوں میں قائداعظم کے حکم پر ڈیورڈ لائن واقع باقاعدہ فوج کی تمام چھاؤنیاں فی الفور خالی کر دی گئیں بلکہ شمال مغربی علاقوں میں موجود نیم فوجی دستے بھی کشمیر میں جہاد کے لیے بلا لیے گئے۔

آپریشن کرزن کے عنوان سے ڈیورڈ لائن کے ساتھ پھیلی ہوئی درجنوں چھاؤنیاں بڑی سرعت کے ساتھ خالی کر دی گئیں۔ جنوب میں چمن شیلا باغ (درہ خوجک) اور شمال میں دروش (چترال) تک کتنے ہی گریزن اچانک بے آباد ہو گئے۔ لورالائی، ژوب، وانا، غزمک (جسے چھوٹا لندن بھی کہا جاتا تھا) میر علی، ٹل، شب قدر، مالاکنڈ غرضیکہ ہر جگہ سے باقاعدہ فوج کو واپس بلا لیا گیا۔ میری اپنی رجمنٹ 19 لانسر کال ایک بکتر بند اسکواڈرن میر علی سے اس تیزی سے نکلا کہ شام کو تو وہاں پر موجود تھا لیکن الصبح قبائل خالی بیرکوں میں جھانک رہے تھے۔ قائدؒ کی بصیرت کو داد دینا پڑتی ہے کہ ان کی عطا کردہ افغان پالیسی اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ 56 سال کی اونچ نیچ کے باوجود افغانستان کی طرف سے ہماری سلامتی کو بھی کوئی خطرہ درہ پیش نہیں ہوا۔ ہر چند کہ ظاہر شاہ کے دور میں بھارت کی شرپر پختونستان کا شوشہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس دوران بھارت سے تین جنگیں ہوئیں اور ہمیں کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ مغربی سرحد پر ایک بھی مسلح سپاہی تعینات کیا جائے

اس دوران ڈیورڈ لائن ایک کھلے اور سوفٹ بارڈر کے طور پر قائم رہی۔ تاوقتیکہ روسی مداخلت کے بعد اس کی رسمی حیثیت بھی پہلے جیسی نہ رہی جنگ کے ستائے ہوئے بے خانماں افغان جوق در جوق پاکستان کی آغوش عافیت میں آتے رہے۔ چاہے وہ ازبک ہزارہ، پشتون، ایمک، تاجک یا کسی اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ پاکستان کو اس سے بھی غرض نہ تھی کہ وہ کیمونسٹ تھے یا اسلام پسند، ظاہر شاہ کے حامی تھے یا مجاہدین کے

سرفروش ہیں بس اتنا معلوم تھا کہ وہ ایک آفت زدہ ہمسایہ ملک کے باشندے تھے جنہیں پناہ کی ضرورت تھی۔ ایک وقت 35 لاکھ افغان یعنی کہ افغانستان کی کل آبادی کا 1/5 حصہ پاکستان کی سرزمین پر مقیم تھا۔ آج بھی تقریباً 18 لاکھ افغان باشندے یہاں موجود ہیں۔

نفع و نقصان کے پیمانوں سے ہٹ کر پاکستان کے تاریخی کردار پر غور کرنا ہوگا۔ ایک غریب قوم کی فیاضی کتنی بے مثال تھی لیکن یہ کوئی ان پر ہمارا احسان بھی نہ تھا کیونکہ تاریخی حوالوں سے دیکھا جائے تو افغان ہماری بھی جنگ لڑ رہے تھے اور ماضی میں بھی جب بھی ہندوستان میں مسلمانوں مشکلات پیش آئیں اور جب بھی انتشار نے سر اٹھایا تو افغان ہماری مدد کو آتے رہے۔ شہاب الدین غوری، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی ہمارے نجات دہندہ ثابت ہوئے۔ جنہوں نے ہندوستان میں اسلام فتنوں کو کچل کر رکھ دیا۔ وہی ہمارے ہیرو ٹھہرے۔ اس بار جب افغانوں پر آفت پڑی تو پاکستان نے وہ تاریخی قرض چکا دیا جس پر ہمیں فخر ہونا چاہیے۔ افغانستان کے ساتھ ہمارے لازوال رشتے ہیں نامور فاتحین کے علاوہ افغان صوفیائے کرام (حضرت علی ہجویریؒ)، حضرت معین الدین چشتی ہمارے روحانی پیشوا بنے۔ تو افغان مفکر اور شاعر بلال الدین دی، فردوس اور جمال الدین افغان نے ہماری فکری رہنمائی۔ غرضیکہ ہر میدان میں افغان ہماری اصل شناخت ثابت ہوئے اور ہمارے لیے فخر کا سامان فراہم کرتے رہے۔ دوسری طرف افغان قوم اقبال لاہوری یعنی کہ علامہ اقبال سے اتنی ہی متاثر ہے کہ جتنی کہ خود پاکستانی قوم۔ جب بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی آزادی یا احیائے اسلام کی تحریکیں چلیں تو ہمارے اسلاف نے کابل ہی کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔ سید احمد بریلوی شہید کی تحریک جہاد سے تحریک خلافت تک سب کا رخ افغانستان کی طرف تھا۔ پھر روس کے ساتھ معرکے میں تو منظر ابھرا کہ افغانستان اور پاکستان یک جان اور دو قالب ہو گئے۔ روس کی شکست و ریخت کے نتیجے میں وسط ایشیا کے دروازے کھلنے شروع ہو گئے اور اس خطے میں ایک عظیم الشان مسلم بلاک کے امکانات روشن سے روشن ہوتے چلے گئے۔ ایک ایسا بلاک جو تہذیبوں اور اہم جغرافیائی اکائیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ اور وسائل سے مالا مال بھی۔ اس کے اثاثوں میں نظریاتی توانائی کے علاوہ جوہری صلاحیت اور تیل و گیس کی فراوانی کے ساتھ متحرک افرادی قوت بھی موجود ہو۔ ایک وقت میں یوں دکھائی دیتا تھا (اب بھی اس کے امکانات موجود ہیں) کہ قدرت ایک نیا شاہکار تخلیق کر رہی تھی۔ بھلا یہ بھارت، روس، اسرائیل اور امریکہ کے لیے کیسے قابل قبول ہو سکتا تھا اور یہی وہ روشن طبع ہے جو فی الوقت ہم پر بلا بن کر ٹوٹ پڑتی ہے۔ ان امکانات کو روکنے کے واسطے استعماری قوتوں پر لازم ہے کہ وہ پاکستان اور افغانستان کے تاریخی رشتوں کو منقطع کر دیں۔ اور دو قوموں کے درمیان محبت بجائے نفرت کے بیج بو ڈالیں۔ اس طرح بالآخر اسلامی پاکستان ایک ابھرتے ہوئے اسلامی بلاک سے علیحدہ کر کے تخت دلی کے مدار میں واپس دھکیل دیا جائے۔ [illegible] ڈیورنڈ لائن کو بحال کرنے کی کاوشیں، یا افغانستان کے چند شہروں میں پاکستان مخالف مظاہرے یا [illegible] ناخلیل زاد کی پاکستان کو وارننگ کہ اس پس منظر میں دیکھنے کی گنجائش اور ضرورت ہے۔

برطانیہ اور افغانستان کی دوسری جنگ کے بعد معاہدہ گندمک کی رو سے جب ہندوستان کے سرویئر جنرل [illegible] ڈیورنڈ نے 1893ء میں سرحد کی یک طرفہ حد بندیاں شروع کی تو ہم اونچا مقام برطانوی ہندوستان کی

حدود میں شامل کر لیا لیکن اس کے برعکس انتہائی شمال میں داخان کی تنگ پٹی کو بلا کسی جغرافیائی جواز کے افغانستان کے حوالے کر دیا۔ کابل نے احتجاج کیا کہ یہ علاقہ ہمارا نہیں ہے لیکن برطانوی استعمار کی اپنی مخصوص ضروریات ہیں یعنی وہ روس کی جنوب میں پھیلی ہوئی طاقت کو دیکھ رہے تھے اور اس کے ساتھ متصل سرحد نہیں چاہتے تھے یہ ایک بڑا کھیل تھا جسے کپلنگ نے گریٹ گیم کا نام دیا۔ اس کھیل کے لیے انہیں افغانستان کی شکل میں ایک بفر اسٹیٹ چاہیے تھا۔ ڈیورنڈ لائن کے قیام نے اس ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام کر دیا۔ آزاد قبائل بشمول مہمند، شنوار، آفریدی، منگ وزیر محود، سلیمان خیل غضرنی، کاکڑ، نورزئی اور اچکزئی اس لائن کے دونوں طرف آباد تھے اور اب بھی ہیں۔ ان کے مزاج رواج اور حالات کے مطابق وہ ہر دو اطراف آزادی سے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ لائن کے اس پار کے قبائل اگرچہ رسمی طور پر برطانوی عملداری میں تھے لیکن وہ کابل کی سیاست پر اثرات بھی رکھتے تھے گویا ایک باریک طرح سے وہ دونوں اطراف کے شہری تھے۔

# افغان قوم پر امریکی حملہ اور پاکستان

امریکہ نے بالآخر کمزور اور مظلوم افغانستان پر حملہ کر ہی دیا۔ گزشتہ کئی روز سے افغان شہروں پر آگ برس رہی ہے امریکیوں کی روش پر اظہار افسوس تو بے کار ہے لیکن اپنی حکومت کے فیصلوں پر بہت دکھ ہے جس نے اسامہ بن لادن کے خلاف ناقص اور نامکمل شہادتوں کو رد کر چکی تھی اور اس سے قبل خود ہماری حکومت ان کو مسترد کر چکی تھی اِدھر امریکی ماہرین قانون کہہ رہے تھے کہ یہ ناقص ثبوت کسی عدالت میں پیش نہیں کیے جا سکتے یعنی اسامہ کے خلاف ان کی بنیاد پر کوئی فرد جرم عائد نہیں کی جا سکتی۔

۱۱ ستمبر کے واقعہ پر امریکہ کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں انسانیت نے ماتم کیا لیکن اس واقعے نے جس طرح دنیا کی واحد سپر پاور کے اخلاقی کردار اور جرأت و ہمت کا بودا پن واضح کیا وہ ناقابل تصور ہے۔ وہ قیادت جو ساری دنیا کو کنٹرول کرنے کی مدعی تھی اس نے اس واقعے پر جس ردعمل کا اظہار کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں دانش و علم، اخلاق و کردار اور نظم و ضبط سے محرومی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ افغانستان میں بے گناہوں کا لہو بہانے کے لیے جس طرح جھوٹ کے قلعے تعمیر کیے گئے ہیں اس سے برتری کے دعووؤں کے ڈھول کا پول کھل گیا۔ دراصل عالمی قیادت حاصل کرنے کے لیے امریکیوں نے کوئی محنت نہیں کی اور نہ ہی قربانی دی، یہ اچانک کامیابی ان کے لیے افغان قوم کا تحفہ تھی، جس نے اپنے خون کے سمندر سے گزر کر امریکہ کے واحد حریف روس کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا اور امریکہ کے سر پر عالمگیر قیادت کا تاج سجا دیا لیکن امریکی اس بڑائی کے اہل نہیں تھے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعے نے ان کی پست ہمتی کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کا کھوکھلا پن بھی واشگاف کر دیا۔

امریکہ نے جوش انتقام میں جس ہیجان کا مظاہرہ کیا، اس سے دنیا اسلام کو اپنی شناخت اور پہچان کے حوالے سے ایک واضح پیغام مل گیا۔ امریکہ نے مسلمانان عالم کو بلاامتیاز رنگ و نسل باور کرا دیا کہ وہ چاہے مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب تمدن یکساں طور پر انہیں اپنا دشمن خیال کرتا ہے۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کی وضع قطع کیسی ہے وہ داڑھی رکھتے ہیں یا مونچھ عرب ہیں یا عجم ہنسی ہیں یا شیعہ...... دینی مدارس کے پڑھے لکھے یا آکسفورڈ یا ہارورڈ یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل، مغرب میں ان سب کو یک قلم دہشت گرد قرار دے دیا۔ اس مرحلے پر امت گروہوں میں بٹی ہوئی نہ ہوتی تو یہ شناخت ہمارے بہت کام آتی لیکن ہماری قیادت امریکی سحر سے مسحور نکلی۔ ساٹھ ملکوں کے سربراہ استعماری جارحیت کے سامنے احتجاج تک نہ کر سکے۔ خصوصاً تاریخ کے اس اہم موڑ پر پاکستانی قیادت کا عزم و استقامت نہ دکھانا سب سے زیادہ دردناک المیہ ہے۔ ایک ٹیلی فون پر ہی ہم جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ مان لیا ایسا گن پوائنٹ پر کیا گیا لیکن بعد میں اُٹھنے کا موقع بھی آیا تو یہ اُٹھ نہ پائے

بلکہ اور بھی لپیٹتے چلے گئے۔ میں نے کہا تھا اگر آپ یہ غلطی کر چکے ہیں تو مزید غلطیوں سے بچیں۔ صاف صاف کہہ دیں یہ ہماری حد فاصل ہے، اس سے پیچھے ہم ہرگز نہیں جائیں گے، ہماری قوم اس کی اجازت نہیں دے گی لیکن انہوں نے قومی احتجاج کو بھی ''حقیر اقلیت'' اور مٹھی بھر انتہا پسندوں کا احتجاج قرار دیکر مسترد کر دیا بلکہ پورے ملک میں غم و غصے کی لہر کو افغان مہاجرین کا احتجاج قرار دیکر دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اول تو دس پندرہ فیصد کو ''حقیر اقلیت'' سمجھنا ہی نہایت غلط ہے اس لیے کہ یہ ڈیڑھ دو کروڑ لوگ بنتے ہیں جو قوم کی اصل قوت اور جوہر ہیں۔ یہی اقلیت تو ہر تبدیلی لاتی ہے۔ پھر یہی لوگ قوم، فوج اور حکومت کی پشت پناہ ہیں۔ مشکل کے وقت ملک کی اصل قوت بنتے ہیں۔ انہیں حقارت سے ٹھکرا دینا دانش بصیرت کے منافی ہے، جبکہ یہاں کہا جا رہا ہے کہ حکومت کا فیصلہ بصیرت اور حکمت پر مبنی ہے، کسی کو اس کے خلاف بات کرنے کا حق نہیں۔ حکمت خوف کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا نہیں بلکہ ناموافق حالات میں درست فیصلہ کرنے اور مایوسی کے اندھیروں میں ثابت قدمی سے کھڑے رہنے کا نام ہے۔ پسنی، گوادر اور دوسرے اڈوں کا دے دینا تو حکمت نہیں ...... ان قومی مفادات پر تسلیم خم کرنا تو قومی خودکشی کے مترادف ہوگا، اس طرح تو کل ہم انہیں اپنی جوہری طاقت کی ''حفاظت'' بھی سونپ دیں گے۔ اس طرح کی حکمت تو جہاد کے خاتمے پر مصالحت کرنے کی ترغیب دے سکتی ہے، یہ امریکہ کو موقع دے دیگی کہ وہ چین سے ہمارے تعلقات میں رخنہ ڈالے، ہماری رعائتوں سے فائدہ اُٹھا کر وہ مستقل طور پر یہاں بیٹھ جائے، کشمیر کی تحریک کو ختم کرنے کا مطالبہ کرے۔ سوال یہ ہے اس وقت ہماری ''حکمت'' کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس طرح تو پاکستان کی بقاء سلامتی اور آزادی برقرار نہیں رہ سکتی۔

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ کوئی نظریاتی ریاست اپنے نظریے اور عقیدے کے بغیر زندہ نہیں سکتی ہم نے لا الہ الا اللہ کے بجائے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا دیا۔ ہمارا نظریہ تو اسلام اور پاکستان کو یکجان و دو قالب قرار دیتا ہے مگر ہم نے اسلام کو ہٹا دیا اور پاکستان کو اولیت دینے کا نعرہ لگایا اب اس طرح نظریے سے دستبرداری کی روش اپنا لیں گے کل کو کوئی اُٹھ کر کہے پنجاب سرحد سے پہلے اور سندھ بلوچستان سے آگے۔ یہ طرز فکر نہ صرف ہماری تاریخ بدل دے گا بلکہ اس بات کا خدشہ ہے کہ (خدانخواستہ) ہمارا جغرافیہ بھی بدل ڈالے۔ اگر ہم امریکہ کی ترجیحات پر پاکستان کی قومی ترجیحات کو قربان کریں گے تو پھر ہمارے قدم کہیں نہیں رُک سکیں گے۔ اگر ہم صرف الزامات کو ''شہادت'' اور ''ثبوت'' تسلیم کرنے لگیں گے تو پھر ہماری ہر قومی پالیسی امریکہ کے تابع مہمل بن جائے گی۔

انڈونیشیاء سے لیکر افریقہ تک مسلمانوں کے اندر غم و غصے کی جو لہر پھیل گئی ہے اور پوری دنیا میں امریکہ جھنڈے جلائے جا رہے ہیں، اس کے بعد ہمارے کمزور فیصلے کی پوزیشن اور بھی کمزور ہو گئی ہے۔ افغانستان پر حملے کے بعد طالبان (جو اسلامی حکومت ہے) نے امریکہ کے خلاف اعلان جہاد کر دیا ہے، اس صورت میں ہماری پوزیشن کیا رہ جائے گی اب اسلامی ممالک کی سرحدوں پر کس کا کنٹرول باقی رہ جائے گا، کیا پاکستانی حکومت یا دوسرے اسلامی ممالک اپنے شہریوں کو افغانستان پہنچنے سے روک سکیں گے۔ جبکہ ہندوستان جیسے ملک کے اندر امام سید احمد بخاری نے یہ اعلان کر کے سب کو چونکا دیا ہے کہ ہمیں بھی جہاد میں حصہ لینا ہوگا۔ اگر

برازیل، فلپائن اور ساؤتھ افریقہ جیسے ممالک امریکی جارحیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں تو پاکستان کیسے اس کے اثرات سے بچ سکتا ہے۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لینے سے خطرہ تو نہیں ٹلے گا امریکی مقاصد ہرگز وہ نہیں جو ظاہر کیے گئے ہیں ان کی نظر ہماری جوہری صلاحیت کے خاتمے پر ہے، وہ جہاد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کشمیر کی تحریک آزادی ان کا اگلا ہدف ہوگی لہٰذا آج پاکستان کے ''بچ'' جانے پر خوشیاں منانا عبث ہے۔ ہمارے حکام اور سرکاری دانشور اور خصوصاً انگریزی کالم کار بے شک رات کو دن کہتے رہیں مگر کون مانے گا۔ اس مرحلے پر ڈالر نے یلغار شروع کر رکھی ہے۔ یہ بھی ڈالر کا کرشمہ ہے کہ حکومت کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ ابھرتی ہوئی مزاحمتی اسلامی قوت کو کچل دیا جائے لیکن اس ملک کی فوج اپنی قوم کے صاحب کردار اور محب وطن لوگوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرے گی، جو لوگ پاک فوج کے بارے میں اس بدگمانی میں مبتلا ہیں وہ اس کے جذبہ جہاد سے آشنا نہیں۔ فوج اور عوام میں تصادم کے آرزومند مال بنانے والے لوگ ہیں جو اپنا خوف دور کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ غیر انسانی اور غیر جمہوری طرز عمل نہیں چل سکے گا۔ افغانستان پر امریکی حملہ بستیوں پر اندھا دھند بمباری اور ہزاروں بے قصور لوگوں کے قتل ناحق پر دنیا بھر کے مسلمان اور باضمیر انسانیت چیخ اٹھی ہے لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں بہت سے لوگ منقار زیر پر ہیں۔ اس موقع پر بے ضمیر یا ایمان فروش طبقوں کا رویہ قابل فہم ہے لیکن باضمیر اور محب وطن پاکستانیوں کا خاموش رہنا حیرت میں ڈالتا ہے۔ میں اپنے ملک کی وکلا برادری سے پوچھتا ہوں کہ وہ افغانستان پر بے جرم و خطا جارحیت کے بعد بھی خاموش کیوں ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے نیویارک اور واشنگٹن کے واقعات سے مسلمانوں کو کہیں بھی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اس کا تمام تر فائدہ اسرائیل کو ہوا۔ اسرائیلی وزیراعظم شیرون امریکہ انتظامیہ کو ریاست فلسطین تقسیم کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ منصوبہ پہلے سے تیار تھا واردات طے شدہ پروگرام کے مطابق کی گئی۔ سوال یہ ہے کہ ہماری وکلا برادری اور دوسرے اصحاب علم و دانش اس جرم کے پیچھے چھپے ہوئے یہودی مقاصد کو کیوں نہیں سمجھ پائے۔ ایک شخص کو بلا ثبوت مجرم قرار دینے اور اس کو بہانہ بنا کر ایک مظلوم اسلامی مملکت پر آگ اور بارود کی بارش برسانے اور ہزاروں بے گناہ شہریوں کو شہید کرنے پر دانش اور ضمیر خاموش کیوں ہیں؟ یہ لوگ کیوں چپ سادھے ہوئے ہیں۔

# وزیرستان معاہدہ افغانستان میں امن کے لیے پائلٹ پروجیکٹ ہے

## (روزنامہ انصاف، راولپنڈی، 13 ستمبر 2006ء بروز بدھ)

جنرل پرویز مشرف نے امریکہ جانے سے پہلے افغانستان کا دورہ کیا ہے لیکن جنرل پرویز مشرف اپنے طور پر افغانستان سے معاملات نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ امریکہ کی طرف سے کوئی اشارہ ہوتا البتہ صدر بش نے شمالی وزیرستان کے معاہدے پر تشویش کا جو اظہار کیا ہے وہ بے جا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اب اس معاہدے کی حمایت کی ہے۔ صدر بش کو پاکستان کی طرف سے بتایا گیا تھا کہ ہم نے لڑائی کر کے دیکھ لی ہے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اب ہم کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر کے دیکھیں گے۔

صدر پرویز مشرف یہی بات کرزئی صاحب کو سمجھانے گئے تھے کہ آپ (شمالی وزیرستان) اس معاہدے کے نتائج تو دیکھ لیں اپنی جلدی رائے نہ دیں۔ شمالی وزیرستان کا معاہدہ دراصل ایک پائلٹ پروجیکٹ ہے۔ اس پر امریکی بھی دل میں مطمئن ہوں گے۔ مجھے ایسا نظر آ رہا ہے کہ امریکہ کا افغانستان میں جنگ کا یہ آخری سیزن ہے کیونکہ نیٹو افواج نے یہ کہہ دیا ہے کہ ہم صرف دو ماہ تک مزید لڑیں گے اور اس کے بعد ہم واپس ہونا شروع ہو جائیں گے لہٰذا امریکیوں کو اپنی ساری کاوشوں کے لیے نیا موڑ مڑنا پڑے گا۔ جیسے کہ امریکہ میں مضامین شائع ہو رہے ہیں پھر امریکہ کو ملا عمر سے بات کرنا پڑے گی۔

شمالی وزیرستان میں اس کلیے کو ایک چھوٹے ماڈل کے طور پر آزمایا جا رہا ہے۔ جس میں امریکہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان کی مرضی کے نتائج حاصل ہوتے ہیں یا نہیں۔ امریکیوں کو بالآخر افغانستان میں بھی یہی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ یاد کیجیے! کہ جون 2004ء میں نیک محمد کے ساتھ شکئی معاہدہ ہوا تھا۔ جنرل صفدر اور نیک محمد نے ایک دوسرے کو ہار پہنائے تھے خوشیاں منائی گئیں لیکن امریکیوں کو یہ پسند نہیں آیا لہٰذا انہوں نے فوری طور پر نیک محمد کو قتل کرا دیا۔

یہ سازش کس طرح ہوئی تھی کبھی اس پر سے بھی پردہ اُٹھے گا۔ بہر حال وہ ایک ٹارگٹ کلنگ تھی جس کے بعد پھر لڑائی شروع ہوگئی۔ پھر بالآخر 17 جولائی کو سرا روغہ میں ایک معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں جنوبی وزیرستان میں امن ہے، اگر شمالی وزیرستان کی جنگ جاری رہتی تو طالبان کا اثر ونفوذ ڈیرہ اسماعیل خان، ٹانک اور دوسرے علاقوں میں پھیل رہا تھا جو روشن خیالی کے تمام تر دعووں پر پانی پھیر رہا تھا۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ جنرل پرویز مشرف کسی حد تک امریکیوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن جارج بش اسے حتمی نتیجہ قرار نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ پھر چہ میگوئیاں ہوں گی آوازیں بلند ہوں گی کہ پاکستان ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ پھر حامد کرزئی

پر بھی دباؤ تھا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ پاکستان امریکہ سے بدک جائے لہٰذا کرزئی کو بھی سمجھایا گیا۔

جنرل پرویز مشرف کو اچانک افغانستان بھیجا گیا اور یہ سب کچھ امریکہ کے دورے کی تیاری کے ضمن میں ہو رہا ہے ایک طرف تو یہ تیاریاں ہیں لیکن دوسری جانب یورپ میں بش کے واحد حامی برطانوی وزیر اعظم کے خلاف مہم شروع ہو گئی ہے۔ مجھے اس مہم کے چلنے پر حیرانی نہیں ہے کہ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ اتنی تاخیر سے کیوں شروع ہوئی۔ ٹونی بلیئر سے جو بہت بڑی غلطی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ برطانیہ کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ اس بات کے حق میں نہیں ہے کہ ان کو اس طریقے سے افغانستان کی جنگ میں جھونک دیا جائے اور بالخصوص ان علاقوں میں جہاں ان کو اپنی تاریخ کی بڑی شکستوں سے دوچار ہونا پڑا۔

برطانیہ کی پوری تاریخ میں ایسا عبرتناک مقام کبھی نہیں آیا تھا۔ مہندی کی جنگ 1880 میں ہوئی تھی اس سے پہلے 1842ء میں انگریزوں کے 16 ہزار سپاہی مارے گئے تھے اور ایک شخص زندہ بچ کر پشاور پہنچا تھا۔ اسے اس لیے چھوڑا گیا تھا کہ جا کر تباہی کی داستان سنا سکے، پھر 1880ء میں مہمند میں جہاں اب سنگین اور پنجوائی کے اضلاع واقع ہیں، اس علاقے میں ایک دن ہلمند دریا کے کنارے انگریزوں کے 15 سو آدمی مارے گئے تھے۔

یہ برطانیہ کی بدترین شکستوں میں ایک تھی اور 1919ء میں یاک بار پھر برطانوی فوجوں کو مار بھگایا، اس لیے برطانوی ملٹری کو یہ بات معلوم تھی کہ 4 ہزار 5 ہزار دستوں سے ہم کیا کر لیں گے اور ان کا کیا بگاڑیں گے اور اب یہ بات بڑی واضح ہو گئی ہے۔ امریکہ نیٹو کے دوسرے ممالک کی منتیں کر رہا ہے کہ مزید دستے بھیجو۔ وہ بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جرمنی نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ افغانستان میں ہم کابل کی حد تک رہیں گے اور جنوب میں جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ ایسی صورت حال ہے جس میں صدر بش کے سیاسی حامیوں میں عالمی سطح پر بڑی کمی واقع ہو رہی ہے اور غالباً طالبان نے شروع میں اسی چیز کو بھانپ لیا تھا کہ اگر ہم برطانیہ کو یہاں سے بھگا دیں تو بش سیاسی طور پر بالکل تنہا ہو جائے گا اور ان کی سیاسی حکمت عملی یہ بہترین نتیجہ نکلا ہے کہ سیاسی طور پر بہترین نتائج سامنے آ رہے ہیں جس کا سبب طالبان کی حکمت عملی اور برطانیہ اور امریکی کی غلطی پر ہے اب صرف دو مہینے کا دورانیہ ہے جسے جنگی زبان میں ''کمپیئنگ سیزن'' یعنی جنگ کا موسم کہا جاتا ہے دو ماہ بعد یہ موسم ختم ہو جائے گا۔ جس کے بعد اتحادی افواج کو اپنی حکمت عملی میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ اگر وہ یہ تبدیلی نہیں لائیں گے تو اس کے نتائج ان کے حق میں نہیں نکلیں گے۔ ایسے میں شمالی وزیرستان کا معاہدہ پائلٹ پروجیکٹ ہے لیکن افغانستان کے مزاحمت کار امریکہ اور نیٹو فورسز کے افغانستان سے مکمل انخلا سے کم کوئی معاہدہ قبول نہیں کریں گے۔ شمالی وزیرستان سے فوج کو نکلنا پڑا تھا اور افغانستان سے بھی فوج کو نکلنا پڑے گا۔ افغانستان اور پاکستان کے سرحد پر مشترکہ گشت کا فیصلہ بالکل غلط ہے۔ یہ تو نہ قابل عمل ہے نہ ہی یہ مناسب فیصلہ ہوگا۔

......❁......

# مسئلہ افغانستان کیسے حل ہوسکتا ہے؟

طالبان نے کابل پر قبضے کے بعد اپنی حکومت کو تسلیم کرنے پر اصرار کیا لیکن ان کے مطالبے کا وزن ہر ایک نے اس وقت محسوس کیا جب وہ مزار شریف تک جا پہنچے۔ حکومت پاکستان نے طالبان حکومت کو تسلیم کرلیا لیکن پوری دنیا اور عالم اسلام نے ان کی حکومت تسلیم کرنے سے پھر بھی گریز کیا...... افغانستان کی ۲۷۳ سالہ تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ دارالحکومت کابل پر کسی گروہ نے قبضہ کیا اور یہ بھی ثابت کیا کہ قبضہ عارضی نہیں لیکن اس کے باوجود دنیا اس قبضے کو تسلیم کرنے سے منکر ہے اس کے پس پردہ جو سوچ اور سازش کا فرما ہے اس سے ہر ذی شعور شخص واقف ہے اسلام دشمن طاقتیں دراصل یہ چاہتی ہیں کہ افغانستان میں جہاد کے جذبے کو بدنام کیا جائے اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کی بجائے سیکولرازم کے احیاء اور نفاذ کی راہ ہموار کی جائے۔ یہ دنیا بھر کے ان پسے ہوئے اور مظلوم لوگوں کے خلاف سازش ہے جن کا کوئی نظریہ نہیں اور جواب کسی نظریے کے سہارے بیدار ہونا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کمیونزم، سوشلزم اور سرمایہ داری کے کڑوے پھل چکھ لیے ہیں ان نظاموں میں انہیں نجات کی روشنی نہیں دکھائی دی۔ اب اسلام ہی ان کے سامنے مینارہ نور ہے لیکن جسے خطے میں بھی اسلام کی اٹھان ہوتی ہے وہاں لوگوں کے خلاف بین الاقوامی سطح پر پروپیگنڈہ مہم کا آغاز ہوجاتا ہے۔ یہی کچھ آج افغانستان کے بارے میں ہورہا ہے۔ جہاد کے خوبصورت چہرے کو مسخ کرکے پیش کیا جارہا ہے۔

## قیام امن............طالبان کا اصل جوہر

طالبان نے مسند اقتدار سنبھالتے ہی جو اقدامات کیے ان کی تحسین کے ساتھ ساتھ ان پر اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے۔ اندرون ملک اور خارجی سطح پر ان کی پالیسیوں پر مثبت تنقید بھی کی جاسکتی ہے۔ تعمیری تنقید انقلاب کی سمت درست رکھنے اور انقلاب کی نشوونما کے لیے ضروری ہے لیکن ہمیں یہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ طالبان کا رویہ ''جیو اور جینے دو'' پر مبنی رہا ہے اپنے زیر کنٹرول علاقے میں امن لانے کے علاوہ یہ بھی ان کی خوبی ہے کہ افغانستان کا وہ حصہ جو پاکستان سے متصل ہے اور جس پر طالبان کا قبضہ ہے تقریباً اڑھائی ہزار کلومیٹر طویل ہے اتنی طویل سرحد پر امن وامان ہے۔ آج تک ہمیں طالبان کے رویے سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

اسی طرح ایران کے ساتھ افغانستان کی ۹ سو کلومیٹر طویل سرحد ہے جہاں طالبان کی حکومت ہے۔ سرحد کے دونوں اطراف سنی العقیدہ مسلمان بستے ہیں لیکن طالبان کے کسی فعل نے ایران کو زچ نہیں کیا۔ اس طرح طالبان کے افغانستان کی طویل سرحد ترکمانستان سے بھی ملتی ہے لیکن آج تک ترکمانوں کی طرف سے بھی

کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی، اگر کسی کو اس خطے میں طالبان کے خیالی خطرے نے پریشان کر رکھا ہے وہ اسلام کریموف ہے وہ پریشان ہیں کہیں طالبان اس کے ملک پر چڑھ نہ دوڑیں۔ حالانکہ طالبان کی تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں نہ کسی ملک میں عدم استحکام کی سازش کرتے ہیں۔ دوسری طرف ازبکستان کی طرف سے افغانستان میں باقاعدہ دخل اندازی ہو رہی ہے۔ ایران کی طرف سے بھی در اندازی کے شواہد ہیں تاجکستان کی طرف سے بھی افغانستان کے معاملات میں مداخلت کی بازگشت سنائی دے رہی ہے اس کے باوجود طالبان کا صبر و برداشت کا جذبہ لائق تحسین ہے۔

## طالبان کے لیے درست رویہ

اور نہ کسی نے نظام اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظام کی بات کی ہے۔ ان دو نکات پر ہر افغانی متفق ہے صرف جنگ بندی پر اتفاق نہیں اس لیے اگر مرکزیت اور نظام شریعت پر قوم میں فکری اتحاد کو عملی اتحاد کی شکل دے دی جائے تو پھر باہمی جنگ کا جواز باقی نہیں رہتا۔ طالبان نے مرکزیت قائم کر کے اور کابل کو اپنا دارالحکومت بنانے کے بعد یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ ہم نفاذ شریعت چاہتے ہیں اس پس منظر میں طالبان مخالف قوتوں کو کس طرح یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ طالبان کے ساتھ جنگ کریں۔ یہ جہاد نہیں ہے لیکن جہاں ہم اس حقیقت کے قائل ہیں کہ طالبان کے خلاف جنگ نہیں ہونی چاہیے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ طالبان بھی اپنے رویے پر نظر ثانی کریں۔

افغان جہاد کے طویل دور میں مجھے مجاہدین کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے کئی مجاہدین رہنماؤں سے میرے ذاتی تعلقات ہیں۔ حکمت یار اور پروفیسر برہان الدین ربانی وغیرہ سے میرے برادرانہ مراسم ہیں اس کے باوجود میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ طالبان نے جب دو تہائی افغانستان پر قبضہ کر لیا تو اسے تسلیم کیا جانا ضروری تھا لیکن طالبان نے اب تک ہر ایک کو نفی کرنے کا جو رویہ اپنایا ہوا ہے میری رائے میں وہ بھی درست نہیں۔ پرانے مجاہدین کو وہ اپنے ہمراہ رکھنے پر معترض ہیں۔ اسلامی دنیا جو کر رہی ہے وہ بھی ان کے نزدیک قابل اعتراض ہے، یہ رویہ درست نہیں۔ یہ میں طالبان کے مخالفین سے اپنی دوستی کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں کہ ذاتی دوستی سے پہلے میں پورے افغانستان کا دوست ہوں۔ میں سمجھتا ہوں جو چیز افغانستان کے حق میں ہے وہ پاکستان کے حق میں ہے۔ مانا کہ مجاہدین کی قیادت نے بہت سی خرابیاں پیدا کیں ...... انہوں نے جہاد کو بدنام کیا ...... افغانوں کی آزمائش کی گھڑی کو طویل تر کر دیا ...... ان کی باہمی کشمکش اقتدار نے جہاد کے ثمرات کو ضائع کر دیا لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کی قربانیوں کو یکسر فراموش کر دیا جائے۔ افغانیوں کی حالت زار دیکھ کر ہمارا دل بھی کڑھتا ہے ان کے امتحان کی سیاہ رات ختم نہیں ہو رہی ہے۔ افغان مہاجرین کے ساتھ ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا کسی افغان کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں عزت و احترام کے جذبات امڈ آتے تھے آج اسی افغان کو ہیروئن فروش اور حشیش بیچنے والا کہہ کر رسوا کیا جا رہا ہے۔ کل تک جو مغرب کے چہیتے تھے آج وہ ان کے لیے قابل نفرت بن گئے ہیں۔ مغرب کا ہمیشہ سے طرز عمل رہا ہے کہ اسلام کو وہ اپنے لیے خطرہ سمجھتے رہے ہیں

لیکن ہمیں بھی اپنے رویے اور عمل پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے طالبان کی قیادت کی بصیرت امتحان ہے کہ وہ ان غلطیوں کو نہ دہرائیں جو ان سے پہلے کی مجاہد قیادت سے سرزد ہوئیں۔ طالبان کو ان کے ساتھ بات کرنے کو گناہ سمجھنا درست نہیں۔ طالبان سمجھتے ہیں کہ پرانی مجاہد قیادت سے بات چیت سے مسئلہ حل نہیں ہوگا تو بے شک نہ کریں لیکن انکار نہ کریں۔ بہتری کے امکانات کو یکسر مسترد نہ کر دیں سولہ لاکھ افراد کی قربانی دے کر افغانستان نے آزادی کی صبح دیکھی ہے دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس کے اتنے افراد شہید ہوئے ہوں یہ ایک عظیم قوم کی قربانی ہے۔ بلاشبہ اس کی قیادت نے اس کے ساتھ گھناؤنا مذاق کیا لیکن قیادت کی غلطیوں کی سزا دوسرے لوگوں کو کیوں دی جائے۔ آپ کے سامنے نفاذ شریعت کا عظیم الشان کام ہے اس میں دوسروں سے کٹ کر رہ جانا یا دوسروں کو کاٹ دینا مناسب نہیں ہوگا بے شک آپ غلطیوں کرنے والوں کو دعوت نہ دیں دوسری صف کے لوگوں کو ہی مذاکرات اور معاہدے طے کرنے کی دعوت دیں۔ وہ بھی افغان ہیں اور آپ کے بھائی ہیں۔ آپ ان سے بات چیت کر سکتے ہیں۔

افغانستان کی تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ کوئی گروپ ہمیشہ کے لیے افغانستان پر حکومت نہیں کر سکتا ہمیشہ مل جل کر حکومت کی گئی ہے۔ اس وقت بھی باہمی جنگ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انتشار باقی رہے تاکہ بالآخر اسے سیکولر بنا کر تقسیم کر دیا جائے۔ ہمیں اس سازش کا ادراک کرنا چاہیے۔ جنگ جاری رکھنے کی بجائے باہم مل بیٹھ کر حل نکالا جائے۔ مختلف افغان گروہ ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ افغان معاشرہ مختلف زبانوں اور قبیلوں کا امتزاج ہے۔ آج تک اس پر باہر سے کوئی مرضی مسلط نہیں کی جا سکی۔ جب بھی ایسی کوشش کی گئی (تقسیم افغانستان کسی بھی حال میں قبول نہیں کیا جائے گا۔)

☆ نظام شریعت کا نفاذ کیا جائے۔
☆ سودی نظام کا خاتمہ کرنے کا اعلان کیا جائے۔
☆ معیشت کی آزادی کی ضمانت ہوگی۔
☆ اسلامی فلاحی معاشرے کے قیام کو یقینی بنایا جائے گا۔
☆ دفاع و جہاد کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے گا۔
☆ شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

یہ سات آٹھ نکاتی یا اس سے ملتے جلتے نکات پر میثاق اتفاق رائے سے طے کیا جا سکتا ہے یہ طے کرنے کے بعد اعلان کر دیا جائے کہ جو چاہے آ کر دستخط کر دے، اس کے بعد وہ ہمارا بھائی اور دوست ہوگا۔ جو اس سے الگ ہوتا ہے وہ قوم سے خارج ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ مختلف شخصیات پر دشنام طرازی کریں اس معاہدے کو بنیاد بنا کر تمام افغانوں کو یکجا کر لیں۔ اس معاہدے پر افغانوں کی صف اول کی قیادت اکٹھی نہیں ہوتی تو دوسرے اور تیسرے نمبر کے قائدین کو دعوت دی جا سکتی ہے لیکن جس شخص نے بھی جہاد میں جان و مال سے حصہ لیا ہے اسے ایک موقع ضرور ملنا چاہیے۔

## وسیع البنیاد............ایک بے بنیاد مطالبہ

افغانستان کے مسئلے پر آج وسیع البنیاد حکومت کے قیام کا بڑا چرچا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ افغانوں کی بے مثل جدو جہد اور قربانیوں کے ساتھ مذاق ہے۔ اس وقت وسیع البنیاد حکومت کی بات امریکہ کر رہا ہے یا پھر پاکستان۔ سوال یہ ہے کہ کیا سولہ لاکھ انسانوں کی جانیں اس لیے قربان کی گئی تھیں کہ مسلمان، کیمونسٹ اور سیکولر سب مل کر حکومت بنائیں؟ یہ جنگ تو دین کی خاطر لڑی گئی تھی۔ پوری افغان قوم اس مقصد کے بارے میں واضح اور یکساں موقف رکھتے ہیں یقین جانیے میں نے ایک نو سالہ بچے سے پوچھا تھا......تم کیوں لڑ رہے ہو......؟ تو اس نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر کہا...... دین کی خاطر۔ افغانستان سے اگر اسلام کے نفاذ کو نکال دیں تو ساری بات ہی غلط ہو جاتی ہے۔ کیمونسٹوں اور اسلام دشمنوں کو حکومت میں شامل کرنے کا مطالبہ افغانستان کی مکمل تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

وسیع البنیاد حکومت کا شیطانی اور بے بنیاد شوشہ امریکہ نے اس لیے چھوڑا ہے کہ افغانستان میں کبھی امن قائم نہ ہو سکے۔ ہم وسیع البنیاد حکومت تو دیکھ چکے ہیں کہ جس میں حکمت یار بھی تھے اور ربانی بھی، مولوی محمدی بھی، مجددی بھی اور دوسری سب پارٹیاں بھی ...... دوستم بھی اور کیمونسٹ دور کے جرنیل بھی ...... اب وہی تجربہ دہرانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت اور نفاذ شریعت پر افغانوں کو متحد ہونے سے روکا جائے۔ ان میں اقتدار کی رسہ کشی جاری رہے تا کہ تقسیم افغانستان کی راہ ہموار ہو سکے۔

اس میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ طالبان نے افغانستان کو صاف قیادت دی، مرکزیت فراہم کی اور امن دیا۔ لیکن تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جب تک مل بیٹھ کر معاملات طے نہ کیے جائیں امن دیر پا ثابت نہیں ہوتا۔ فوجی حل پائیدار نہیں ہوتا۔ مستقل حل مذاکرات کی میز پر بیٹھنے سے نکلتا ہے۔ مکہ کی آویزش کا آخری حل صلح حدیبیہ کی شکل میں سامنے آیا اور ریاست مدینہ کا قیام میثاق مدینہ سے ممکن ہوا۔

## نفاذ اسلام اتحاد ہی سے ممکن ہے۔

افغانستان کے معاملات جس طرح چل رہے ہیں ہمیشہ اس طرح نہیں رہیں گے۔ یہ ایک تباہ حال ملک کی تعمیر نو کے کام میں تاخیر قسمتی سے پاکستان کی افغان پالیسی ہمیشہ مجہول اور غیر ملکی اثرات کی حامل رہی ہے۔ ماضی میں کئی غلطیاں کی گئی ہیں کچھ لوگوں سے امتیازی برتاؤ کیا جاتا رہا ہے۔ سب سے پہلے غلطی انتقال اقتدار سے پہلے ہی معاہدہ جنیوا پر دستخط کر کے کی گئی حالانکہ ضیاء الحق صاحب اور جونیجو کے مابین طے تھا کہ عبوری حکومت کے قیام سے پہلے روس کو کوئی رعایت نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ بعد میں عبوری حکومت قائم ہوئی جسے کسی نے تسلیم نہ کیا۔ اس کے بعد پشاور معاہدہ ہوا، مگر پاکستان نے اس پر عمل درآمد یا پیش رفت میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ یہ اسی غلط پالیسی کا تسلسل تھا کہ ہم بھی امریکہ کی ہاں میں ملاتے ہوئے وسیع البنیاد حکومت کی گردان کرتے رہے اور آج بھی یہی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ اس وسیع البنیاد کے نام پر عبدالمالک سے معاہدہ کرا دیا گیا اس سے طالبان کو مزید پریشانی کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایران کو طالبان سے اپنے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ امریکہ کی پوری کوشش ہے کہ ایران اور طالبان کی دشمنی میں مزید اضافہ ہو۔ طالبان نے ایران کو سوائے تلخ وتند بیانات کے کسی پریشانی سے دو چار نہیں کیا۔ تاہم ایران طالبان کے مخالفین کو سپورٹ کرتا ہے اس وجہ سے یہ اس سے شاکی نظر آتے ہیں۔ ایران کو چاہیے کہ طالبان سے مذاکرات کا کوئی راستہ تلاش کرلے۔

افغانستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں یہ ایک کورے کاغذ کی طرح ہے کہ یہاں پر اسلام پر فکری اتحاد پہلے سے موجود ہے جب کہ پاکستان میں ہم یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ قرآن وسنت ہمارا سپریم لاء ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم آج بھی انگریزی قانون کے مطابق ملک چلا رہے ہیں۔ افغانستان پر اللہ کا فضل ہے کہ وہاں شریعت کا نفاذ عملی طور پر ہمیشہ سے ہے۔ سودی معیشت کی لعنت وہاں نہیں تجارت آزادی سے جاری ہے۔ آج وہاں کسی قسم کے انفراسٹرکچر کا نام تک نہیں۔ لہٰذا افغانستان کورے کاغذ کی طرح ہے اس پر آپ جو چاہیں لکھ دیں...... آج اللہ تعالیٰ نے کورا کاغذ افغانوں کے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ اس کے اوپر وہ چاہیں تو اللہ کے دین، رسول اللہ کی شریعت امت کے درمیان اخوت واتحاد اور محبت و بھائی چارے کی عبارت لکھ دیں اور چاہیں تو اسے خون سے آلودہ کردیں۔

تاریخ اپنا فیصلہ تو دے چکی ہے اگر جنگ جاری ہے تو آئندہ پانچ سات برس میں افغانستان کا شاخسانہ پیش آسکتا ہے اس مکمل بربادی سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر چند چیزوں پر اتفاق کرلیا جائے۔

۱۔ جنگ نامنظور...... ہر اس شخص کو صلح میں شامل کیا جاسکتا ہے جو قومی معاہدے پر چارٹر پر متفق ہے۔

۲۔ تقسیم افغانستان کا کوئی فارمولا ہمیں قبول نہیں۔

۳۔ کسی غیر ملکی طاقت یا پوری دنیا کے دباؤ کے باوجود بھی سیکولرازم کو افغانستان میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

ان چیزوں کو بنیاد بنالیا جائے تو انشاءاللہ افغانستان کے مسئلے کا پائیدار اور دیرپا حل نکل آئے گا۔

# مسئلہ افغانستان ماضی حال اور مستقبل

افغان مسئلے کو صرف فوجی حوالے اور نقطہ نظر سے سمجھنا آسان نہیں۔ بلاشبہ اس کے پس منظر میں طویل عسکری جدوجہد بھی ہے لیکن ہمیں صحیح ادراک حاصل کرنے کے لیے اس کی نظریاتی، معاشرتی، معاشی اور عمرانی پہلو کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ جن کا موجود صورت حال سے گہرا تعلق ہے۔ وہ نظریاتی جدوجہد جس کے نتیجے میں سوویت یونین کو شکست فاش ہوگئی۔ اپنی ایک مستقل اور قابل رشک تاریخ رکھتی ہے۔ حالات کی گرد پڑنے سے اس تاریخ کی تابندگی متاثر نہیں ہوسکتی۔ ماضی کے واقعاتی اور حال و مستقبل کے محاکماتی تجزیے کے ساتھ اس تاریخ کو سامنے لانا اس مرحلے پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

1965ء کو ہم افغانستان کی جدید تاریخ کا ایک اہم سال قرار دے سکتے ہیں۔ یہ وہ سال ہے کہ جب ظاہر شاہ نے روس کے دباؤ میں آکر افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی کے وجود کو تسلیم کرلیا۔ اور دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح اسے بھی کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اس سے پہلے افغانستان میں برطانوی ہند کے سامراجی اثرات زائل ہونے کے ساتھ ساتھ روسی اثر ونفوذ بڑھتا جارہا تھا جس کی الگ تاریخ ہے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ادھر کیمونسٹ الحاق کے کلچر نے کابل میں قدم جمائے، ادھر کابل کے طلبہ خصوصا یونیورسٹی میں اسلامی تحریک نے جنم لیا۔ یہ تحریک ان جوانوں نے شروع کی تھی جن کو پاکستان کی جماعت اسلامی یا عالم عرب کی اخوان تحریک سے انسپائریشن ملی تھی۔ اس تحریک کا نام نوجوانان اسلام (زوانا مسلمان) رکھا گیا۔ بعد میں یہ بوجوہ یہ گروہوں میں بٹ گئے۔ لیکن ان کا جذبہ محرکہ وہی رہا جو اخوان اور دوسری اسلامی تحریکوں کا تھا۔ اس لیے ان کو ''اخوانی'' کہا جانے لگا۔ آگے چل کر اس تحریک میں شامل لوگ حزب اسلامی، جمعیت اسلامی اور اتحاد اسلامی وغیرہ میں بٹ گئے۔ یہ روائتی مولویوں کی ڈگر سے ہٹ کر تھے بلکہ دراصل یہ عالمی احیائے اسلام کی تحریک کا حصہ بنے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روایتی مولوی اور پیر بھی اس مرحلے اس تحریک سے متاثر ہوئے اور آگے چل کر انہوں نے افغانستان کے جہاد میں ایک کردار بھی ادا کیا۔ لیکن اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے وہ نہ تو اسلامی تحریک میں جذب ہوسکے اور نہ ہی اسے اپنے اندر سمو سکے۔

ظاہر شاہ نے روس کے اثر کو قبول کرکے دراصل افغانستان کے اسلامی مزاج کے خلاف فیصلہ کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں نظریاتی تصادم نے جنم لیا۔ اور آگے چل کر اسی کے نتیجے میں سردار داؤد کو برسر اقتدار آنے کا موقع ملا۔ ظاہر شاہ سے کہا گیا کہ وہ اسلامی تحریک کو سختی سے کچل دے۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا داؤد نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ظاہر شاہ کو تخت و اقتدار سے معزول کردیا۔ اور بحیثیت صدر ریاست کی باگ دوڑ

سنبھالی۔ اس نے آغاز ہی اسلامی تحریک کے نوجوانوں کے خلاف سخت اقدام کیے لیکن آگے چل کر افغانستان کو روس کے اثرات سے نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔ دوسرے ممالک سے روابط بڑھانے کے اقدامات کیے جن میں مغربی ممالک کے علاوہ پاکستان اور ایران شامل تھے روس داؤد کے عزائم سے خبردار ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں 27 اپریل 1978ء نور محمد ترکی ثور انقلاب کے ساتھ برسر اقتدار آ گیا۔

## تحریک جہاد کے علمبردار

اسلامی تحریک سے تعلق رکھنے والے نوجوان اساتذہ اور طلبہ جن میں حکمت یار، احمد شاہ مسعود اور پروفیسر ربانی وغیرہ شامل تھے، داؤد کے برسر اقتدار آتے ہی پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں پر نہایت مشکل حالات میں انہوں نے تحریک اسلامی کا کام جاری رکھا۔ وہ اپنے ملک کو روسی اثر و نفوذ سے نکالنے اور وہاں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اسی زمانے کا اہم واقعہ پنج شیر میں بیداری کی گروہ میں شیوخ بھی شامل تھے۔ جس کی نمائندگی صبغت اللہ مجددی کر رہے تھے۔ پیروں کی نمائندگی سید احمد گیلانی کر رہے تھے۔ اسی طرح علماء کے طبقے کی نمائندگی مولوی محمد نبی کر رہے تھے۔ یہ لوگ ظاہر شاہ اور سردار داؤد کے زمانے میں سرکاری شوریٰ کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔

اشتراکیت کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی تو اسلامی تحریک اس جدوجہد کا پہلے سے پرچم اُٹھانے والوں میں پیش پیش تھی۔ افغانستان کا روایتی مذہبی طبقہ اس میں شامل ہوا تو مجاہدین میں دو گروہ واضح طور پر نظر آنے لگے۔ یہ باہم مل کر کام کرنے کے دعویٰ کے باوجود اپنے مزاج کے اعتبار سے باہم متصادم نہ سہی ایک دوسرے سے الگ ضرور تھے۔ آگے چل کر مغربی ذرائع ابلاغ نے ان میں سے ایک بنیاد پرست یا Fundamentalist اور دوسرے کو لبرل یا اعتدال پسند کہہ کر پکارا مگر حقیقت اس کے برعکس تھی کہ ایک گروہ میں انقلابی فکر رکھنے والے نوجوان اور علمائے دین تھے جنہوں نے جدید اسلامی مفکرین اور تحریکوں سے اکتساب فیض کیا تھا۔ جو پان اسلازم کے علمبردار تھے جو ایک عرصے تک افغانستان کی سرزمین پر اعلائے کلمتہ الحق کی جدوجہد کر رہے تھے اور دوسری طرف شاہ پسند مولوی اور پیر تھے جو اسلام کا نہایت محدود اور قدیم تصور رکھتے تھے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ مغرب نے انہی کو "لبرل" کہا جو الیکشن کے سخت مخالف عورتوں کی تعلیم کے دشمن تھے۔ آج کے طالبان (اسی طرز فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں۔) جو عورتوں کو بھی شٹل کاک برقعے میں بند کر کے رکھنے اور عورتوں کے تعلیمی اداروں کو تالے لگانے کے داعی اور الیکشن کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔

افغانستان کے جہاد کے دوران جن سات تنظیموں کو پاکستان میں اور بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا، ان میں سے چار جدید اسلامی جہادی تحریکوں کی نمائندگی کرتی تھی اور تین گروہ روائتی اسلام کے داعی تھے۔ اول ذکر چار میں جمعیت اسلامی، حزب اسلامی (حکمت یار)، حزب اسلامی (خالص) اور اتحاد اسلامی دراصل ایک ہی جماعت کی چار شاخیں تھیں۔ جبکہ دوسری طرف تین میں صرف مولوی محمد نبی محمدی کی جماعت ایسی تھی جس کی افغان معاشرے کے قدیم تعلیمی نظام میں گہرے اثرات تھے۔ جس کے رفتہ رفتہ نظریاتی بعد اور فکری مغائرت

میں اضافہ ہونے لگا۔ ہمیں اس زمانے میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔ مسلسل مجالس اور اجتماعات کر کے ان کے اختلافات دور کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اتحاد کے لیے ہماری اور بعض دوسرے اداروں اور اصحاب کی کوششیں بار بار کسی عارضی اتحاد کی شکل اختیار کرتی رہیں لیکن کوئی کوشش بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس لیے کہ تقسیم کی بنیادیں بہت گہری تھیں۔ سب سے پہلے تو جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کی تقسیم عمل میں آئی جو بہت بدقسمتی کی بات تھی حالانکہ جب انہوں نے یک جا کام شروع کیا تھا تو ان کے درمیان کوئی جھگڑا نہ تھا۔ انہوں نے اپنے کاز کے لیے زبردست قربانیاں پیش کیں۔ حزب اسلامی کی بنیاد جن دس نوجوانوں نے رکھی تھی جنہوں نے پختونستان چوک میں قرآن پاک کی بے حرمتی پر قسم کھائی تھی کہ اس کا بدلہ لیں گے، ان میں نو نوجوان شہید ہو گئے صرف دسواں یعنی حکمت یار زندہ ہے۔

پروفیسر ربانی اور سیاف نے بھی اور دوسرے نوجوانوں نے بھی اس تحریک کے لیے زبردست کام کیا تھا۔ بڑی قربانیاں دیں تھیں۔ ان کے اکثر اختلافات اس دور کے تھے جب 1973ء میں یہ پاکستان آئے۔ تب ان میں سے اکثر اٹھارہ سے بیس سال کی عمر کے نوجوان تھے۔ یہ ایسے غیور لوگ ہے تھے کہ بے یقینی کی کیفیت میں بھی کبھی اپنی قومی آزادی اور خودمختاری کا احساس نہیں بھلاتے تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ جب قافلہ بڑھتا اور پھیلتا ہوا ایک زبردست قوت بن گیا اور ان ہی کی قربانیوں سے اٹھی ہوئی تحریک جب ایک انقلاب آفریں عسکری طاقت بن گئی تو وہ ٹکڑوں میں بٹ گئے۔

## اختلافات کی بنیاد کیسے پڑی؟

حرکت انقلاب اسلامی بنائی گئی...... یہ جماعت بظاہر ایک طرف تھی نہ دوسری طرف یعنی بین بین تھی بہرحال اسے قوت مل گئی اور وہ علماء کی بڑی پارٹی بن کر ابھری۔

اس طرح حزب اسلامی میں بھی کشمکش نے جنم لیا۔ مولوی یونس خالص نے حکمت یار سے الگ ہو کر حزب اسلامی کا دوسرا دھڑا قائم کر لیا۔ بعد میں اتحاد کی ہی کوشش کے نتیجے میں خانہ کعبہ کے اندر قسمیں کھائی گئیں۔ باہر نکل نئی پارٹی اتحاد اسلامی کے نام سے تشکیل دی گئی۔ تمام جماعتوں کو اس میں ضم کر دیا گیا۔ عبدالرب رسول سیاف اس کے قائد بنائے گئے لیکن اس مرحلے پر ہم دیکھتے ہیں لبرل گروپ یا Royalist میں تو کوئی کشمکش پیدا نہ ہوئی، مگر تحریکی عناصر میں کشمکش مزید بڑھ گئی۔ اس میں شخصیات کی ذاتی اختلافات کے ساتھ ساتھ ان کے بے تحاشہ فنڈز کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جو عرب دنیا سے مختلف پارٹیوں کو ملا کرتے تھے۔

## روس کی کامیاب حکمت عملی

روس جو مجاہدین کا بڑا واضح دشمن تھا۔ اپنے اصل دشمن یعنی اسلامی تحریک کے لوگوں کو آپس میں لڑانے میں کامیاب رہا۔ جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی جو ایک ہی سکے کے دو رخ تھے ان کو آپس میں جدا جدا کرنے میں روس نے اہم کردار ادا کیا۔ مغربی طاقتوں خصوصاً امریکہ کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ یہ دونوں مضبوط ترین جماعتیں ایک دوسرے سے اتحاد قائم نہ کر سکیں۔ جمعیت اسلامی کے احمد شاہ مسعود نے پروفیسر ربانی کو نظر انداز

کر کے شوریٰ نظار بنائی، جو شمال کے مخصوص نسلی گروہوں پر مشتمل تھی۔ حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کے ذاتی اختلافات نے بھی جمعیت اور حزب کے درمیان صلح کی صورت نہ پیدا ہونے دی رفتہ رفتہ شوریٰ نظار کی طاقت جمعیت کے سربراہ پر حاوی ہوگئی۔ آج اگر وہ اس سے نکلنا چاہیں تو بھی ان کے لیے آسان نہیں رہا۔

روس نے اسلام کا پرچم اٹھانے اور کلمہ واحد پر متحد ہونے والے بھائیوں کو نہایت کامیابی سے قوموں کے چکر میں پھنسا دیا۔ یہ اس کا کامیاب حربہ تھا۔ نورزئی، تاجک، پختون اور اسماعیلی جیسے ناموں سے الگ الگ ملیشیاء قائم کرلی گئیں۔ اسی طرح سلطان علی کشمند نے شیعہ ملیشیاء قائم کرلی۔ اس طرح نظریاتی کشمکش کے بعد لسانی تصادم کا بیج بھی تحریک آزادی کی قوتوں کے اندر ڈال دیا گیا۔ وہ لوگ جو نظریاتی سوچ رکھتے تھے وہ تو قومیتوں کے مفادات سے بالاتر ہوکر کام کرتے رہے لیکن جن کا مطمع نظر صرف روس کو افغانستان سے نکالنا تھا وہ اس دل فریب نعرے کا شکار ہوگئے۔

افغانستان کو روس پس منظر میں دیکھیں تو آپ طالبان کو آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ یہ ہمارے روائتی علماء کا وہی گروہ ہے، جس کی نمائندگی کل تک مولوی محمد نبی محمدی کرتے رہے۔ افغان جہاد کے پورے عرصے میں یہ مدارس و مکاتب طلبہ کو ان ہی قدیم روایات کے تحت تعلیم دیتے رہے اگرچہ حکمت یار اور سیاف نے روائتی انداز سے ہٹ کر اکادمیاں اور تعلیمی ادارے قائم کیے لیکن ان محدود اقدامات سے روایت توڑنا آسان نہیں تھا۔

روس کی جنگی حکمت عملی کی کامیابی یہ تھی کہ اس نے شمال اور جنوب کے مجاہدین کو آپس میں قریب نہ ہونے دیا۔ خصوصاً شوریٰ نظار جو شمال کی جہادی قوتوں پر مشتمل تھی۔ آگے چل کر کمیونسٹوں کے خلاف پختون خطے میں لڑی جانیوالی فیصلہ کن جنگ میں غیر جانبدار ہوگئی۔ احمد شاہ مسعود نے اپنی آخری زبردست جنگ 1984ء میں لڑی۔ اس کے بعد روس نے اس کے سامنے جھک کر اس سے معاہدہ کرلیا۔ روس کو اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اس نے پنج شیر کے سخت جانوں کے ہاتھوں مستقل مزاحمت سے خود کو بچالیا۔ شوریٰ نظار صرف فارسی دانوں کی جماعت تھی بہت زور لگایا تھا اور کہا تھا کہ یہ پانچ سو افراد پر مشتمل بڑی اور نمائندہ شوریٰ ہے اس کے ذریعے تمام طاقتور گروہ کنٹرول کرلیے گئے ہیں۔ اس کو دنیا میں بھی عزت و وقار صرف اس صورت میں ملے گا جب پاکستان اسے قبول کرلے گا۔ لیکن میری ایک نہ سنی گئی۔ ہم ایک ایسی نمائندہ حکومت سے مستقبل کے لیے معاہدے کرسکتے تھے۔ اس مرحلے پر اگر اس شوریٰ کے ہاتھ مضبوط ہوتے تو موجودہ طوائف الملوکی کو پنپنے کا موقع نہ ملا ہوتا۔

## مغرب کا نیا ایجنڈا

روس کے جانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ پسند Royalist طبقہ بری طرح فلاپ ہوگیا۔ اب ان کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں رہا۔ اب مستقبل کے لیے ایجنڈا اسلامی تحریک کے مختلف گروہوں یعنی ''اخوانیوں'' کے پاس تھا۔ شاہ پرستوں کے پاس طاقت بچی تھی نہ پروگرام تھا۔ پاکستان نے اس مرحلے پر ہی بے عملی اور بدعملی دکھائی ہوتی تو اسلامی تحریک کے ان عناصر جن کو پاکستان سے دوستی نظریہ پاکستان کی بنا پر تھی۔ یک جا کرکے ایک مضبوط اور اسلامی افغان حکومت قائم کی جاسکتی تھی۔ یا کم از کم اس کی بنیاد رکھی جاسکتی تھی۔

لیکن پاکستان کی حکومتیں بیرونی اشارے پر دو بڑی قوتوں جمعیت اور حزب کی لڑائی کا تماشا دیکھتی رہی۔ اس مرحلے پر امریکہ اور برطانیہ نے روائتی شاہ پرستوں کی پیٹھ ٹھونکی کہ بادشاہت کی بحالی کے لیے کام کریں۔ جمعیت (احمد شاہ مسعود) اور حزب اسلامی کے درمیان مسلسل تصادم کا باقی رہنا مغرب اور شاہ پرستوں کے مفاد میں تھا۔ افغانستان اپنی زبردست عسکری طاقت سے محروم ہو رہا تھا۔ اس کے بعد حکمت یار کو ختم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ حکمت یار کو افغانستان کے منظر سے ہٹانے کے بعد اب وہ ربانی کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں حزب اسلامی کی شوریٰ کے اسی فیصد لوگ آج بھی پروفیسر ربانی کے ساتھ اتحاد کے حق میں ہیں۔

دو قومی دشمنوں سے باری باری نمٹنے کے بعد اب مغربی طاقتوں اور افغانستان میں ان طفیلیوں کا پروگرام یہ ہے کہ کابل کے تخت پر کسی بھی ''شاہ پسند'' کو لا بٹھایا جائے۔ اس لیے کہ کوئی بادشاہ ہی مغرب کی امیدوں پر پورا اتر سکتا ہے۔ اسی کے ذریعے اسلامی تحریکوں کو کچلا جا سکتا ہے۔ اور اس کی مدد سے ہی خطے میں حقیقی اسلامی حکومت اور نظام کو آنے سے روکا جا سکتا ہے...... وہ تخت کابل تک اسی صورت میں پہنچا جا سکتا ہے کہ افغان روایت کے مطابق جرگہ بلایا جائے جو صرف رئیس جمہور بلا سکتا ہے۔ آج یہ عہدہ ربانی کے پاس ہے۔ ظاہر بات ہے وہ لویہ جرگہ نہیں بلائیں گے...... مجددی صاحب جرگے کا اجلاس بلا سکتے ہیں لیکن انہیں صرف دو مہینے کی عبوری حکومت ملی ہے، جس میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ حال ہی میں محمود مستری نے احمد شاہ مسعود سے سلطان محمود غازی یا سابق شاہ کے کسی قریبی رشتہ دار کو لانے کی بات کی تو مغربی طاقتوں کی بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ اس پر مسعود نے ان سے کہا...... لے'' آؤ وہ ہمارے مہمان ہوں گے لیکن ظاہر بات ہے لوئی جرگہ تو احمد شاہ مسعود بھی نہیں بلا سکتے۔ اب لبرل اور شاہ پسند طاقتوں کے ذریعے لوئی جرگہ بلوانے کی واحد صورت یہ ہے کہ کابل سے اخوانی قوتوں کا صفایا کر دیا جائے۔ اس لیے طالبان کو تقویت دی جا رہی ہے۔ طالبان کی بیس قندھار ہے اور قندھار شاہ پرستوں کا گڑھ ہے۔ لالائی، گل آغا، پولزئی، محمد عمر اخون زادہ، اور دوسرے اہم لیڈر اور کمانڈر زیادہ تر درانی (شاہی خاندان) کے لوگ ہیں۔ یہ تخت کابل پر کسی بھی بادشاہ کو لا بٹھانے کی حمایت کریں گے۔ موجودہ صورت حال میں مغرب اور ان کی پروردہ شاہ پسندوں کے لیے اپنے پروگرام پر عملدرآمد کرنا ممکن نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس طالبان کی صورت میں قوت نافذہ موجود ہے۔

اپنے گزشتہ دورہ افغانستان میں مجھے ایسے خطرات کا اندازہ ہو گیا تھا اور میں نے احمد شاہ مسعود اور حکمت یار دونوں سے کہہ دیا تھا صاف ظاہر ہے کہ انہیں ربانی اور مسعود سے پہلے حکمت یار کو ٹھکانے لگانے کا کام سونپا گیا لیکن بعد میں طالبان بے صبرے ہو گئے افغانوں کی روائتی خصوصیت امریکہ کے پروگرام پر حاوی آ گئی۔ افغان کسی کے قابو میں آنے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ انہوں نے چہار آسیاب سے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور بری طرح مار کر پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ اس مرحلے پر طالبان ایک مرتبہ پھر کابل کے دروازے پر ہیں۔ وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ احمد شاہ مسعود کے دفاعی نظام کو روندنا اتنا آسان ہوگا۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ وہ مذاکرات کا راستہ اختیار کریں ملک کو مزید مصائب سے دوچار ہونے سے بچانے کے لیے جہادی قوتیں باہمی

رقابتوں کو ترک کر کے پوری قوم کو ایک فارمولہ دیں نئے فارمولے میں طالبان کو بھی شامل کریں۔ دوستم کو بھی لے آئیں اس مرحلے پر پاکستان کی افغان پالیسی کو کسی طرح کامیاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر یہ دوستم کی حمایت کر رہے ہیں (اس لیے کہ امریکہ بھی ایسا کر رہا ہے) آج اگر دوستم ربانی سے اتحاد کر لے جس کا پورا امکان ہے اور دوستم وفاداریاں بدلنے میں ماہر ہے تو اس وقت پاکستان کی پوزیشن کیا ہو گی؟

## پاکستان کی افغان پالیسی

پاکستان کی کمزور پالیسی نے ہی ربانی حکومت کو دہلی کی حکومت کا سہارا لینے پر آمادہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کابل اور دہلی پرانے کمیونسٹ اور بیوروکریٹ اپنے رشتوں کی تجدید کر رہے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ بھی اتنا سنگین نہیں ہوا نہ اس کی غیر ضروری تشہیر کرنی چاہیے۔ افغانستان کے عوام کی ننانوے فیصد آبادی ہندوستان کے خلاف ہے۔ ہمیں اپنے روابط صرف مجاہدین سے بڑھانے چاہیں۔ اس طرح افغانوں کی غلط فہمیاں دور ہونگی۔ ہمارے تعلقات میں عدم توازن بھی دور ہوگا۔ یہ بہت غلط بات تھی کہ نواز شریف دور میں ہم نے حکمت یار کے مقابلے میں پروفیسر کو زیادہ اہمیت دی۔ اس طرح کشمکش کو بڑھانا ہمارے مفاد میں نہیں تھا۔ اب ہماری ترجیحات مجاہدین کے بجائے دوسرے لوگ ہیں۔ دراصل ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت ہو۔

میرے خیال میں ہمیں روس اور امریکہ کی پروردہ حکومتوں سے افغان مسئلے کے حل کی زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہیے۔ عالمی اسلامی تحریکیں اس مرحلے پر بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔؟ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی کوششوں سے جو عبوری حکومت قائم ہو وہ بعد میں ان کے ہاتھ میں رہے۔ ربانی صاحب کا اب زیادہ دیر کابل میں رہنا ان کے بھی مفاد میں نہیں۔ اس طرح کی حکومت کسی غیر تحریکی طاقت کے قبضے میں چلی جائے گی۔ جس کا نقصان افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان اور اسلامی دنیا کو ہوگا۔ اس مرحلے پر میری تجویز یہ ہے کہ حکمت یار اور ربانی آپس میں اتحاد کریں۔ دوستم کو دونوں اپنے لیے ایک ناگزیر طاقت جان کر قابل قبول بنائیں اور طالبان کو مذاکرات کی میز پر ساتھ بٹھا کر تصادم سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

کابل میں پاکستانی سفارتخانے میں ہونے والے افسوسناک واقعے کے ردعمل میں پاکستان کو اپنا غصہ بے چارے مہاجرین پر نہیں نکالنا چاہیے۔ تاہم اگر حکومت کابل میں کمیونسٹوں کی شکست کے بعد وہاں سے پاکستان آنے والے افغانوں کی کوئی پالیسی بنائے تو یہ بہتر ہوگا کیونکہ جو مہاجرین کی تعریف میں نہیں آتے وہ لوگ جو ہزاروں کی تعداد میں ہمارے شہروں میں پھیل گئے ہیں ان کی عورتیں فحاشی کی طرف مائل اور بیشتر مرد آزاد خیال اور دہشت گرد ہیں ان کے خلاف سخت سے سخت اقدام بھی اہل پاکستان اور افغانوں دونوں کے لیے مفید ہوگا۔

یہ سوچ بہت پست اور سطحی ہے کہ ہم افغان پالیسی کا مطمع نظر محض سنٹرل ایشیاء کے ممالک سے تجارت اور اقتصادی مفادات تک محدود کر لیں۔ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ افغانستان تو ہمارا قدرتی حلیف ہے اور وہ

ہمارے دشمن کے خلاف ہمارا سہارا اور قوت بن سکتا۔

علامہ اقبال نے بھی کہا تھا کہ کشمیر اس وقت بیدار ہوگا جب وسط ایشیاء بیدار ہوگا۔ افغانستان تو وسط ایشیاء کا حصہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ افغانستان کو بیدار کریں اسے سونے نہ دیں بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم افغانستان، پاکستان، ایران کشمیر اور ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت بنے گا بلکہ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی بھی ہمنوائی کرے گا۔ محض اقتصادی روابط کے لیے جائز و ناجائز حربے اختیار نہ کریں۔ ہم نے افغانستان کی معیشت کو ٹرانزٹ ٹریڈ پر پابندی کے ذریعے جو زبردست نقصان پہنچانے کی کوشش کی یہ امریکہ کی پالیسی تو ہوسکتی ہے لیکن خود پاکستان کی یہ پالیسی سمجھ میں نہیں آتی۔

افغانستان کے جہاد کی کامیابی سے سوویت یونین کے پندرہ ٹکڑے ہوئے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ لوگ یہ غلط پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ افغانستان کا سارا جہاد امریکہ کی وجہ سے ہوا۔ یہ بہت بڑا جھوٹ ہے۔ امریکہ اس مسئلے میں بہت بعد میں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی مجاہدین کو دی لیکن جب ان میں جہادی روح ختم ہوئی تو وہ آپس میں تصادم کا شکار ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے...... اگر آپ جہاد کریں گے اور آپس میں متحد رہیں گے تو اللہ تم کو سرخرو کرے گا یعنی جہادی قوتوں کو یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ اتحاد کی راہ چھوڑ کر ان کی ہوا اکھڑ سکتی ہے۔ تاہم دشمن کے پروپیگنڈے سے مجاہدین اور جہادی تحریک کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اب جہاد کی قوتیں محدود نہیں ہوئیں بلکہ اس کے اثرات کشمیر، چیچنیا اور بوسینیا کی تحریکوں پر پڑے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ افغانستان میں بھی جہادی تحریک ختم نہیں ہوئی۔ جہاد کے مقاصد پورے نہیں ہوئے۔ اسلام کے لیے جہاد جاری ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک کہ اسلام دشمن اور جہاد دشمن قوتوں کا صفایا نہیں ہو جاتا۔ تاہم جہاد کا انداز بدلنا ہوگا دشمن کو پہچاننا ہوگا۔

پاکستان کا کردار آج بھی بے حد اہم ہے اب تک پاکستان کی حکومتوں نے اس میں رکاوٹیں ڈالی ہیں آخر میں ہم نے کامیابی سے گول بھی کر دیا لیکن ریفری نے وسل بجادی کہ گول نہیں ہوا۔ تو یہ ہماری ناکامی نہیں مگر اگر ہم خود ہی خواہ مخواہ ناکامی تسلیم کرلیں تو دشمن ضرور کامیاب ہوگا۔ ناکامی پاکستان کی حکومتوں کی ہے جو اس کے ثمر سمیٹ نہ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ کہ افغان بھی اس کے ثمر سمیٹ نہ سکے۔ جو ہماری ساتھی اور دوست تھے۔ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم ان کو ساتھ لے کر چلتے، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے ہاتھ کو کھینچ لیا اور امریکہ کے تابع فرمان بن کر اپنے ہاتھوں خود اپنی تباہی کرائی۔

# ایران افغان جنگ کو روکیے...... ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا

## ایران، افغانستان تنازعے

ایران اور افغانستان کے درمیان موجودہ کشیدگی کی صورت حال پوری امت کے لیے باعث تشویش ہے۔ اس تنازعے کو اس کے اصلی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے اور اس کے لیے ہمیں مشرق وسطیٰ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔

مشرق وسطیٰ ہمیشہ سے انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دنیا کی مختلف تہذیبوں اور مذاہب نے اس سرزمین میں جنم لیا اور یہ بات ہمیشہ سے تسلیم شدہ رہی ہے کہ کوئی بھی قوت اس وقت تک عالمی طور پر مسلمہ نہیں ہو سکتی جب تک مشرق وسطیٰ پر اس کی گرفت مضبوط نہیں ہو جاتی۔ سلطنت روما کی قوت وحشمت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا گیا جب تک سیزر نے شرق اوسط میں علم فتح بلند نہیں کر دیا۔ اس کے بعد بھی فاتحین کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے مشرق وسطیٰ کو اپنی کامل فتح کے لیے ضروری تصور کیا۔ اٹھارہویں صدی میں نپولین نے مشرق وسطیٰ میں قدم جمانے کے لیے مصر سے تعلقات کی پینگیں بڑھائیں اور اسی کوشش میں اسے مصر کی سرزمین پر فیصلہ کن شکست ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں جب ہٹلر نے یورپ کے ایک بڑے حصے پر اپنی فتح کے پنجے گاڑ لیے تو اس نے بھی اپنے کامیاب ترین جرنیل رومیل کو مشرق وسطیٰ پر تسلط کے لیے بھیجا۔ اس دور میں اس سرزمین نے تیل اُگلنا شروع نہیں کیا تھا، جب یہاں تیل اُبلنے لگا تو اس کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اسی زمانے میں مغربی استعمار ایک خاص سازش کے ذریعے اسرائیل کو وجود میں لایا اور اس کے تحفظ کے لیے بھی مختلف نوعیت کے اقدامات کیے گئے، تاکہ اس خطے کے مسلمانوں پر تعینات یہ ''پولیس مین'' بے خطر زندہ رہے اور ترقی کر سکے۔

مشرق وسطیٰ کے دو بازو ہیں، مشرقی بازو اور مغربی بازو۔ مغربی بازو میں مصر سے لے کر کینیا اور تنزانیہ تک اسرائیل اور امریکہ کا مکمل تسلط ہے، سوائے سوڈان کے۔ اگرچہ سوڈان وسائل اور آبادی کے لحاظ سے ایک کمزور ملک ہے لیکن اس کی دفاعی اہمیت اس لیے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ خلیج کے مغربی بازو پر آخر میں واقع ہے۔ مشرقی بازو پر امریکہ کی گرفت کبھی بھی مضبوط نہیں رہی۔ اگرچہ اس خطے میں امریکہ کے پاکستان کے ساتھ دیرینہ تعلقات رہے لیکن ان میں سرد مہری اور نقص بھی پیدا ہوتا رہا جیسے حال ہی میں ایٹمی دھماکوں کے بعد ہوا۔ لیکن ایران اور افغانستان کو امریکہ اپنے لیے ایک ایسی چابی کی حیثیت دیتا ہے جو ایک طرف پاکستان اور

ایران میں اس کی پالیسیوں کے بند قفل کھول سکتا ہے تو دوسری طرف وسط ایشیا میں اس پر خوشحالی کے دروازے وا کر سکتا ہے۔

بھارت آج تک امریکی چالوں میں نہیں آیا، یہی حال چین کا ہے۔ اس صورت حال میں امریکہ کی تمام تر توجہ کا مرکز پاکستان ہی رہ جاتا ہے، جسے کبھی دھمکیوں اور کبھی ترغیبات کے ذریعے زیر دام میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آج امریکہ کی وہ حیثیت نہیں جو دس برس قبل 1991ء میں خلیج کی جنگ کے دوران تھی۔ جب ایک عشرے کی تیاری کے بعد اور ایک مناسب ماحول پیدا کر کے اس نے عراق پر دھاوا بول دیا تھا۔ آج کی صورت حال میں امریکہ کے لیے مزید زمینوں پر قدم جمانا چنداں آسان نہیں، تاہم اس کے مفادات اس بات کا تقاضا ضرور کرتے ہیں۔ انقلاب ایران نے اس خطے میں امریکی مفادات اور اثرات پر گہری ضرب لگائی، آج امریکہ محسوس کر رہا ہے کہ ایک مرتبہ پھر ایران کے ذریعے اپنے لیے حالات سازگار بنائے جائیں، اور اس طرح کی صورت حال پیدا کی جائے جو شاہ ایران کے دور میں تھی۔ ترکی میں اگرچہ امریکی اثر و رسوخ کم نہیں ہوا اور اس کی مداخلت کی وجہ سے ہی اربکان حکومت سے بے دخل ہوئے ہیں، تاہم پھر بھی

قائم کر کے تقسیم افغانستان کی سازش کو کچل دیا ہے۔ پاکستان میں نہ صرف نفاذ اسلام کی خواہش پائی جاتی ہے بلکہ خاصی حد تک یہاں فضا بھی سازگار ہے۔ پہلی اسلامی ایٹمی طاقت بننے سے بھی اس کا وزن بڑھا ہے۔ ایران میں بھی اپنی طرز کا اسلامی انقلاب بیس برس سے امریکی عزائم کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس رکاوٹ کو دور کرنا امریکی ترجیحات میں سرفہرست ہے۔

مغرب نے ایک طویل دور تک "Divide and Rule" کی پالیسی پر کامیابی سے عمل کیا، لیکن اب انہوں نے اسے ترک کر کے "Divide and Destroy" کی پالیسی اپنائی ہے۔ انہوں نے جس بھونڈے انداز میں سوڈان اور افغانستان پر حملہ کیا اور پاکستان کی فضائی حدود کی دیدہ دلیری سے خلاف ورزی کی، اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے گھٹیا مقاصد کی تکمیل کے لیے جنگ تک جا سکتے ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کے زوال اور انقلاب ایران کے بعد سے امریکیوں کے دل میں یہ خواہش موجزن رہی ہے کہ وہ کس طرح ایران کو دوسرے کسی اسلامی ملک سے برسرِ پیکار کر سکیں۔ اس نے ایک کامیاب چال کے ذریعے آٹھ برس تک ایران کو عراق سے باہم دست و گریبان رکھا۔ اب ایران کو افغانستان کے خلاف اُٹھانے کی سازش شروع کی گئی ہے۔ خدا نخواستہ یہ مکروہ چال کامیاب ہو جاتی ہے تو اس سے ملت اسلامیہ کو ایران عراق جنگ اور خلیج پر امریکی قبضے کے لیے عراق کے خلاف لڑی جانے والی جنگ سے زیادہ نقصان ہوگا۔

ادھر افغانستان میں امریکہ نے جہاد افغانستان کی کامیابی کے بعد تسلسل سے وسیع البنیاد حکومت کی رٹ لگا رکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جہادی قوتوں پر مشتمل کوئی اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ اپنی سازش کے ذریعے وہ جہاد کو بھی بدنام کرنا چاہتا تھا اور نظام اسلام کو بھی روبہ عمل آتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ افغانستان اسلام دشمن طاقتوں کے لیے اس کے باوجود زبردست چیلنج بنا ہوا ہے کہ جنگ نے اسے تباہ کر دیا ہے۔ مگر وہ ایک کورے کاغذ کی طرح ہے جس پر مقروض ہونے کا دھبہ ہے نہ غلامی کا داغ۔ انہوں نے آج تک اغیار سے کوئی نظام

مستعار نہیں لیا اور ان کی روایات میں بھی اسلام ہی کو اولیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی وہ اسلام کے پرنور نظام کی برکات سے فیض حاصل کرنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں۔ یعنی کورے کاغذ پر ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے پردے میں امریکہ برسوں مجاہدین افغانستان کو اسلامی حکومت تشکیل دینے سے باز رکھنے کے لیے وسیع البنیاد حکومت کے قیام پر زور دیتا رہا ہے۔ دراصل وہ کمیونسٹوں اور دوسرے اسلام دشمن عناصر کی نمائندگی یقینی بنانا چاہتا تھا۔ وسیع البنیاد حکومت کا قیام ایک جدید سیاسی کلچر میں بھی مشکل ہوتا ہے، چہ جائیکہ کہ متحارب عسکری اور نظریاتی بعد کی حامل قوتوں پر مشتمل وسیع البنیاد حکومت قائم کی جائے۔

بدقسمتی سے ایران کی آواز بھی اس وسیع البنیاد حکومت کے قیام میں شامل ہوگئی۔ نہ صرف ایران، بلکہ پاکستان خود بھی طالبان حکومت کو تسلیم کرنے کے باوجود وسیع البنیاد حکومت کے راگ الاپتا رہا۔ اگر وسیع البنیاد حکومت سے وہ مفہوم لیا جائے جو عام طور پر لیا جاتا ہے یعنی ایک معاہدے کے تحت مخلوط حکومت قائم کی جائے تو ایسا ممکن نہیں، گزشتہ چودہ برس میں ایسا نہیں ہوا تو اب بھی نہیں ہو سکے گا۔ گزشتہ چودہ برس کے تجربے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک مخلوط قومی حکومت کو وجود میں لانا خام خیالی ہے لیکن اگر وسیع البنیاد حکومت سے مراد ان جہادی افراد حکومت میں شمولیت ہے جو روس کے خلاف ماضی میں برسر پیکار رہیں، تو یہ ایک قابل عمل تجویز ہے۔ اس کے لیے طالبان کو قائم بھی کیا جا سکتا ہے اور برادرانہ ماحول میں گفت وشنید بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اوپر سے کوئی حل مسلط کیا جا سکتا ہے نہ کیا جانا چاہیے۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بات پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ افغانوں کا مزاک باہر سے مسلط کردہ کسی حکومت کو قبول نہیں کرتا۔

دسمبر 1979ء میں جب سوویت یونین نے اپنی فوجیں افغانستان میں داخل کیں تو یہ بات صرف افغانستان کی آزادی سلب ہونے کا سانحہ ہی نہ تھا، اس سے پاکستان کی سلامیت کو بھی گہرے خطرات لاحق ہو گئے تھے، چنانچہ مئی 1980ء میں اسلام آباد میں بیالیس۔

۱۔ روس غیر مشروط طور پر افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلالے۔

۲۔ افغان مہاجرین کو عزت و آبرو کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کا موقع ملنا چاہیے۔

۳۔ افغانوں کو اپنے سیاسی مستقبل اور نظام کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔

۴۔ افغانستان کا اسلامی کردار اور شناخت برقرار رکھی جائے۔

بعد میں اقوام متحدہ نے جو قرار دادیں پاس کیں وہ بھی اس ایجنڈے سے مماثل تھیں، ماسوائے آخری نکتے کے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایجنڈا پاکستان کی تحریک پر ایران کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ اب اگر ایران اس کے برعکس کوئی مطالبہ کرتا ہے تو یہ افسوسناک اور اس کے گزشتہ طرز عمل کی نفی ہوگی۔ ایران کی وسیع البنیاد حکومت کا مطالبہ دراصل ایک "Dictation" ہے اور یہی ''زبردست'' خرابی پیدا کر رہی ہے۔ اسی سے ایران اور پاکستان کے درمیان بھی شکوک پیدا ہوئے۔ بلاشبہ، ایران کے بعد خدشات اور تفکرات مبنی برحق ہیں اور روس نے ان ہی خدشات کے پیش نظر شمالی اتحاد کی مدد کی ٹھانی تھی، لیکن شمالی اتحاد نے جنگ سے ہاتھ کھینچ کر ایرانی توقعات پر کاری ضرب لگا دی۔ میرے خیال میں ایرانی توقعات غلط مفروضات پر قائم کی گئی تھیں۔ شمالی اتحاد

ایک غیر فطری اتحاد تھا۔ سیاف کا حزب وحدت سے مل کر بیٹھنا اور مسعود کا دوستم کی طرف دست تعاون دراز کرنا کیسے ممکن تھا۔ اس غیر فطری اتحاد کا نتیجہ سب نے دیکھ لیا۔ اس ساری پیش رفت میں ایک اہم بات یہ ہوئی کہ طالبان کو بالعموم پذیرائی حاصل ہوئی اور خلاف توقع بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایران پاکستان کو افغانستان میں حالیہ تبدیلیوں کا مورد الزام ٹھہراتا رہا ہے۔ قطع نظر اس کے یہ الزامات کس قدر سچائی کے حامل ہیں، یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ طالبان کو افغانستان میں بے پناہ اسلحہ ہاتھ لگا اور ایک آدھ مقام کے علاوہ انہیں کہیں بھی بھرپور جنگ نہیں لڑنی پڑی۔ افغانستان میں ووٹ کے ذریعے کسی کو منتخب کرنے کا سلسلہ یا اتفاق رائے حاصل کرنے کا رواج نہیں۔ اگر طالبان کسی سے جنگ لڑے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں تو اس کا مطلب وہاں عمومی اتفاق رائے لیا جاتا ہے۔ افغان قوم نفسیات طور پر امن کی متمنی تھی، طالبان کی شکل میں انہیں امن کے پیغامبر مل گئے افغانوں کے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایران کے اپنے خدشات تھے اور یہ وہی خدشات تھے جو ابتدا میں میرے بھی تھے، لیکن میں نے صورت حال کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنی سوچ کے زاویے بدل لیے۔ میں پہلے بھی کسی مخصوص افغان گروہ کا حمایتی نہیں تھا۔ میرے پیش نظر ہمیشہ افغانستان کی مجموعی بھلائی کا تصور رہا ہے۔ میں چاہتا تھا افغانوں نے جو بے مثال قربانیاں دی ہیں اس کا انہیں ثمر ملے۔ آج بھی میں یہی چاہتا ہوں۔

ایران کو اول روز سے یہ یقین رہا ہے کہ پاکستان امریکہ کا کاسہ لیس ہے اور اس میں کافی حد تک سچائی بھی ہے۔ اس کی ایک مثال تو ہم نے چند ماہ پیشتر دیکھی جب امریکہ نے ہماری سرزمین کو بلا اجازت استعمال کیا۔ اس پر ہم نے اعتراض تک نہیں کیا، ان جارحانہ حملوں پر ایک رسمی سا احتجاج کر کے ''فرض'' پورا کر لیا، لیکن ایرانی احتجاج میں زیادہ شدت تھی۔ حقیقت یہ ہے پاکستان کی حکومتوں نے بھی اپنے طرز عمل سے اس تاثر کی تصدیق کی ہے کہ امریکہ انہیں آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ہمارے اقوال اور افعال اس کی چغلی کھاتے تھے، لیکن ایک بات باعث حیرت ہے کہ افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے مطالبے میں ایران، امریکہ اور پاکستان یک آواز تھے، یہ بات مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آسکی۔ حالانکہ امریکہ کے مقاصد مختلف رہے ہیں۔

امریکہ کی دیرینہ خواہش اور کوشش یہ رہی ہے کہ ایران، افغانستان اور پاکستان کو ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا کر دیا جائے۔ اس میں بے پناہ امریکی مفادات پوشیدہ ہیں۔ جنگ کی صورت میں یہ ممالک نڈھال ہو کر امریکہ کی جھولی میں جا گریں گے۔ اس ہو جائیں گے۔ ان حالات میں ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ یہ جنگ کسی قیمت پر نہ ہو، جس میں ہمارے لیے بہت خطرات اور بے پناہ تباہی ہے۔ جبکہ ہمارے دشمن کا فائدہ ہے۔ ایران، افغانستان اور پاکستان تینوں کو جنگ کے ان مہلک نتائج پر غور کرنا چاہیے۔

☆ اس جنگ سے اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔ شاید دوبارہ اس مقام تک پہنچنے میں انہیں زمانے لگیں۔

☆ جہادی قوتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ کشمیر، فلسطین اور چیچنیا جیسی مضبوط جہادی تحریکیں اپنی قوت و ہمت کھو دیں گی۔

☆ عالم اسلام میں شروع ہونے والے نفاذ اسلام کے تجربات ناکام ثابت ہوں گے۔

☆ پاکستان ایٹمی قوت ہونے کے باوجود دوسروں کا دست نگر بن کر رہ جائے گا۔ استعماری طاقتیں ہماری جوہری طاقت ہم سے چھین لینے میں آسانی سے کامیاب ہو جائیں گے۔

☆ پوری ملت اسلامیہ فرقہ واریت کی آگ میں جلنے لگے گی۔ امت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔ پھر ہماری زندگیوں میں شاید ہی اس المیے سے محفوظ رہنے کی نوبت آئے۔ لہٰذا اس خطرے کا تدارک بہت ضروری ہے۔

میرے خیال میں جہاں یہ بہت بڑا خطرہ ہے وہاں یہ ایک بہت بڑا موقع بھی ہے۔ اس لیے کہ عالم اسلام کے اندر آج تک جتنے تنازعات ہوئے ہیں، ان میں اقوام متحدہ اور امریکہ گھس آتے تھے اور وہ اپنی مرضی کے حل مسلط کرتے تھے۔ ملت اسلامیہ کے بارے میں ان کے عزائم کبھی بھی ہم سے پوشیدہ نہیں رہے، انہوں نے ہمیشہ ہی ان مسائل کو الجھایا ہے۔ اب یہ موقع ہے کہ ہم کسی غیر اسلامی قوت کو شامل کیے بغیر خود ہی اس مسئلے کا حل تلاش کریں۔ حکومت پاکستان اور امریکہ نے ''چھ جمع دو'' کا فارمولا اختیار کیا ہے، یعنی افغانستان اور ایران کے چھ ہمسایہ ممالک کے علاوہ روس اور امریکہ مذاکرات میں شامل ہوں گے۔ مذاکرات کے لیے امریکی شہر نیویارک چنا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مسئلے سے امریکہ کا کیا تعلق ہے یا روس جو اس مسئلے کی پیدائش کا مجرم ہے اس کس حیثیت میں مذاکرات میں شامل کیا جا رہا ہے؟ روس کی سرحدیں تو دریائے آمو سے 7300 کلو میٹر شمال میں واقع ہیں، یہ ہمیں ہرگز قبول نہیں ہونا چاہیے۔

اسلامی ممالک کے مسائل کے حوالے اقوام متحدہ کا کردار کبھی بھی عالم اسلام کی امنگوں کا ترجمان نہیں رہا۔ خلیج کی جنگ میں ہم نے جنگ روکنے کی ایک کوشش کی، اگرچہ وہ کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن ضروری نہیں کہ آج وہ ناکام ہوا۔ 1981ء میں او آئی سی نے ''امہ امن کمیشن'' کے نام سے ایک وفد تشکیل دیا، اس کے سربراہ صوالیہ کے سربراہ سید برے تھے۔

سینگال کے شوشکاری اور پاکستان کے صدر ضیاء الحق اس کے رکن تھے۔ اس وفد کو ایران عراق جنگ ختم کرنے کا ٹاسک دیا گیا۔ یہ عراقی قیادت اور بعد ازاں امام خمینی کے پاس بھی گیا۔ امام خمینی نے کہا، اگر سارے اسلامی ممالک واقعی اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے خواہش مند ہیں، تو وہ اس کے لیے وہی راہ اپنائیں جو قرآن میں ہے۔ قرآن کہتا ہے تمہارے دو فریقوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو پہلے تم جارح کا تعین کرو، پھر مظلوم و مجروح کا ساتھ دو۔ انہوں نے کہا، اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو پھر یہ امہ امن کمیشن نہیں کچھ اور ہے۔ بدقسمتی سے یہ کمیشن جارح کا تعین کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ آج تینوں ممالک، جن میں سے دو میں اسلامی نظام نافذ ہو چکا ہے اور ایک میں شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا جا رہا ہے...... کیا یہ تین آپس میں مل بیٹھ کر شرعی اصولوں کے مطابق یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتے؟

ایران آج خود اسلامی سربراہی تنظیم کا چیئرمین ہے۔ اس کے لیے یہ ایک تاریخ موقع ہے کہ وہ ایک وفد تشکیل دے جو اس تنازعے تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب وفد تشکیل دینے میں دیرنہ

کریں۔ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ اس کی ضرورت ہی نہ رہے۔

بلاشبہ ایرانی سفارت کاروں کا قتل بڑا افسوسناک واقعہ ہے لیکن یہ مسئلہ بہت پہلے پیدا ہوا تھا۔ اختلافات کو اچھالنے کے بجائے یہ مشترکات پر اتفاق کرنے کا موقع ہے اور تینوں ممالک کی قدرے مشترک یہ ہے کہ یہ پورا خطہ اسلام کی سرزمین ہے، تینوں امریکہ کے زیر عتاب ہیں، اس لیے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے ہمیں قرآن کی روشنی میں اپنے تنازعات کا فیصلہ کرنے کی راہ ڈھونڈنی چاہیے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔

''اے لوگ! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیرو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔'' (النساء۔۵۹)

طالبان کو بھی چاہیے کہ حالات پر مسلسل غور و فکر کریں۔ انہیں آج تو مستقبل میں تعمیر و ترقی کے لیے ضرور مشکلات درپیش آئیں گی۔ اگر انہوں نے اجماع امت کو اہمیت نہیں دی تو خسارے میں رہیں گے۔ شریعت اسلامی ان حالات میں اتفاق پیدا کرنے کا حکم دیتی ہے۔ افغانوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد امن کا پھل چکھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بین الاقوامی ریشہ دوانیاں ان سے ایک مرتبہ پھر نعمت امن کو چھین لیں۔ طالبان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ قوم کے باقی ماندہ لوگ انہیں تسلیم کرلیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ باوقار انداز میں انہیں اپنے اندر سمولیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں حکومت میں شامل کریں اور ان کے قائدین کو مناصب و مراتب سے نوازیں، لیکن افغان قوم صرف مدرسوں کے طلبہ پر مشتمل نہیں اس کے اندر اور بھی شعبہ ہائے زندگی کے لاکھوں افراد موجود ہیں۔ اگرچہ طالبان نے مختلف نسلوں اور علاقوں کے لوگوں کو پہلے بھی نمائندگی دے رکھی ہے، لیکن میرے خیال میں یہ ناکافی ہے۔ اس کے لیے انہیں اپنے دلوں میں کافی وسعت پیدا کرنی ہوگی۔ وہ مجاہدین جن سے ان کا آج اختلاف ہے، روس کے خلاف جہاد میں ان کے ساتھ صف آراء رہے ہیں، ان کو اپنی صفوں میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کی قربانیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ان میں بڑے بڑے پائے کے عالم و فاضل بھی شامل ہیں جن کو اسلام سے محبت اور لگاؤ شک و شبے سے بالاتر ہے۔ یہ افغان حکومت کے لیے ایک سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

حکومت پاکستان کو بھی نہایت اخلاص کے ساتھ ایران کے ساتھ معاملات طے کرنے ہوں گے، مسئلے کو اگر قرآن و سنت کی روشنی میں حل کریں گے تو اس میں اخلاص اور اصول دونوں شامل ہوں گے۔

اسی میں ہمارا، ایران کا اور افغانستان کا بھلا ہے۔ ایران کو سوچنا چاہیے کہ اگرچہ وہ فضائی یا زمینی حملہ کرکے افغانستان کو بے پناہ نقصان سے دوچار کر سکتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ افغانستان کے کسی علاقے پر قبضہ کرلے۔ افغانوں کے پاس تو کوئی کام اور روزگار نہیں، وہ تو دوبارہ لڑنا شروع کر دیں گے اور دنیا کے مختلف ممالک مختلف انداز میں ان کی مدد بھی شروع کر دیں گے۔ افغانوں کی تاریخ اور روایات ایسی ہیں کہ بیرونی جارحیت کی صورت میں وہ یک جان ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایران کو اس سے بہت بہت نقصان پہنچے گا۔ اب یہ

بات واضح ہوگئی ہے کہ طالبان امریکی ایجنٹ نہیں۔

سلمان رشدی کے معاملے میں ایران کا رویہ تبدیل ہوا ہے اور برطانیہ نے وہاں اپنا سفارت خانہ دوبارہ کھول دیا ہے۔ ایران میں قدامت پسندوں اور لبرل ازم کے حامیوں کے درمیان بھی محاذ آرائی کا آغاز ہوگیا ہے، ایسی صورت میں اگر یہ شبہ بھی ہوگیا کہ ایران امریکہ کے ساتھ کھڑا ہے تو اس سے انقلاب ایران کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ ملت اسلامیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس انقلاب کو تباہ نہ ہونے کہ افغانستان میں داخل ہونا بہت آسان ہے لیکن نکلنا بہت محال، یہ سبق ہرگز نہیں بھولنا چاہیے۔

کہ عشق آساں نمود اول
ولے افتاد مشکل ہا

# ڈیورنڈ لائن اور امریکی عزائم

(منگل 28 جمادی الاول، 29,1424 جولائی 2003ء)

ڈیورنڈ لائن پاکستان اور افغانستان کے درمیان پھیلا ہوا 2240 کلومیٹر طویل سرحدی خط ہے لیکن اسے معروف معنوں میں سرحد سمجھنا درست نہیں، اس لیے کہ یہ لائن ہر دو ممالک کے دو جغرافیائی اقتدار اعلیٰ کا تعین تو کرتی ہے لیکن یہ دو برادر اسلامی قوموں کے درمیان تقسیم کے بجائے ملاپ کی علامت ہے۔اس لحاظ سے ڈیورنڈ لائن کا تشخص پاک بھارت سرحد کے بالکل برعکس ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جسے سمجھنے کے لیے مسلم قومیت کے اس بنیادی تصور سے آشنا ہونا ضروری ہے جس کی طرف علامہ محمد اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے۔

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اگر شہاب الدین غوری، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی ہمارے ہیرو ہیں، خواجہ معین چشتی، حضرت علی ہجویری اور دوسری بے شمار روحانی شخصیات سے ہم اکتساب فیض کرتے ہیں اور فردوسی، جامی، رومی اور جمال الدین افغانی سے فکری تحریک حاصل کرتے ہیں تو اس کی بنیادی یہی ناقابل شکست ملی رشتہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ خلافت اور سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریکیں برصغیر سے اُٹھیں، لیکن ان کا رخ افغانستان کی جانب ہوگیا۔ اسی ناقابل شکست رشتے کا اظہار مصور پاکستان علامہ محمد اقبال کی پوری شاعری میں ہوتا ہے۔ افغانستان سے ان کی دل بستگی ان کی ساری شاعری پر محیط ہے۔ انہوں نے ملت افغانیہ کو ایشیا کا دل قرار دیا، لیکن روس کے خلاف جہاد کے بعد افغانستان صرف ایشیا کا نہیں، پوری ملت اسلامیہ کا دل بن گیا ہے۔ آج اگر پاکستان اسلام کا قلعہ ہے تو افغانستان ملت بیضا کا قلب ہے جس سے حریت وغیرت ملی اور جذبہ جہاد کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔ پاکستان اور افغانستان میں اسی ناقابل شکست وحدت ملی کا اظہار اس وقت ہوا جب افغانستان پر روسی قبضے کی افتاد پڑی۔ افغانوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پاکستان کا رُخ کیا اور پوری آبادی کا چھٹا حصہ پاکستان کا مہمان بن گیا۔ پاک افغان لازوال ملی، ثقافتی، تاریخی اور ایمانی رشتہ قائداعظمؒ کی بصیرت پر عیاں تھا۔

1948ء کے اوئل میں قائداعظم طورخم تشریف لے گئے تو بارڈر پر لگی زنجیر کو عبور کرکے افغان سنتری سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرمایا...... ''دو اسلامی ملکوں کے درمیان یہ انگریز کی بنائی ہوئی مصنوعی رکاوٹیں ہیں جن کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔'' فوج کے لیے اپنی اولین احکامات میں قائداعظم نے ڈیورنڈ لائن پر پھیلی ہوئی درجنوں چھاؤنیوں کو خالی کردینے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ آپریشن Curzon کے نام سے انتہائی سرعت کے ساتھ جنوب

میں شیلا باغ (درۂ خوجک) سے لے کر شمالی میں درۂ ارندو کے سامنے دروش (چترال) تک کتنے ہی گیریژن غیر آباد ہو گئے۔ لورالائی، ژوب، وانا، رزمک اور میر علی وغیرہ کی مشہور چھاؤنیاں خالی ہوئیں اور آج تک خالی پڑی ہیں۔ قائد کی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے، ان کی عطا کردہ افغان پالیسی اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ اونچ نیچ کے باوجود گزشتہ 56 برس سے افغانستان کی طرف سے ہماری سلامتی کو کبھی کوئی خطرہ پیش نہیں ہوا۔ اگرچہ ظاہر شاہ کے دور میں بھارت کی شہ پر پختونستان کا شوشہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا لیکن بھارت کے خلاف تین جنگوں میں ہمیں اپنی مغربی سرحد ایک بھی باقاعدہ فوجی کھڑا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

1893ء کی بات ہے جب سر ڈیورنڈ نے دوسری افغان جنگ کے بعد طے پانے والے ''معاہدہ گندمک'' کے تحت اس خطے کے نقشے پر ڈیورنڈ لائن کی باقاعدہ لکیر کھینچی۔ اس کے پیچھے برطانوی استعمار کے اپنے عزائم تھے۔ وہ شمال کی طرف سے بڑھتے ہوئے روس اور برطانوی ہندوستان کے درمیان ایک بفر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ یورپی طاقتوں کا ایک کھیل تھا جسے کپلنگ نے ''گریٹ گیم'' کا نام دیا تھا لیکن برطانیہ نے بھی اس بات کا خیال رکھا کہ ڈیورنڈ لائن نرم (soft) سرحد رہے اور دونوں طرف آباد قبائل مہمند، شنوار، مینگل، وزیر، سلیمان خیل، کاکڑ اور نورزئی وغیرہ سب کو آنے جانے کی کھلی آزادی رہے۔ نرم سرحد کا یہ تصور صدیوں سے اس علاقے میں رائج رہا ہے، جبکہ ترقی یافتہ دنیا کے ممالک پر اس کی افادیت اب ظاہر ہو رہی ہے، جس کی ایک مثال یورپی یونین کے ممالک ہیں جو ویزے کی پابندیاں ختم کر رہے ہیں مگر حیرانی کی بات ہے کہ ہم اس تاریخی کامیاب پالیسی سے ہٹ کر ایک جانب بھارت کے ساتھ اپنی سرحد کو نرم کرنے کے لیے بے تاب ہیں، تو دوسری طرف ڈیورنڈ لائن کو سخت کرنے اور نقل وحرکت کی آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں۔ آخر اس تبدیلی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ نہ تو پاکستان کی ضرورت ہے، نہ افغانوں، بلکہ اس کے پس پردہ امریکہ کے استعماری عزائم ہیں، جن کی نشاندہی چنداں دشوار نہیں۔

پاکستان اور افغانستان تین بڑی تہذیبوں اور نہایت اہم جغرافیائی اکائیوں کے سنگم پر واقع ہیں۔ چین، ہندوستان اور عالم اسلام اس خطے میں باہم ملتے ہیں، اسی طرح بے پناہ افرادی قوت، قدرتی وسائل اور توانائی کے خزانوں کا یہاں ملاپ ہوتا ہے۔ روس کی شکست وریخت کے بعد قوی امکان پیدا ہو گیا تھا کہ جوہری صلاحیت سے مسلح پاکستان، تیل اور گیس کے ذخائر تحریکوں کے امتزاج سے یہاں ترقی اور قوت کا ایک نیا اور تاریخی شاہکار وجود میں آجائے گا، جیسا کہ ٹائن بی نے کہا تھا "History is nothing but geography on wheels" (متحرک جغرافیہ ہی تاریخ ساز ہوتا ہے) روس کی پسپائی کے بعد علاقہ کا جغرافیہ متحرک ہو چکا ہے اور پاکستان کا مرکزی کردار کسی پر چھپا نہیں۔ آج یہی روشنی طبع بلا بن کر ہم پر ٹوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ دنیا کی واحد استعماری قوت اس ابھرتی ہوئی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی جب کہ اس کے اہداف میں چین کے پھیلاؤ کو محدود کرنا، اس خطے کے قدرتی وسائل پر قبضہ کرنا اور اسلامی تحریکوں کو کچلنا شامل تھا۔ یہ مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ جب پاسکتان کو وسط ایشیا اور مشرق وسطی سے کاٹ کر دہلی کے مدار میں دھکیل دیا جائے۔ ڈیورنڈ لائن کی حیثیت کی تبدیلی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ امریکہ کی خواہش یہ ہے کہ وہ بارڈر جسے برطانیہ

100 برس تک بند نہ کرسکا اور روسی جیسی سپر پاور ڈیڑھ دہائی تک جسے سیل کرنے کا ناکام کوشش کرتی رہی، اسے بند کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ڈال دی جائے۔ کچھ عرصہ پہلے ہماری وزارت داخلہ نے ڈیورنڈ لائن کو سیل کرنے کی ذمہ داری اُٹھائی اور اس سلسلے میں امریکہ سے باقاعدہ معاہدہ کیا جس کی قوم کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی گئی۔ اس خدمت کے عوض محض 73 ملین ڈالر کی مدد عطا ہوئی، یہ نہایت ہی سستا سودا تھا۔ اس کے جو دیرپا مضر اثرات مرتب ہوں گے وہ تو اپنی جگہ، لیکن اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ حکومت کابل کو ایک بہانہ مل گیا کہ وہ افغان قوم کے جذبات کو پاکستان کے خلاف بھڑکا کر اپنی گرتی ہوئی ساکھ بحالی کرنے کی کوشش کرے۔ بھارت بھی اسی صورت حال سے پورا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ ہم اس کے نتائج سانحہ کوئٹہ اور پاک افغان سرحد پر جھڑپوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں، اس پالیسی کے تباہ کن اثرات سے بچنے کے لیے ہمارے پالیسی سازوں پر لازم ہے کہ وہ حقیقت حال کا دانشمندی سے جائزہ لیں اور مندرجہ ذیل اقدامات کے بارے میں سوچیں۔

1- ڈیورنڈ لائن کو م "ہارڈ بارڈر" بنانے کی پالیسی فوراً واپس لے کر اپنی افواج کو سرحدی علاقوں سے نکال لیں۔ اگر امریکہ کو یہ بارڈر سیل کرنے کی ضرورت ہے تو وہ افغانستان میں بیٹھ کر یہ کام آسانی سے کر سکتا ہے، وہاں پر اس کا قبضہ ہے اور وہ ایک سپر طاقت ہے۔ اپنی مہم جوئی کی قیمت اسے خود ادا کرنی چاہیے۔ اگر وہ شمالی اتحاد سے بیزار ہو چکا ہے تو اس کا علاج بھی خود تلاش کرے۔

2- 22 دسمبر 2002ء کو افغانستان کے چھ ہمسایہ ممالک پاکستان، ایران، ترکمانستان، تاجکستان، ازبکستان اور چین نے کابل میں عدم مداخلت کا جو معاہدہ کیا وہ ایک اچھی تحریک تھی لیکن تاریخ کی گواہی ہے کہ ان ممالک نے کبھی افغانستان پر حملہ نہیں کیا، جبکہ برطانیہ نے تین بار اور روس و امریکہ نے ایک ایک مرتبہ افغانستان پر حملہ اور قبضہ کیا ہے۔ اسی طرح بھارت بھی خفیہ اور علانیہ طور پر ہمیشہ مداخلت کرنے والوں کی پشت پر رہا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جن کا ہمیشہ دوستانہ کردار رہا، انہیں تو افغانستان کے معاملات سے بیدخل کر دیا گیا اور جو حملہ آور تھے ان پر عدم مداخلت عائد نہیں کی گئی۔ اس معاہدے میں ان سب ممالک کو شامل کرنا ناگزیر ہے جو مداخلت کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔

3- افغانستان پر عائد کی گئی تجارتی پابندیاں غیر دانشمندانہ ہیں، یہ سرحدی صدیوں سے کھلی چلی آ رہی ہے، اسے کھلا ہی رہنا چاہیے۔ دوسرے ممالک بالخصوص بھارت اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے افغانستان کی منڈی پر قبضہ کر رہا ہے۔ تعمیر کے 60 فیصد ٹھیکے پہلے ہی بھارت کو عنایت کیے جا چکے ہیں۔

4- افغانستان میں امریکی مداخلت کے بعد وہاں پاکستان کا دوستانہ کردار یکسر ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ افغانستان کے متحارب دھڑے آج بھی پاکستان کی طرف سے مصالحت کاری کے منتظر ہیں۔ ہم کسی ایک دھڑے کا ساتھ دینے کے بجائے پوری افغان ملت کی فلاح اور امن کے لیے خدمات پیش کر سکتے ہیں۔ یہ تاریخی کردار صرف پاکستان اور پاکستانی ہی ادا کر سکتے ہیں جس سے ہمیں ہرگز دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔

5- امریکہ نے نیٹو ممالک کو افغانستان میں لا بٹھایا ہے۔ اس طرح نیٹو کی سرحد عملاً چین کے ساتھ آ ملی

ہے۔ مستقبل میں یہ صورتحال پریشانی پیدا کرے گی۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ امریکہ اور اس کے نیٹو اتحادی یہاں سے کوچ کریں اور پاکستانی اڈوں پر قبضے کو بھی ختم کریں۔ اس کام کے لیے جرأت مندانہ سفارتکاری کی ضرورت ہے۔ امریکہ موجودگی میں افغانستان کو امن نصیب نہ ہوگا، افغان قوم کی تاریخی نفسیات اور غیر ملی ہمہ وقت امریکی قبضے سے ٹکراتی رہے گی اور وہاں کی اضطرابی کیفیت پورے خطے کے لیے وبال جان بنی رہے گی۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان پیدا ہونے والی تلخیاں وقتی اور عارضی ہیں۔ اس بات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمان پر جب بھی کوئی افتاد پڑی افغانوں نے بڑھ کر ان کی امداد کی اور افغانستان پر کوئی سخت وقت آیا، تو اسلامی پاکستان نے فیاضی اور اخوب کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ یہ دونوں قومیں کبھی ایک دوسرے کی دشمن نہیں ہوسکتیں، دشمن کی چال ناکام بنادیں تو پھر یک جان دو قالب بن جائیں گی۔ ذو برابر ممالک کے درمیان یہ رشتہ ابدی سچائی ہے اور یہ رشتہ انشاء اللہ قائم و دائم رہے گا۔ آج امریکہ کتنا ہی طاقت ور نظر آئے لیکن بالآخر اسے یہاں سے جانا ہوگا۔ ہماری مستقبل پر نظر ہونی چاہیے۔ امریکہ ہمیں اپنے دوستوں ...... افغانستان، ایران، عربوں اور چین سے کاٹ کر تخت دہلی کے تابع کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں ہر صورت اس سازش کو ناکام بنانا ہوگا۔ ویسے بھی امریکہ کے ساتھ ہماری مصنوعی دوستی کا رشتہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ وقت آگیا ہے کہ پاکستان اپنے مفادات کا دلیرانہ دفاع کرے، قوم اس کے لیے تیار ہے، حکمران خود کو آمادہ کریں۔

# افغانستان۔کل، آج اور کل

احمد شاہ ابدالی نے آٹھارہویں صدی کے نصف اول میں موجودہ افغانستان کی داغ بیل ڈالی۔احمد شاہ ملتان میں پیدا ہوئے، گیارہ برس کی عمر میں افغانستان چلے گئے، وہاں ایک صوبے میں حکومت قائم کر کے چار برس تک ملتان ہی سے حکمران کی۔ اس کے بعد مختلف قبائل اور علماء کو مجتمع کر کے ایک سیاسی نظام وضع کیا، جو افغانستان کی صورت گری پر منتج ہوا۔ جس طرح بعد میں انیسویں صدی کے دوران آل شیخ اور خاندان سعود نے ایک غیر رسمی، معاہدے پر اکٹھے ہو کر سعودی حکومت کی بنیاد رکھی۔

اجتماعی معاملات یعنی سیاسی، دفاعی، معاشی اور چھوٹے بڑے پیش آمدہ امور کو طے کرنے کے لیے ''جرگہ سسٹم'' کو بنیاد بنایا، جہاں پر نمائندہ افراد مل کر ان امور کو طے کرتے۔ اگرچہ یہ نمائندہ ادارہ معروف معنوں میں جمہوری انداز سے تشکیل نہیں پاتا رہا، تاہم قبائلی نظام کے تسلسل میں یہ ایک حد تک نمائندگی پر ہی مبنی ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ اس صورت گری سے پہلے افغانستان کا یہ علاقہ خراساں کے نام سے مشہور تھا۔ تاریخ کے اوراق میں یہ ہمیشہ ہی بڑا اہم اور حساس خطہ رہا۔ ''تاریخ جغرافیے کے پہیوں پر سفر کرتی ہے'' اس مقولے پر غور کیا جائے تو افغانستان کا علاقہ اس کی بڑی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ علاقہ سیاسی مستقبل کے تعین اور تاریخ سازی کے حوالے سے تصادموں کا خطہ (Crush zone) رہا ہے۔ اس علاقے کا سب سے پرانا شہر ہرات کوہ ہندوکش کے اختتام پر واقع ہے جو اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ حملہ آوروں کا بڑا اہم پڑاؤ اور گزرگاہ رہا ہے۔ اس سے آگے مشہد شہر ہے۔ جہاں سے ایک ایسا پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جسے عبور کرنا حملہ آوروں کے لیے کبھی آسان نہیں رہا۔ اسی لیے ''ہرات مشہد گیٹ'' تہذیبوں کے ملاپ کے لیے اہم رہا ہے۔ یہ تو افغانستان کا ایک حربی، جنگی اور سیاسی پہلو تھا۔

علمی سطح پر دیکھیں تو صحاح ستہ کی ترتیب و تدوین کا عظیم ترین کام بھی اسی خطے میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اسلامی تہذیب میں اجتہاد و فقہ اور سائنس و منطق کے گہرہائے تاب دار یہیں پیدا ہوئے۔ برصغیر جنوبی ایشیا میں رسد و ہدایت کی شمع فروزاں کرنے کے لیے صوفیا کرام اور بزرگان دین کی بڑی تعداد بھی اسی علاقے سے آتی رہی ہے۔ اور یہ نتیجہ تھا اس تعلیمی روایت کا جس کا مرکز مسجد تھی۔ یہیں سے محمود غزنوی و شہاب الدین غوری اُٹھے جنھوں نے برصغیر پاک و ہند میں مسلم اقتدار کا تاسیسی پتھر رکھا۔ الغرض برصغیر کی تاریخ کی بارآوری میں اس خطے کا کردار ایک سدا بہار سرچشمے کی طرح ہے، جس کے بہاؤ کو بیسویں صدی کی قائم شدہ سرحدیں بھی روکنے سے

عاجز ہیں۔ پروفیسر ٹائن نے افغانستان کو بجا طور پر ''تاریخ کا چوراہا'' کہا تھا۔

انیسوی صدی کے دوران تاریخ کے اس چوراہے پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے روس اور برطانوی سامراج کے درمیان کشمکش شروع ہوئی، جسے رڈیارڈ کپلنگ نے ''گریٹ گیم'' کا نام دیا۔ جہاں تک اس ''گریٹ گیم'' میں دونوں استعماری طاقتوں کے قدم نہ جمنے کی بات ہے، تو اس کا ایک بنیادی سبب اس خطہ ارضی کا نظامِ تعلیم تھا۔ وہی نظامِ تعلیم جس کی بنیاد روزِ نبوی ﷺ میں رکھی گئی تھی۔ اس کے بنیادی عناصر دو تھے: پہلا علمی ترقی جس کا مرکزی نکتہ دعوتِ اسلام تھا اور دوسرا جہاد...... یہی وہ اصل بنیادی وجوہ ہیں کہ اس خطے کو غلامی کی زنجیروں میں کوئی جکڑ نہ سکا۔ اگر ذہن یکسو ہو جائے تو پھر تربیت کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہ جاتی۔ یہ تربیت کردار کی ہو یا ہتھیار اُٹھانے کی تربیت، دونوں ہی بڑی آسانی سے میسر آ جاتی ہیں۔ انہی وجوہ کی بنیاد پر افغانستان میں جذبہ جہاد ہمیشہ زندہ رہا ہے۔

اس منظر سے ہٹ کر اگر گزشتہ صدیوں پر نظر دوڑائیں تو ایک جانب ہمیں اسپین (ہسپانیہ) دکھائی دیتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی عظیم پوری عرب دنیا میں صرف صلاح الدین ایوبی کا ایک ایسا دور گزرا ہے، جس دور میں روحِ جہاد موجزن تھی...... 1192ء میں آخری صلیبی جنگ لڑی گئی، اسی 1192ء میں ہمارے سلطان شہاب الدین غوری ایک مسلم سلطنت کی داغ بیل ڈال رہے تھے۔ اِدھر 1492ء میں اسپین سے مسلمانوں کے نکال دیئے جانے کے ٹھیک پانچ سو سال بعد 1992ء میں مجاہدینِ افغانستان، کابل میں داخل ہو رہے تھے۔ تاریخ کے یہ اوراق کسی حادثاتی عمل کی تصویر نہیں پیش کرتے، بلکہ ان کے درمیان ایک منطقی ربط اور گہرا سبق پوشیدہ ہے۔ اگر ہم اس سبق پر نظر رکھیں تو اپنے حال کو سنوار اور مستقبل کو محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اس سبق کا بنیادی نکتہ مدرسہ ہے۔ جو ایک زمانے میں جہادی روح کا نقیب تھا اور اب مسلمانوں کا یہی دانش کدہ اس روح کو کچلنے کا آلہ کار ہے۔ بقول اقبالؒ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

یہ بیسویں صدی کے آخری ربع کا افغانستان ہے۔

اشتراکی انقلاب (1917) کے بعد روس نے آہستہ آہستہ اپنے جو اثرات پھیلانے انہیں کے زیرِ سایہ افغانستان میں فکری تصادم اپنے فطری انجام کی طرف رواں دواں رہا۔ افغانستان، روس کی سرپرستی اور بھارت کی دوستی پر کچھ اس طرح گرم سفر رہا کہ جس کا ایک وظیفہ حیات پاکستان کو مسلسل تنگ کرنا تھا۔ افغان فرماں روا ظاہر شاہ کی بادشاہت اپنے جبر اور دقیانوسی اپروچ کے ساتھ روبہ عمل تھی، جولائی 1973ء میں ان کے عزیز سردار داؤد نے بادشاہ کا تختہ اُلٹ دیا۔

سردار داؤد نے بطور صدر افغانستان بہت جلد یہ محسوس کیا کہ ایک جانب روس اور اس کی زیرِ زمین سیاسی اشتراکی تحریک کے ہاتھوں میں نہ صرف وہ، بلکہ خود افغانستان بھی غیر محفوظ ہے۔ اس خوف کا ادراک کرتے ہوئے، داؤد نے پاکستان کے پشت پر مارے جانے والے چابک پشتونستان کے سنٹ کو لپیٹنا شروع کیا۔ سردار داؤد کی خواہش تھی کہ یہ فاؤل پلے ختم ہو، تاکہ افغانستان، روسی ریچھ کی بڑھتی ہوئی گرفت سے چھٹکارا

پانے کی صورت نکلے۔ چنانچہ اس نے پاکستان سے روابط بڑھانے شروع کیے۔ داؤد کی اس ''گستاخی'' پر روس تڑپ کر رہ گیا۔ چنانچہ اس کے خلاف کریملن میں بیٹھے ہوئے سرخ زاروں نے ایک تحریک شروع کرادی۔

جدید تعلیمی اداروں میں کابل یونیورسٹی اور پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ جہاں کے استاذہ روس سے تربیت حاصل کر کے آرہے تھے۔ اس لیے ان کی ذہنی تشکیل میں اشتراکیت ایک عقیدے (dogma) کے روپ میں جھلکتی تھی۔ دوسری جانب دینی مدارس کی روایت کا اپنا اثر تھا۔ کابل میں ایک جانب منی اسکرٹ پہنے عورتیں نظر آتیں، تو دوسری جانب برقعہ پہننے والی خواتین بھی بڑی تعداد میں دکھائی دیتیں۔ ان دونوں دھاروں نے کسی نہ کسی وقت ٹکرانا تھا اور اب وہ مقام آچکا تھا۔ اگرچہ داؤد اور کمیونسٹ تحریک اپنے سیاسی پس منظر کے حوالے سے ایک دھارے کی دو متحارب قوتیں تھیں، جو دو دھڑوں ''خلق'' اور ''پرچم'' کے نام سے معروف تھیں، اور جنہوں نے درحقیقت منظم انداز سے 1965ء کے بعد سر اُٹھانا شروع کیا تھا۔ تاہم اس کشمکش کے دوران روس نواز اشتراکی قوتوں اور اسلامی قوتوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلا تصادم کابل یونیورسٹی میں ہوا۔ جہاں پہ قرآن کریم کی تضحیک کرتے ہوئے، کمیونسٹوں نے اس کے اوراق نذر آتش کیے تھے۔ اس واقعے پر دس نوجوانوں نے قسم کھائی کہ ہم اس گستاخی کا بدلہ ضرور لیں گے۔ یہ وہ مقام تھا کہ جہاں پر، افغانستان کے اندر.......... کیا

اشتراکی لہر سے ٹکراؤ کی علم بردار اور طلبہ تحریک کے رہنماؤں نے ہجرت کر کے پشاور کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ لوگ پہلے نہایت گہرے دوست تھے، مگر جلاوطنی کا یہ زمانہ ان کے درمیان مسابقت اور بالآخر دوری کا محرک بن گیا۔ پھر یہی دوریاں روس کے خلاف جہاد (92-1978) کے دوران بھی برقرار ہیں۔ اور 1992ء میں روس کی کٹھ پتلی حکومت کے خاتمے کے بعد تو ایک افسوس ناک روپ میں سامنے آئیں بلاشبہ ان فاصلوں کو تصادم اور نفرت میں بدلنے کے لیے ایک عالمی دست شر انگیز نے فیصلہ کن کردار ادا کیا، جس کی مدد کے لیے اس دوران ہمارے حکمرانوں نے بڑا افسوسناک رول ادا کیا...... لیکن جاننا چاہیے کہ دشمن اسی وقت نقب لگاتا ہے، جب اسے کوئی راستہ دکھائی دے...... بہرحال افغانستان کے کوہ دمن اور کوچہ و بازار میں بیداری کی لہر اُبھر آئی۔ جسے جذبہ جہاد اور آزادی، قربانی اور خودداری کے علاوہ کسی دوسرے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔

اِدھر اشتراکی روس کے حکمرانوں نے افغانستان کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ سے سبق سیکھنے کے بجائے محض جدید تاریخ کو اپنا رہنما جانا۔ انہوں نے پہلے ہنگری میں آزادی کے متوالوں کو کچلا تھا اور پھر 1968ء میں چیکوسلواکیہ میں حریت کے علم برداروں کو تہ تیغ کر کے سرخ پھریرے لہرائے تھے۔ اپنے پالتوں دانش وروں کے ذریعہ دنیا بھر میں اس نظریہ کی تشہیر کی تھی: ''روس فطرت کے اعتبار سے ریچھ ہے، جو ایک مرتبہ اپنی گرفت میں لیتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں'' ......اس نظریے کی زندہ دلیل مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی ریاستیں تھیں۔

یہ 1978ء تھا، جب انہی روسی حکمرانوں نے آگے بڑھ کر افغانستان کو اپنے معانقے میں بھیجنے کے لیے پیش قدمی کی۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ میں پھیلے ہوئے قلم کاروں کی ایک فوج ان کے ہمقدم تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ انہی دنوں ایران میں امریکہ نواز شہنشاہیت (رضا شاہ پہلوی) کے خلاف امام خمینی کی قیادت میں زبردست

تحریک چل رہی تھی۔ اِدھر افغانستان میں جہادی روح کی بیداری اور ایران میں کامیاب انقلاب (فروری 1979ء) نے روسی حکمرانوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی۔

اشتراکی روس کو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ لہر، وسطی ایشیا کی محکوم مسلم ریاستوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اس لیے انہوں نے طے کیا کہ اب پس پردہ رہ کر اقدام کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر پوری قوت سے افغانستان کی گردن دبوچ لینی چاہیے۔ مگر روسی حکمران نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے تصورات کا آشیانہ ایک شاخِ نازک پر بنا رہے ہیں، جس کے تنکے انہوں نے یورپ کی خوف زدہ قوموں کی شکل میں اکٹھے کیے تھے......
اس حقیقت کا اعتراف بعد میں آنے والے ایک روسی حکمران میخائل گورباچوف نے 6 جولائی 1986ء کو اپنے ولاڈی واسٹک کے خطاب میں بہ ایں الفاظ کیا: ''افغانستان ہمارا رستا ہوا ناسور ہے، اس جنگ میں پھنس کر ہم نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔''

اب ذرا تصویر کا یہ رُخ بھی دیکھیے۔

افغانستان میں روسیہ مداخلت اور پیش قدمی کے بارے میں نہ صرف امریکہ کو، بلکہ مغربی یورپی ملکوں کو بھی پیشگی علم تھا...... 205 ڈویژن جب ماسکو کے قرب وجوار سے کوچ کر گیا، تو پہلے پہل ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس سمت گیا ہے؟ مگر کچھ ہی دنوں بعد ہمیں اس کا کیمپ دوشنبے میں دیکھے جانے کی اطلاع ملی لیکن مغرب میں پاکستان کی حلیف طاقتوں نے پاکستانی حکام کو اس نقل وحرکت سے قطعی بے خبر رکھا۔ حالانکہ اس معرکہ آرائی کا سب سے زیادہ نقصان پاکستان ہی کو پہنچنا تھا، جو پہلے روز سے روسی پیش قدمی روکنے کے منصوبے میں...... دام کر کے رہا ہے اور بڑھتے قدموں نے ''پانی پت'' کے میدان میں آ کر ہی دم لیا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا وجدان ان تجزیوں کو ماننے سے انکاری تھا۔ ہم اس تصورِ تاریخ کو ایک پامال مفروضہ قرار دیتے اور مسلم افغان مجاہد کی اس حرکی قوت پر توجہ دلاتے۔ وہ مجاہد جو جذبہ جہاد سے سرشار اور ایمانی قوت سے لیس ہے۔ جس کی رگوں میں غلامی کے لہو نے کبھی گردش نہیں کی تھی، اور جو فقرِ غیور کی متحرک تصویر ہے اور پھر یہی ہوا کہ تاریخ کا یہ روایتی نظریہ منہدم ہو کر رہ گیا۔ اشتراکی روس کا بڑھتا ہوا قدم پہلے زخمی ہوا، اور پھر اس نے واپسی کا سفر اس طرح کیا کہ ماسکو پہنچنے کے بعد وہ اشتراکی سلطنت شکست وریخت کی عبرت ناک مثال بن گئی...... تاریخ انسانی کے اس کرشمے کے مرکزی کردار: روحِ جہاد، افغان عوام تھے اور ان کے پشتی بان اہل پاکستان تھے۔ گویا کہ بظاہر ان دو ملکوں نے یک جان ہو کر تاریخ پر ان مٹ نقش چھوڑا۔

پاکستان میں مارشل لا کا نفاذ (5 جولائی 1977ء) میں ہوا تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی امداد بند تھی۔ اسی نے متصل دور میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے پاکستان پر پابندیاں لگ رہی تھیں۔ پھر جب روس کی افغانستان میں گرم آمد ہوئی تو امریکہ کو پاکستان کی ضرورت محسوس ہوئی۔

یہ مشیت ایزدی کے مطابق تھا کہ اس عہد میں پاکستان پر جنرل محمد ضیاء الحق جیسا حکمران، عنان حکومت سنبھالے ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے، جن کی سیاسی جڑیں نہیں تھیں اور کتابِ دستور کے مطابق انہیں حق حکمرانی بھی حاصل نہیں تھا لیکن کیا کیا جائے کہ ان جیسا مضبوط اعصاب کا مالک شخص اور

ایمان جذبے سے سرشار بہادر حکمران، حکمرانوں کی صف میں خال خال دکھائی دیتا ہے۔ روسیوں کی آمد پر امریکہ بہادر نے پاکستان کو چار سو ملین ڈالر کی پیشکش کی۔ تب ڈیموکریٹک پارٹی کے مسٹر جمی کارٹر صدر امریکہ تھے۔ صدر محمد ضیاء الحق نے اس امداد کو مونگ پھلی کے دانے کے مصداق قرار دیا، اور اسے حاصل کرنے کے لیے کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ دراصل خود امریکی حکمرانوں کا سانس پھولا ہوا تھا۔ یہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے، کہ پاکستان اس طوفان بلاخیر کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ بھی کرے گا۔

ایسے میں فی الواقع خراج تحسین پیش کرنا چاہیے افغانوں، پاکستانی شہریوں اور مضبوط ارادے کے مالک صدر محمد ضیاء الحق کو، جو اپنے اپنے مورچوں میں ڈٹ گئے۔ دسمبر 1979ء سے لے کر اکتوبر 1980ء تک کسی بھی مدد کے بغیر افغانوں نے لازوال تحریک جہاد جاری رکھی اور ایسی مزاحمت کی جس پر عقل و دانش آج بھی انگشت بدنداں ہیں۔ چونکہ افغانستان پر روسی حملہ دراصل پاکستان پر ہی حملے کا ہم معنی تھا، اس لیے پاکستان اور اہل پاکستان نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس دوران افغانوں کو مدد فراہم کی۔ قدیمی توڑے دار بندوقیں اور ایسا ہی فرسودہ سامان حرب انہیں پہنچایا۔ تب انہیں دینے کے لیے یہی کچھ ہمارے پاس تھا۔

اگر چہ اس کے بعد مجاہدین کی مدد کے لیی بہت سے ہاتھ آگے بڑھے، تاہم اپنی اہلیت ثابت کرنے کا وہ عرصہ سب سے نازک تھا جب افغان مجاہدین عملاً خالی ہاتھ تھے۔ مگر وہ روس کی باقاعدہ فوج موت اور آگ برساتے ٹینکوں اور گن شپ ہیلی کاپٹروں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس لیے میرے نزدیک یہ ابتدائی دس ماہ بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ سرزمین افغانستان پر ہم وطن فوج ان کے خلاف تھی اور اپنے حکمرانوں کی جان کے درپے تھے، مگر وہ جہاد کی راہ پر مال استقامت کے ساتھ گامزن تھے۔

خود ہمارے لیے ایک بڑا تکلیف دہ مسئلہ یہ تھا، کہ مختلف علاقوں، قبائل اور مذہبی مکاتب فکر رکھنے والے ان مجاہدوں اور مہاجروں کا اتحاد کیسے قائم کریں؟

کچھ لوگ یہ الزام دیتے ہیں کہ پاکستان عسکری حکام نے جان بوجھ کر افغان مجاہدین میں تقسیم در تقسیم اور گروہ بندی کا رواج دیا۔ ......... کیونکہ پاکستان کی وزارت خارجہ کی پالیسی ساز حضرات کا تصور جہاں (world view) مجاہدین اور افواج پاکستان کے تصور جہاں سے مختلف، بلکہ بالکل مختلف تھا۔ وہ قدم قدم پر مختلف راستے پر چلنے کی کوشش کرتے۔

ہم اگر اس مسئلے کی جڑ پکڑنا چاہیں تو معلوم ہوگا اس کا بیج 1980 میں بویا گیا تھا۔

18 مئی 1980ء کو جب اسلامی کانفرنس تنظیم کے وزرائے خارجہ کا اسلام آباد میں غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا۔ تب 42 ممالک اس کے رکن تھے۔ انہوں نے ایک چار نکاتی قرارداد منظور کی۔ یہ قرارداد اسلامی جمہوریہ ایران کے وزیر خارجہ صادق قطب زادہ نے پیش کی تھی۔ جس کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ روس غیر مشروط طور پر افغانستان کو خالی کر دے۔ دوسرا نکتہ یہ تھا افغان مہاجرین کو باعزت طور پر واپس جانے اور اپنی شہری زندگی کو بحال کرنے دیا جائے۔ تیسرا نکتہ تھا کہ افغانوں کو اپنی مرضی کے مطابق وہاں حکومت بنانے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اور چوتھا نکتہ یہ تھا کہ افغانستان کے اسلامی تشخص کو تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔

پہلے تین نکات کی حمایت امریکہ اور یورپ نے کی، مگر چوتھے نکتے پر آ کر وہ رُک گئے۔ اسلامی تشخص کی بنیاد جہاد تھا، جس کا ہدف افغانستان کی آزادی اور اسلامی ریاست کا قیام تھا، مگر یہ چیز امریکہ کو منظور نہ تھی۔ حکومت اور ہمارے پالیسی ساز اداروں کی غلام گردشوں میں ان کا اختلاف کھلی بحث کی شکل اختیار کر گیا، اگرچہ وہ اپنے اختلاف کو سرعام بیان نہ کرنے پر مجبور تھے۔ اس لیے امریکہ نے اس صورت حال سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اندر ہی اندر چالیں چلنا شروع کر دیں۔ نتیجتاً آخری مرحلے میں جب روس چلا گیا تو عین اس وقت امریکیوں نے افغانستان کے باب میں ہمیں بے بس کر دیا۔

17 اگست 1988ء کو صدر ضیاء الحق کا طیارہ گرا دیا گیا۔ یہاں ''گرا دیا گیا'' کا لفظ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔ اس تباہی پر ہماری تحقیقاتی رپورٹ پر واضح طور پر کہا گیا ہے: ''یہ حادثہ نہیں، بلکہ تباہ کیا گیا تھا۔'' امریکی ہم سے بار بار یہ کہلوانے کی کوشش کرتے رہے: ''اسے حادثہ ہی کہا جائے۔'' حالانکہ ہمارے پاس دستاویزی ثبوت تھے کہ یہ حادثاتی نہیں بلکہ تخریبی عمل پر مبنی المیہ ہے۔ اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ 15 اگست 1988ء تک روس کی ساٹھ فی صد فوج افغانستان سے واپس جا چکی تھی، جس کے دو روز بعد صدر محمد ضیاء الحق کا طیارہ تخریبی کاروائی کا نشانہ بنایا گیا...... یہاں یہ بھی یاد رہے کہ 15 فروری 1989ء کے طے شدہ تاریخ سے بھی ایک روز قبل روس کا آخری فوجی سرزمین افغانستان سے نکل کر دریائے آمو پار کر گیا، جو ایک روسی جرنیل تھا۔

24 فروری 1989ء کو ہم مدینۃ الحجاج، راولپنڈی میں عبوری افغان حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے، مگر ہماری اس وقت کی وزیراعظم بے نظیر صاحبہ نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ کہا گیا کہ یہ ''حکومت جب تک کابل یہ جلال آباد نہیں پہنچتی، اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔'' دراصل امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ اس عبوری حکومت کو تسلیم کیا جائے ...... انہی دونوں یاسر عرفات صاحب پاکستان تشریف لائے۔ میں نے ان سے کہا: ''اس وقت جبکہ آپ کے پاس ایک انچ زمین نہیں ہے، ہماری حکومت نے آپ کی حکومت کو تسلیم کر رکھا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ، کابل پر قابض ڈاکٹر نجیب خود مانتا ہے کہ 85 فیصد علاقے پر افغان مجاہدین کا کنٹرول ہے، مگر ان مجاہدین کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا جا رہا۔'' جواب میں یاسر عرفات مسکرا کر رہ گئے۔

پھر افغان عبوری حکومت کی تشکیل کے وقت پہلا بڑا اختلاف ایرانی حکومت نے ظاہر کیا، جس کے کہنے پر ایران میں مقیم مجاہدین و مہاجرین نے حکومت میں زیادہ حصہ لینے پر اصرار کیا۔ تب پہلی بار یہ پہلو بڑی وسعت کے ساتھ ہمارے سامنے آیا کہ ایران: مسئلہ ...................... میں کرنا چاہیے تھا، لیکن تاریخ کا وہ قیمتی لمحہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہی وہ ٹھوکر تھی کہ جس نے اس انتشار کا لاوا سلگایا، جس پر قابو پانے کی جدوجہد میں ایک پورا عشرہ گزر چکا ہے اور جس کی چنگاریاں اب تک بجھنے نہیں پائیں۔

یہ 1992ء تھا جب جنرل نجیب اللہ کی کٹھ پتلی کابل حکومت ختم ہوئی اور کابل میں مجاہدین کے داخلے کا لمحہ آیا۔

لیکن اس پورے منظر نامے کو دانستہ طور پر خراب کرنے کے لیے خود یہاں اسلام آباد سے کام شروع

ہوا۔ اب پاکستان کے وزیر اعظم محمد نواز شریف تھے۔ ان دنوں افغانستان کے مسئلے پر بات کرنے کے لیے حکومت نے مجھے کسی بھی سطح پر مشاورت میں شریک کرنے سے دانستہ طور پر پہلو بچایا۔ خیر، اپریل 1992ء میں صبغت اللہ مجددی صاحب جیسے کمزور جماعت کے سربراہ پر مشتمل دو ماہ کی عبوری حکومت بنا دی گئی۔ (مجددی صاحب خود بحیثیت انسان کمزور نہیں تھے، بلکہ ان کی کمزوری ان کے سیاسی گروپ سے منسوب تھی)۔ ساتھ ہی کہا گیا کہ ان کے بعد چار ماہ کے لیے استاد برہان الدین ربانی صدر ہوں گے، پھر فلاں اور فلاں انتظام ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ الغرض ایک نہایت پیچیدہ، نا قابل فہم، نا قابل عمل اور مضحکہ خیز سیاسی منصوبہ افغان قیادت کے سر پر تھوپ دیا گیا کہ جس سے عہدہ برآ ہونا ناممکنات میں تھا اور پھر انہیں کابل میں دھکیل دیا گیا۔

واضح رہے سابق افغان حکومت کے باقیات نیوز کابل میں موجود تھے، جن میں قابل ذکر کمیونسٹ جرنیل تھے اور ان کے ساتھ ازبک رشید دوستم کی گلم جم ملیشیا بھی تھی اور یہ کہ اس طبقے سے ہتھیار نہیں ڈلوائے گئے تھے۔ اندر حالات مجاہدین کو غیر روایتی اور نا قابل فہم سیاسی دلدل میں پھنسا دیا گیا۔ اس لیے ان کی صفوں میں فطری طور پر لامتناہی انتشار پیدا ہوا، اور نتیجتاً تصادم بھی۔ اگر چہ یہاں سے غیر سرکاری سطح پر اسے رفو کرنے کی کئی کوششیں نا کام کرنے میں ہماری حکومت کا وہ غیر دانش مندانہ اقدام بارود کا سا کام کر جاتا، جو عبوری حکومت کو تسلیم نہ کرنے اور پھر ''معاہدہ پشاور'' جیسے طفلانہ اقدام سے بہم پہنچا دیا گیا تھا۔

اس پیدا شدہ یا پیدا کردہ صورت حال سے کمیونسٹ انتظامیہ کے باقیات نے فائدہ اٹھایا اور مختلف طریقوں سے، تقریباً تمام ہی مجاہد گروپوں کو اکسانے، لڑانے اور اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے استعمال کر ڈالا۔ اگر چہ اس صورت حال کی ذمہ داری مجاہدین کی قیادت پر بھی آتی ہے، لیکن میرے نزدیک فی الواقع وہ اس کے بہت ہی تھوڑے ذمہ دار ہیں۔ پیش آمدہ حالات کے جبر کے ہاتھوں ان سے ایسا ہونا قطعی غیر فطری نہیں کہا جا سکتا۔

اور یہ اگست 1994ء کی بات ہے۔

جب ملا عمر کی سربراہی میں 15 طالبان پر مشتمل ایک چھوٹا سا گروپ بنا۔ یہ کون لوگ تھے؟ یہ وہی لوگ تھے، جو کبھی محمود غزنوی کے ساتھ آئے، کبھی شہاب الدین غوری اور احمد شاہ ابدالی کے ساتھ وارد ہوتے...... جنھوں نے مجاہدین بن کر روس سے ٹکر لی تھی۔ اب وہ اپنی شناخت کی لڑائی لڑنے کے لیے سفید جھنڈا بلند کر کے نکلے تھے۔

طالبان درحقیقت قدیم خراساں کے دور سے جدید افغانستان تک، دینی مدارس میں زیر تعلیم ہی ہیں۔ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی ہر دور میں شامل رہے، جن کے جذبے ایمان اور روح جہاد سے جواں تھے۔ یہ کوئی باقاعدہ (ریگولر) فوجی نہیں تھے، بلکہ یہ وہ طالب علم تھے کہ جنھوں نے جہاد کی پکار سنی، اپنی کتابوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

چنانچہ اس بار طالبان، کے ساتھ روح جہاد سے سرشار جوں جذبوں کے حامل ان کے استاد بھی تھے۔ یہی نہیں مجاہد تنظیموں کے سپاہی ...... اہلیت رکھتے ہیں۔ امریکی تیل کمپنیوں کو بھی دلچسپی تھی کہ وسطی

ایشیا کے لیے زمینی راستے کھلیں۔ افغان تاجر، جو پاکستان میں تھے، وہ بھی چاہتے تھے کہ تجارتی راستے کھلے، اس صورت حال کی شکل میں ایک ایسی قوت نظر آئی، جو یہ کام کر سکتی تھی، پاکستان نے آگے بڑھ کر ان کی پشت بانی کی۔ ان کی تنظیم اور پیش رفت خالص مقامی سطح پر پیدا ہونے والی تحریک تھی لیکن یہ کہ پاکستان ہی کے ایما پر اور پاکستان کی کسی سازش کی بنا پر طالبان کا ظہور ہوا، ایک غلط مفروضہ ہے۔ ہر واقعہ کو غلط مفروضوں کی بھینٹ چڑھانے کا نتیجہ کبھی تعمیری نہیں ہوا کرتا۔

جب انہوں نے سپین بلدک کی رنگین مارکیٹیں ختم کیں، سمگلنگ کا خاتمہ کیا اور پوست کی کاشت کو بڑی حد تک ختم کیا۔ اس کے بعد حکومت پاکستان کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے کرنل امام کی قیادت میں تجارتی قافلہ بھجوایا، جس کو عصمت مسلم کی تربیت یافتہ سابق کیمونسٹ ملیشیا نے روکا۔ ملیشیا کی طرف وار کرنے والوں میں گورنر قندھار گل آغا، حاجی احمد اور امیر لالائی وغیرہ تھے۔ اس مجرمانہ اقدام کے حامل افراد میں سے بعض بھارت نواز سیاستدانوں نے بھی بھارتی سرمایہ کی ''تھیلیاں'' شر پسندوں کو فراہم کرنے کا بندوبست کیا طالبان نے جوابی ایکشن کیا، اور پاکستان کے قافلے کو چھڑوالیا۔ مجرموں کو پکڑا اور انہیں کڑی سزا دی۔ اس اقدام کے نتیجے میں پاکستان کا طالبان سے فطری طور پر نفسیاتی الحاق ہوگیا۔ بلاشبہ اس کے بعد طالبان کی کامیابیوں کا ایک سبب پاکستان بھی بنا اور پاکستان کی یہ امداد اخلاقی تعاون کی سطح پر تھی، پاکستان نے انہیں فوجی امداد نہیں دی۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ افغانستان کے باب میں اخلاقی امداد توانائی کا ایک بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے کہ جنگی امور میں بڑی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے افغانوں کی رشتہ داریاں، تجارتی مفادات سب ان قبائل سے وابستہ ہیں جو صدیوں سے پاکستان کے علاقے میں آباد ہیں۔

اس اعتبار سے پاکستان کا یہ رول حالات کا تقاضا ہی نہیں، درست بھی ہے۔ یوں پاکستان کے ساتھ افغانستان کی 2400 کلو میٹر لمبی سرحد ہے۔ طالبان کے کنٹرول سنبھالنے کے بعد اس سرحد پر کوئی خرابی نہیں پیدا ہوئی۔ اس سے قبل پاکستان کے لیے صورت حال نہایت تشویش ناک تھی۔ عبد السلام راکٹی، زیارت کے ڈپٹی کمشنر اور چینی انجینئروں کو اغوا کر کے اپنے علاقے میں لے گیا تھا۔ مگر طالبان کی آمد کے بعد پاکستان کے قبائلی علاقے میں اس نوع کی یا کسی بھی نوع کی ناپسندیدہ واردات نہیں ہونے دی۔ گویا انہوں نے وہاں امن وامان کی جو صورت پیدا کی اس کے خود پاکستان کے امن وامان پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

اس مرحلہ پر جملہ معترضہ کے طور پر ہی سہی، پاکستان اور افغانستان کی قومی نفسیات کا چند لفظوں میں جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔ پاکستان کے خطہ کے باسی صدیوں سے غلامی برداشت کرنے کے نتیجے میں کچھ ایسی نفسیات کا چند لفظوں میں جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔ پاکستان کے خطہ کے باسی صدیوں سے غلامی برداشت کرنے کے نتیجے میں کچھ ایسی نفسیات کے حامل ہوگئے کہ برائی کو دیکھ کر اس سے نفرت کرنے کے باوجود اسے روکنے کے لیے آمادہ کار نہیں ہوتے۔ احتجاج کرتے ہیں تو ایک حد تک اور بس۔ اس کے مقابلے میں افغانستان کبھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا نہیں گیا۔ اس لیے ان کے احتجاج کا طریقہ جدا ہے۔ وہ جب خرابی دیکھتے ہیں تو تھوڑا بہت برداشت کرتے ہیں مگر اس کے بعد برائی کے سامنے دیوار چننا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اسے روکنے

کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں کلہاڑی، ڈنڈا، رائفل یا پتھر، جو کچھ بھی ملے اسے اُٹھا لیتے ہیں۔ اللہ سے مدد مانگتے ہیں اور برائی کی قوت سے ٹکرا جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی روایت کے پس منظر میں طالبان کا اُبھار ہوا اور یہی وہ روایت ہے جس کا اظہار قبل ازیں مجاہد قیادت کر چکی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ طالبان کو اتنی بڑی کامیابیاں کیسے ملیں ......؟ کیا انہوں نے اپنے ہم وطنوں کا خون بہا کر فتح پائی؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

...................... اس کامیابی اور پرامن یلغار کے ابتدائی دنوں میں امریکہ بھی طالبان کے کردار اور ان کی پیش رفت پر مطمئن تھا۔ یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ طالبان کی پیش قدمی پر کیوں مطمئن تھا؟

دراصل امریکہ افغانستان کو ایک تقسیم شدہ ملک کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔ ان کی تھیوری کے مطابق طالبان کی پیش قدمی ان کی خواہش کے مطابق افغانستان کے نقشے کی تشکیل میں مددگار بننے کی طرف رواں دواں تھی۔ علاوہ ازیں یہ کہ مزاحمت کے دوران مارا جانے والا کوئی امریکی نہیں بلکہ افغان ہی تھا۔ تاہم امریکہ نے اپنے طور پر یہ پیش بندی کر رکھی تھی کہ ہندوکش لائن پر پہنچنے کے بعد طالبان کو آگے نہیں جانے دینا چاہیے تاکہ افغانستان کی وحدت پشتون اور فارسی زبان میں منقسم ہو جائے۔

لیکن ہوا یہ کہ مصنوعی شمالی اتحاد کے مقابلے میں، خود وہاں کے عوام نے بھی طالبان کو خوش آمدید کہا۔ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والی حزب وحدت تک نے مزاحمت نہ کی، بامیان اور مزار شریف میں بھی انہیں قبول کیا گیا۔ اس طرح 85 فی صد افغانستان، طالبان کے زیر نگیں آ گیا......اور آج کابل، قندھار اور ہرات کے شہرو دیہات، واشنگٹن، شکاگو اور نیویارک سے زیادہ پرامن ہیں۔ مگر اس کے باوجود اب تک صرف پاکستان، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا ہے۔

طالبان نے کنٹرول سنبھالتے ہی اپنے تصور کے مطابق اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے اقدامات شروع کیے۔ اس دوران ان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ تجربہ کار نہیں تھے۔ اس لیے کسی بھی انسانی کاوش کی طرح وہ بھی افراط و تفریط کا شکار ہوئے، لیکن ان کی نیت درست تھی۔ اسی لیے جب کبھی ان کے سامنے دلیل آ گئی تو انہوں نے اپنے بعض اقدامات سے رجوع کیا، یا دوسرے لفظوں میں انہوں نے میانہ روی اختیار کی۔

ایسا معاشرہ کہ جس پر سرکشی غالب آ جائے، جہاں قانون اور انصاف کا چلن تک باقی نہ رہا ہو، آج ''روشن خیال'' مغرب بھی ایسے معاشرے کے لیے مارشل لاء اور سخت انضباطی کارروائیوں کو جائز قرار دیتا ہے۔ مگر جب افغان معاشرے کی تشکیل نو اور وہاں پر امن اور نظم و ضبط لانے کے لیے طالبان نے چند اقدامات ہی کیے تو پورا مغرب بھنا اُٹھا۔ حالانکہ انہوں نے اتنی طویل اور خون ریز جنگ سے گزرنے والے معاشرے میں نظم و امن قائم کیا تھا۔ ہندوکش پار کر کے افغانستان کی وحدت کو برقرار رکھا تھا۔ اپنی قوم کی ماؤں بہنوں کی آبرو کی حفاظت کی، چوری چکاری کا خاتمہ کیا۔ شریعت کے تحت گنتی کے چند ہاتھ کٹے تو پورے یورپ میں ہاہا کار مچ گئی۔

مگر امریکہ اور یورپ ان ہزاروں انسانوں کا پرسان حال نہیں بنا، جن کی ٹانگیں اور ہاتھ یورپی نژاد روسی فوجوں کی بارودی سرنگوں سے کٹ کر جسم سے الگ ہوگئے ہیں۔ آخر یہ کہاں کی انسان دوستی اور کون سا احترام آدمیت ہے؟

اسی روس کو اربوں ڈالر کی امداد مل رہی ہے جس نے پندرہ لاکھ افغانوں کے خون سے ہولی کھیلی، 5 لاکھ افراد کو معذور کیا اور ساٹھ لاکھ کو بے گھر کیا۔ مگر جس افغانستان نے سر دھڑ کی بازی لگا کر روس جیسی سرکش سلطنت کے بڑھتے ہوئے قدم کاٹ دیے، اس افغانستان کے لیے نہ دوا، نہ دارو، نہ روٹی اور نہ سڑکیں بلکہ الٹا معاشی، سیاسی اور سماجی پابندیاں!۔ یہ بہت بڑا ظلم اور اس صدی کی عظیم ترین سنگ دلی ہے۔ طالبان کو اس کامیابی کے باوجود امریکہ اور اس کے حلیف اس بات کو برابر دہراتے چلے جارہے ہیں: "کابل میں وسیع البنیاد حکومت قائم ہونی چاہیے۔" مگر کوئی یہ نہیں بتاتا کہ وسیع البنیاد حکومت ہوتی کیا ہے؟ یہ وسیع البنیاد کا شوشہ دراصل ایک وسیع البنیاد انتشار کا دوسرا نام ہے۔ امریکی اس پردے میں پرانے کیمونسٹوں اور اپنے حلیفوں کو اقتدار میں لانا چاہتے ہیں۔ ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے تو طالبان نے ............... دوران مزار شریف میں ملیشیا کے سرغنہ عبدالمالک نے اپنے لیڈر رشید دوستم سے بغاوت کی، اور طالبان نے عبدالمالک سے تعاون کا معاہدہ کرلیا۔ میرے خیال ہی میں نہیں، بلکہ خود جید علماء کے نزدیک بھی یہ معاہدہ شرعی اعتبار سے ایک غیر معیاری فعل تھا۔

کہاں ایک طرف روس اور اس کی پٹھو حکومت سے لڑنے والے مجاہدین، جن پر طالبان نے یلغار جاری رکھی اور کہاں عبدالمالک جیسے سفاک انسان اور کیمونسٹ قوتوں کے حلیف فرد سے تعاون پر خوش دلانہ آمادگی؟ اگرچہ یہ ایک تحقیر آمیز سوال ہے لیکن مجھے آج بھی شبہ ہے کہ اس تعاون کے لیے غالباً انہیں پاکستان کی بے نظیر حکومت کی جانب سے کہا گیا ہوگا۔ بہر حال اس معاہدے سے طالبان کی حیثیت، ساکھ اور مقام و مرتبے (Image) کو سخت نقصان پہنچا۔ دوسری جانب عبدالمالک نے بدعہدی کرتے ہوئے طالبان کو الجھایا اور پھر طالبان کی جنگی قوت اور فرنٹ لائن کے تقریباً 60 فی صد لوگ اس الجھاوے کی لپیٹ میں آگئے۔ یہ بڑا المیہ تھا۔ تاہم یہاں پر پھر طالبان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے ایک بار پھر قوت مجتمع کی اور 8 اگست 1998ء کو مزار شریف پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرلیا۔

مزار شریف کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد انہوں نے ایک دوسری غلطی کی۔ وہ یہ کہ انہوں نے وہاں کی شیعہ آبادی کو ہدف انتقام بنایا اور ملیشیا کمانڈر مالک کے ہاتھوں مارے جانے والے اپنے ساتھیوں کا بدلہ، ہزاروں افراد کو مار کرلیا۔ تاہم اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ شرعی اعتبار سے طالبان کا یہ فعل انتہائی قابل اعتراض اور جنگی حکمت عملی کے قطعی منافی اقدام تھا۔ جس کے نتیجے میں ایران سے بھی ان کا معاملہ بگڑ گیا۔ چنانچہ طالبان کے یہ دو غیر معیاری اقدام تھے۔ جن کا خمیازہ انہیں بعد میں بھگتنا پڑا۔

مثلاً شمال میں دو دفعہ شیر خان، امان صاحب نے کندز پر قبضہ کیا، مگر وہ علاقے دونوں مرتبہ ان کے ہاتھ سے نکل گئے، تخار پر کنٹرول نہیں ہوسکا۔ اور جب تک تخار پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں ہوتا، آئندہ پیش قدمی کے لیے انہیں مشکلات کا سامنا رہے گا۔

طالبان کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی کہ جہاں جہاں انہیں فتح حاصل ہوئی، وہ ان کی کسی فوج قوت کے

بل بوتے پر حاصل نہیں ہوئی، بلکہ وہاں کے عوام کی جانب سے پذیرائی اور قبولیت کے باعث ہی انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ان تمام علاقوں میں روسی فوجوں سے لڑنے والے مسلح مجاہدین تھے۔جنہیں گولی کے زور پر اپنا مطیع بنایا نہیں جا سکتا تھا۔انہوں نے بھی اگر طالبان کو تسلیم کیا اور جوابی گولی نہیں چلائی تو اس کا سبب طالبان کے بارے میں عمومی طور پر مثبت امیدوں کا وجود تھا۔امر واقعہ یہ ہے کہ جہاں عوام، طالبان کو پسند نہیں کرتے تھے، وہاں پر انہیں کامیابی بھی نہیں ملی۔مثال کے طور پر پروان اور چاریکار میں یہی کچھ پیش آیا۔

ان دونوں مقامات پر طالبان سے ایک اور غلطی سرزد ہوئی۔طالبان نے طے کیا تھا کہ وہ جہاں بھی جائیں گے۔ہتھیار واپس لیں گے۔لیکن انہوں نے پروان اور چاریکا پر کنٹرول کے باوجود ہتھیار واپس نہیں لیے۔اپنی عمومی پالیسی سے ہٹ کر انہوں نے امتیازی برتاؤ کرتے ہوئے مقامی لوگوں کے پاس بندوقیں اور دوسرا خود کار اسلحہ رہنے دیا۔چنانچہ جونہی مقامی لوگوں میں طالبان کے حوالے سے کچھ بے اطمینانی پیدا ہوئی تو انہوں نے بغاوت کر کے، آناً فاناً طالبان کا کنٹرول ختم کر دیا۔انہیں جاننا چاہیے اور وہ جانتے ہیں کہ افغانستان کے لوگ اسلحہ بند ہیں، اور پرانے تجربہ کار جنگجو بھی۔اس لیے جہاں بھی عوام میں ان کے خلاف ردعمل ہوگا، وہاں پر ان کے لیے کنٹرول برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

طالبان کو افغانستان میں جن مشکلات کا سامنا ہے۔اس پر نظر ڈالتے وقت یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ گزشتہ ربع صدی سے افغانستان ............ ۔نظام قابل قبول ہے۔عورتوں کے حوالے سے ان کی ضابطہ بندی صدیوں سے ان کے معاشرتی طرز فکر کی آئینہ دار ہے۔اس رواج یا ''عرف'' سے ہٹ کر طالبان نے کوئی بات نہیں کی۔لہٰذا ان کو قبولیت ملی ہے۔البتہ شہروں کی ایک خاص آبادی کو اس پر ضرور بے چینی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔مگر ان میں بھی بیش تر لوگ وہی ہیں جنہیں کیمونسٹ ''پسند'' آ گئے تھے۔

☆ افغانستان کا تیسرا مسئلہ اس کا اتحاد تھا۔جہاں تک افغانستان کے بطور ریاست متحد رہنے کا تعلق ہے۔شمالی اتحاد، کمانڈر احمد شاہ مسعود اور ایران کے کچھ اقدامات کے نتیجے میں افغانستان کی تقسیم کے شدید خطرات پیدا ہو گئے تھے۔مگر طالبان نے شمال میں جا کر جس طرح اپنے قدم جمائے۔اس سے تقسیم افغانستان کے امکانات معدوم ہو گئے۔

چنانچہ ان تینوں پہلوؤں کے حوالے سے طالبان نے امید کی کیفیت پیدا کی۔

پانچ برس سے زیادہ عرصہ تک کابل پر کنٹرول رکھنے کے باوجود رہ گیا افغانستان کی تعمیر و ترقی کا معاملہ۔ کسی ملک میں تعمیر و ترقی اس وقت ہوتی ہے۔جب اضطرابی کیفیت ختم ہو لیکن وہاں ابھی تک یہ کیفیت جاری ہے۔اس لیے طالبان کے پاس یہ جواز موجود رہا ہے کہ: ''ہم اس وقت حالت جنگ میں ہیں۔'' اور یہ دلیل ان کے عوام کی سمجھ میں بھی آتی ہے۔(اسی دلیل کی آڑ میں جو افغان مہاجرین، پاکستان میں موجود ہیں وہ واپس جانے کے لیے آمادہ نہیں)۔

طالبان کی درویشانہ زندگی اپنی جگہ لیکن اسے بے یقینی کی کیفیت نے طالبان کو نچلے درجے کی لیڈر شپ کے کچھ عناصر میں کرپشن بھی پیدا کی۔جس کو ان کی قیادت نے نہ صرف پکڑا۔بلکہ اس پر سخت سزائیں بھی دیں۔

وہ الغات کواپنی عملی روح کے مطابق رو بہ عمل لانے کے لیے کامیابی سے آگے بڑھے۔میرے نزدیک یہ طالبان یا کسی فرد کا کمال نہیں ہے بلکہ یہ صرف شریعت پر یقین اور شریعت کے نفاذ کا ایک زندہ کرشمہ ہے۔اسی طرح وہاں پر کوئی مقدمہ التوا میں نہیں ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ افغانستان کی تعمیر و ترقی کی ذمہ داری صرف طالبان پر ہی نہیں بلکہ شمالی اتحاد پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر شمالی اتحاد ان کے خلاف اس بے جواز جنگ کو بند کر دے تو اس کا فائدہ پورے افغانستان (بشمول شمالی افغانستان کو پہنچے گا......)

اس مسئلے کو ذرا دوسرے زاویے سے بھی دیکھئے۔اگر شمالی اتحاد کا کابل پر قبضہ ہو بھی جاتا ہے تو کیا اس سے واقعی جنگ ختم ہو جائے گی؟ کیا اس کے نتیجے میں افغانستان کا خدشہ ختم ہو جائے گا؟ میرا خیال ہے کہ اس سے نہ صرف یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ طالبان، پشتون علاقوں پر اور شمالی اتحاد، فارسی زبان علاقوں پر حاوی ہوں گے۔اور اس طرح افغانستان کی تقسیم کی امریکی خواہش پوری ہو جائے گی۔اس امکان کی بات کہ اگر شمالی اتحاد، طالبان سے مل کر اپنا اتحاد بنا لے؟

دراصل بڑا اختلاف مرکزی لیڈر شپ، دفاع اور قضا (عدل) کے شعبوں پر ہیں۔سوچنے کی بات ہے اگر شمالی اتحاد کو ان تینوں پر ملا محمد عمر کی قیادت تسلیم کرنا پڑے تو کیا استاد برہان الدین ربانی اسے مان لیں گے؟ میرا خیال ہے کہ معاملات جس درجے پر پہنچ چکے ہیں، وہ نہیں مانیں گے ......اسی طرح کیا ملا محمد عمر، ان تینوں کلیدی سرچشموں پر شمالی اتحاد کی قیادت مان لیں گے؟ اس سوال کا ہاں یا ناں میں جواب دینے سے پہلے یہ بات غور طلب ہے کہ اس مطالبے کا منطقی جواز آخر کیا ہے؟

اگر ملا عمر جو نوے فیصد علاقے پر کنٹرول رکھنے کے باوجود یہ مطالبات مان لیتے ہیں تو پھر طالبان اور ان کی پوری تحریک کہاں .......................... ہے کہ جس کا کابل پر قبضہ ہے۔اسے عالمی سطح پر تسلیم نہیں کیا جا رہا۔جو تاریخی اور سیاسی اعتبار سے کھلی دھاندلی ہے۔

اسی طرح یہ مسئلہ بار بار اُٹھایا جاتا ہے کہ "افغانستان میں ایک وسیع البنیاد حکومت قائم کی جائے"......
اگر وسیع البنیاد حکومت کا مطلب یہی ہے کہ افغانستان کے معقول اور اسلامی کریکٹر کے حامی عناصر کو شوریٰ، انتظامیہ اور عدلیہ کے اندر نمائندگی دی جائے تو یہ ایک درست بات ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ امیر ریاست کے دو امیر نہیں ہو سکتے۔ ہمیشہ سے ایک ہی منتظم اعلیٰ ہوتا آیا ہے۔ربانی صاحب کے مطالبات یہ ہیں کہ عمارت میں "حصہ" دیا جائے اور اس کے ساتھ عدلیہ اور دفاع کے شعبے بھی ان کے حوالے کیے جائیں۔اس کے پس منظر میں ربانی صاحب کے بازوئے شمشیر زن احمد شاہ مسعود کی وہی خواہش ہے جس کے باعث انہوں نے حکمت یار سے تصادم جاری رکھا۔جس کا نتیجہ سوائے تباہی کے کچھ نہ نکلا۔

جہاں تک جہادی تنظیموں کے قائدین کے رول کا تعلق ہے تو اس ضمن میں اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ ان حضرات کو بدلے ہوئے زماں و مکاں کا ادراک کرتے ہوئے قیادت کے اس منصب و مقام سے نیچے آ جانا چاہیے۔ جہاں پر کبھی وہ تھے مگر اب نہیں ہیں اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کے لیے دل و دماغ کو آمادہ نہ کیا جا سکے۔کوئی چیز

مستقبل نہیں۔ کسی کیفیت کو قرار نہیں اور تاریخ انسانی میں کردار بدلتے رہے ہیں اور رہیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہادی قائدین نے اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم کردار ادا کیا لیکن اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ بعد میں وہ اپنے دوسرے کردار کی ادائیگی کے لیے اپنے آپ کو نہ ڈھال سکے۔ جس سے ان کو حکمرانی کرنے کا کردار سے دست ساقط ہوگیا۔ مانا کہ اس میں خارجی عوامل بھی کارفرما تھے۔ مگر یہ کب ہوا ہے کہ خارجی اور داخلی عوامل لازماً آپ کی مرضی کے مطابق ہوں......! بہرحال ہم کو حالات کے جبر میں رہتے ہوئے راستہ نکالنا ہوتا ہے۔ جو بدقسمتی سے نہیں نکل سکا۔

اس لیے جہادی قائدین کو اس دوسرے کردار میں اپنی ناکامی کو تسلیم کر لینا چاہیے اور اپنے آپ کو معیاری اور جدید تعلیم وتدریس کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ کیونکہ امن کے بعد تعمیر وترقی کا جو مرحلہ آئے گا۔ اس میں انہی کا رول ہوگا جو زیور تعلیم سے آراستہ ہوں گے۔ اگر انہوں نے دانش مندی سے موجودہ مرحلے کو تاریخ کا ایک فطری عمل سمجھ کر تسلیم کر لیا تو مستقبل ان کا ہے۔ بہرکیف اس وقت جہادی قیادت کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہے اور نہ انہیں اس کے لیے اصرار کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہیں افغانستان میں امن وامان کی بحالی اور تعمیر وترقی کے حصول کے لیے طالبان کے موجودہ کردار کو صدق دل سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہی راہ ثواب ہے!

اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا کتمان حق کے مترادف ہوگا کہ وہ لوگ جنہوں نے جہاد میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اور بڑی قربانیاں دی ہیں وہ بڑے عظیم لوگ ہیں۔ اگر ماضی میں جہادی قیادت نے قربانیاں نہ دی ہوتیں تو آج افغانستان طالبان کے زیر اقتدار نہ ہوتا۔ اس لیے خود طالبان کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کل کی جہادی قیادت کے لیے کوئی کردار متعین کرنا چاہیے۔ مگر شواہد بتاتے ہیں کہ اس باب میں طالبان کے ہاں خاصی ہچکچاہٹ اور شاید خود اعتمادی کی کمی پائی جاتی ہے۔ انہیں یہ خوف ہے کہ "یہ ہمارے نظم کے اندر داخل ہو کر ہمیں بے اثر کر دیں گے۔" اپنوں سے ایسا خوف اور گریز کوئی دانش مندی کی بات نہیں۔ طالبان اور مجاہدین کی سابق قیادت کو تاریخ کا یہ سبق ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ صورت حال تادیر قائم نہیں رہ سکتی اور اگر اسے برقرار رکھا گیا تو سوائے تباہی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس لیے مجاہد قیادت کو چاہیے کہ وہ اپنے کمانڈروں اور دوسرے لوگوں کو فیصلہ کرنے .............. لیے طالبان اور مجاہد قیادت کو فروغ دلی کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور روایتی ضد چھوڑنا ہوگی۔

جہاں تک اس غیر یقینی صورت حال سے نکلنے کے سوال کا تعلق ہے۔ اس کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے۔

چونکہ ہر افغان شریعت کی پاسداری کا دم بھرتا ہے۔ اس لیے مسئلے کے حل کے لیے ہم ایک بین الاقوامی سطح کا ایسا حکم قائم کریں۔ جو غیر افغانیوں پر مشتمل ہو جسے دونوں فریق قبول کر لیں "حکم" ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے اپنے مسائل حل کرنے کے لیے بااختیار اتھارٹی کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ (یہ حکم وفد اس لیے بھی غیر افغانیوں پر مشتمل ہونا چاہیے کیونکہ عام طور پر افغان اپنے معاملات میں محدود سوچ سے اوپر اُٹھنے کو تیار نہیں ہوتے اور جس بات پر جم جائیں انہیں دلیل سے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ان کا ایک قومی مزاج ہے جسے تسلیم کرتے ہوئے مسئلے کو حل کرنے کی سبیل نکالنا ہوگی)۔ مجوزہ حکم وفد میں مسلمان حکومتوں کے نمائندے، عدلیہ اور اعلیٰ دینی فہم رکھنے والے افراد شامل ہوں۔ حکم اس عہد اور حلف کے ساتھ کام کا آغاز کرے کہ "ہم شریعت کے مطابق

ہی فیصلے کریں گے" یہ راستہ طالبان کے لیے اور ان کے متحارب گروہوں کے لیے بھی قابل قبول ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "معاہدہ پشاور" اپریل 1992ء اور "معاہدہ اسلام آباد" مارچ 1993ء جو حشر ہوا ہے۔ کیا ضمانت ہے کہ اس کاوش کا بھی وہ انجام نہ ہوگا؟۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوشش اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ کیونکہ وہ معاہدے شریعت کے مطابق کسی "حکم" کے آئینہ دار نہیں تھے۔ بلکہ وہ سیاسی صورتحال کو سیاسی معاہدے کے ذریعے حل کرنے کی سیاسی کوششیں تھیں۔ جو کامیاب نہ ہوسکیں۔ لیکن میری رائے میں مجوزہ صورت پر مبنی کوشش ایک شرعی معاہدے پر منتج ہوسکتی ہے۔

اندیشہ ہے کہ شمالی اتحاد اس تجویز کو نہیں مانے گا۔ اس کا "مسئلہ" یہ ہے کہ "دفاع" بھی ہم نے کرنا ہے اور حکومت بھی ہم ہی کو ملنی چاہیے۔ اب اگر اس حکم کو شمالی اتحاد مسترد کرے گا تو وہ از خود افغان عوام کے سامنے کمزور پوزیشن میں چلا جائے گا۔

ملا محمد عمر صاحب کے سامنے بھی حکم یہ بات رکھ سکتا ہے" آپ کو 1996ء کے اوائل میں قندھار اور مضافات کے بارہ سو علماء نے امیر المومنین مقرر کیا تھا۔ اب آپ نوے فیصد علاقے پر اختیار رکھتے ہیں۔ اس لیے آپ ایک جامع شوریٰ کے لیے علماء کمانڈر اور ٹیکنو کریٹ مقرر کریں، اور اس شوریٰ سے آئندہ کے لیے مینڈیٹ استحقاق حکمران لیں۔ جب شوریٰ قائم ہو جائیگی تو سمجھ لیں مسئلے کا حل قریب آجائے گا۔ یہاں پر ایک بات ذہن میں ذہنی چاہیے کہ افغان شوریٰ آزاد ہوا کرتی ہے وہ کسی کی پابند نہیں ہوتی۔ جب وہ کسی اجتماعی بڑی مجلس میں بیٹھ جاتے ہیں تو سمجھ بوجھ کو استعمال کرتے ہیں۔ جس کا ایک مظاہرہ ہم نے مدینۃ الحجاج، اسلام آباد میں بھی اس وقت دیکھا تھا۔ جب ارکان شوریٰ نے اپنی ہی جہادی تنظیموں کی آرا سے اختلاف کر کے آزادانہ رائے دی تھی۔

پھر شوریٰ کے انعقاد کے ضمن میں ایک بڑا اہم سوال یہ ہے کہ اسے بلائے کون! میرے نزدیک اصولی طور پر اسے طلب کرنے کا حق ملا محمد عمر صاحب کو ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ زمینی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ یہ اتھارٹی ملا محمد عمر کے پاس ہے۔

افغانستان کا مستقبل تین الفاظ میں محفوظ ہے۔ اسلام، امن اور اتحاد جو جو سیاسی قوت بھی افغانستان میں ان تین الفاظ کے تحفظ کے لیے بامعنی کوشش کرے گی اہل پاکستان اس کے ساتھ ہیں اور تا حال طالبان یہ کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ خود پاکستان کے حکمرانوں اور پالیسی ساز اداروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ افغانستان اور پاکستان کے باہم تعلقات کو خراب کرنے کے لیے ہمیشہ باہر سے شرارت ہوتی رہے گی۔ واضح رہے ہر وہ چیز پاکستان کے مفاد میں ہے جو افغانستان کے نفع میں ہے۔ اگر امن افغانستان کے مفاد میں ہے تو یہی پاکستان کے مفاد میں ہے۔ اگر اتحاد، افغانستان کی ضرورت ہے تو یہ پاکستان کو بھی اتنا ہی عزیز ہے۔ اگر اسلامی شریعت کا نفاذ افغانستان کا مطمع نظر ہے۔ تو پاکستان کے لیے بھی یہ اتنا ہی ضروری ہے۔ گویا کہ پاکستان اور افغانستان کے حالات، ان کی اچھائیاں اور برائیاں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اثر انداز ہوتی رہیں گی۔ اس لیے اہل پاکستان کو چاہیے کہ وہ افغانستان کے لیے ہر وہ چیز پسند کریں۔ جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔

❁

# افغانستان پر پابندیاں۔امت مسلمہ کی غیرت کے لیے چیلنج

اقوام متحدہ نے افغانستان کے خلاف نئی اقتصادی پابندیاں عائد کردی ہیں۔مظلوم افغان قوم پر ظلم کا نیا کوڑا برسایا گیا ہے۔ربع صدی پہلے افغانوں پر روس نے توسیع پسندانہ مقاصد کے لیے جارحانہ جنگ مسلط کی اور افغانوں کو پرچم جہاد بلند کرنا پڑا تو امریکہ افغانستان کا دوست تھا اور روس کٹر دشمن۔ستم ظریفی دیکھیے آج دونوں جنگ سے تباہ حال اس کمزور ملک کے خلاف متحد ہوگئے ہیں۔انسانیت کے خلاف جرم کی یہ بدترین مثال ہے۔مظلوم کے خلاف ظالموں کے گٹھ جوڑ کا سبب اسامہ بن لادن نہیں بلکہ،اسلام دشمنی کی قدر مشترک ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ چیلنج قبول کرنے کے لیے تیار ہیں یا پھر عالم خواب میں ہی سب کچھ لٹا بیٹھیں گے؟ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ افغانستان کے بعد پاکستان ان کا ہدف بننے والا ہے۔ہماری ایٹمی قوت ان کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔پھر ایران کی باری آئے گی اور اس طرح باری باری تمام اسلامی ممالک کی گردن مروڑی جائے گی۔جن سے انہیں کسی طرح کا خطرہ بھی ہے۔تاریخ کے اس موڑ پر مسلمان ممالک جس قدر جلد اس صورتحال کا ادراک اور اس خطرے سے نمٹنے کی تدبیر کرلیں اسی قدر ان کے حق میں بہتر ہے۔

بعض کند ذہن دانشور خیال کرتے ہیں کہ اس افتاد کا اصل مسئلہ اسامہ بن لادن ہے۔یہ ان کی خام خیالی ہے۔اسامہ نہیں ہوگا کہ کوئی اور ہوگا۔ان کی جنگ تو اسلام سے ہے اور ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جرم ضعیفی کا شاخسانہ ہے۔ہمارا دشمن اتنا بھی طوفان نہیں کہ ہم سب کو ڈبو دے مگر ہم نے خواہ مخواہ خوف کے مارے مغرب کی غلامی کو ہی ذریعہ نجات سمجھا ہوا ہے۔ہماری یہ کمزوری دشمن کے ہاتھ آگئی ہے۔دوسری طرف اس نے ہماری قوم کی وحدت فکر وعمل سے محروم کرنے کے لیے تقسیم در تقسیم کا عمل شروع کر رکھا ہے۔امت کا شیرازہ بکھیرنے کے لیے اسے ہمارے اندر فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے والے علماء کی فوج بھی حاصل ہوگئی ہے۔آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک اور دوسری غیر سرکاری تنظیمیں بھی اس کام میں شریک ہیں۔اسلام دشمن طاقتوں نے اپنے کارکنوں اور ہتھیاروں کو باہم مربوط کرلیا ہے اور ایک غیر مرئی جنگ ہم پر مسلط کردی ہے۔بات محض ایک اسامہ پر ختم نہیں ہوتی۔اگر آج افغانستان اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کردے تو کیا وہ افغانستان کے اسلامی تشخص کو تسلیم کرلے گا۔؟ کشمیر فلسطین اور چیچنیا کی تحریکوں میں تو کوئی اسامہ موجود نہیں۔پھر ان کے خلاف سازشوں کا کیا سبب ہے۔؟ کیا افغانستان پر پابندیاں لگنے کے بعد امت کے خلاف غیر مرئی عالمگیر جنگ ختم ہوجائے گی۔؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا بات یہاں نہیں رکے گی۔وہ مرحلہ وار مسلمانوں کی گردن پر اپنا شکنجہ

کنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا افغانستان تنہا اپنے اوپر لگنے والی پابندیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔؟ ہرگز نہیں ...... افغانستان کی مزاحمت کے اثرات بوجہ محدود رہیں گے۔ اس لیے کہ اسے پہلے روز ہی اندرونی اور بیرونی محاذوں پر خانہ جنگی اور سازشوں کا سامنا ہے۔ایک متحد اور طاقت ور دشمن کا مقابلہ متحد اور منظم ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ میں اس سلسلے میں عام مسلمانوں اور افغانستان کے متعلق ہر صاحب فکر و دانش کی خدمت مین چند نکات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ پوری امت متحد ہو کر پابندیوں کے خلاف مزاحمت کرے مزاحمت کا دائرہ کار وسیع ہونا چاہیے۔ اخلاقی، قانونی اور معاشی تمام طرح کے میدانوں میں بھر پور مزاحمت ہونی چاہیے۔ امریکہ کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم اس کی اسلام دشمن حرکات کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اس مزاحمت میں پاکستان کا کردار انتہائی اہم ہے۔اس لیے افغانستان پر لگنے والی پابندیوں سے پاکستان بلواسطہ اور بلا واسطہ متاثر ہوگا۔ ہماری سیکیورٹی کونسل کی طرف سے اقوام متحدہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کے احترام کا اقرار کرنا انتہائی افسوس ناک ہے۔دوسرے اسلامی ممالک بھی منقار زیر پر دکھائی دیتے ہیں۔لہٰذا ضروری ہے کہ اس موقع پر او آئی سی کا اجلاس طلب کیا جائے۔ہم چھپن ممالک ہیں لیکن ہماری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اپنی حیثیت منوانے کا یہ سنہری موقع ہے۔ اجلاس میں اپنے تنازعات کو بھلا کر یہ دوٹوک موقف اختیار کیا جائے کہ ہم ایک برادر اسلامی ملک اور غیور قوم پر ناجائز پابندیاں برداشت نہیں کر سکتے ہیں اور متحد ہو کر ان کی مزاحمت کریں گے۔ اسلامی ممالک دنیا پر واضح کر دیں کہا کہ اگر ان پابندیوں پر عملدر آمد کیا گیا تو وہ متفقہ طور پر تسلیم کر لیں گے۔ اسلامی ممالک جو طالبان مخالف دھڑوں کو امداد دینے میں پیش پیش ہیں ان سے درخواست ہے کہ اپنے رویے پر نظر ثانی کریں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ بڑی طاقتوں کی جارحیت سے وہ بھی محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ اگر وہ مشترکہ ایجنڈے کے خلاف سد سکندری بن جائیں تو دنیا کا سیاسی نقشہ تبدیل ہو سکتا ہے۔

چین کے ساتھ اسلامی تحریکیوں اور مسلم ممالک کے تعلقات قابل رشک ہونے چاہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ چین کے طالبان کے بارے میں تحفظات میں تبدیلی آ رہی ہے۔ حال ہی میں اسلام آباد میں چین کے سفیر قندھار کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں۔ یہ مثبت پیش رفت ہے اس سے دونوں ممالک کے درمیان موجود شکوک شبہات کی بیخ کنی ہوگی۔ وہ عوامل جن سے چین کو پریشانی ہو سکتی ہے ہمیں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ تمام اسلامی ممالک کو چین کے ساتھ ہر سطح پر رابطے استوار کرنے چاہیے۔ پاکستان اس میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر یہ کام حکومتی سطح پر نہیں ہو سکتا تو مختلف اداروں اور تنظیموں کے ذریعہ عوام کو متحرک کیا جا سکتا ہے۔عوامی رابطوں سے بھی ایک دوسرے کے قریب آیا جا سکتا ہے۔

وہ دانشور جن کی زبانیں طالبان کو اجڈ گنوار اور دہشت گرد کہتے نہیں تھکتیں افغانستان کے خلاف استعمار کے جارحانہ عزائم کے بعد تو ان کی آنکھیں کھل جانی چاہیں۔ اب تو انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنا چاہیے۔ اور سچائی کی تبلیغ کرنی چاہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے وہ کیا چاہیں گے۔ افغانستان میں لاکھوں لوگ بھوکے مر

جائیں......؟ انہیں جان لینا چاہیے کہ معاملہ طالبان کا نہیں پوری افغان قوم کا ہے جسے اس کی غیرت وحمیت اور اسلام کی سزا دی جا رہی ہے۔ وہ مذہبی حلقے جنہیں طالبان کی تعبیر اسلام پر اعتراض ہے وہ بھی سر دست اس معاملے کو فراموش کر کے مسلمان بھائیوں کی طرف دست تعاون دراز کریں۔ یہ باہمی تنازعات کو اچھالنے کا وقت نہیں بلکہ اس وقت اسلام دشمن قوتوں کے خلاف متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ باہمی تنازعات بعد میں مل بیٹھ کر حل کر لیں گے۔

میں اس موقع پر برادرم برہان الدین ربانی اور ان کے ساتھیوں سمیت شمالی اتحاد کے قائدین سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ صورت حال کی نزاکت کو سمجھیں۔ موجودہ اقتصاد پابندیاں صرف طالبان کے خلاف نہیں پوری افغان قوم کے خلاف ہیں۔ اب دشمن کھل کر سامنے آ گیا ہے اور اس لیے وہ افغانوں کی حریت وحمیت کا روائتی کردار ادا کریں۔ شمالی اتحاد کا دوست نہ روس ہو سکتا ہے نہ امریکہ خصوصاً امریکہ کی دوستی تو سخت نا قابل اعتبار ہے۔ تمام افغانوں کو ان پابندیوں کو فوری طور پر مسترد کر دینا چاہیے۔ اگر آج برہان الدین ربانی اس کو مسترد کر دیں گے تو دشمن کے سارے مذموم منصوبوں پر پانی پھر جائے گا۔ جو لوگ افغانستان کے زیر کنٹرول نوے فیصد افغانستان کے عوام کے منہ سے روٹی کا نوالہ چھین لینا چاہتے ہیں۔ کسی مسلمان کو ان سے وفا کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

طالبان کو بھی اپنے رویے میں لچک پیدا کرنی چاہیے ان افغان مجاہدین کو خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیے جو کل روس کے خلاف صف آراء تھے۔ جن مجاہدین نے باطل کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ انہیں دشمن کی صفوں میں نہ دھکیلیں۔ ان کی قربانیوں کو یاد رکھیں۔ ان میں مخلص لوگ بھی ہیں جن کے ساتھ معاملات طے کیے جا سکتے ہیں۔ انہیں بتایا جا سکتا ہے کہ پوری افغان قوم شکنجے میں ہے اور ساری ملت اسلامیہ پر دباؤ ہے۔ یہ مل بیٹھنے کا وقت ہے۔ بردباری کا رویہ اختیار کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ آج ہم اپنے بھائیوں سے معاملہ نہ کریں اور کل ہمیں اپنے دشمن کے سامنے جھکنا پڑے۔ بہتر ہے کہ اپنے افغان بھائیوں سے معاملے میں پہل طالبان حکومت کی طرف سے ہو اس سے تعمیر ترقی اور خوشحالی کا سورج طلوع ہو گا۔

افغانوں کو چاہیے کہ وہ فلسطین اور دوسری اسلامی تحریکوں کی بھی بھرپور حمایت کریں۔ اسلامی جہادی تحریکوں کی حمایت کر کے وہ پورے عالم اسلام اور عرب دنیا میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اسرائیل پر دباؤ بڑھانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ افغانستان کے خلاف امریکہ کو یہودی لابی اکسا رہی ہے ورنہ امریکہ کو افغانستان سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

اس معاملے کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں نے اس المیے پر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ کیا ان کا خیال ہے کہ افغانستان پر یہ دباؤ جائز ہے یا پھر وہ کسی خاص ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔؟ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ انہیں بلا کر پوچھے اگر وہ انسانی معاملے پر احتجاج نہیں کرتے اور افغانوں کے ساتھ ہمدردی کا عملی ثبوت پیش نہیں کرتے تو پھر ان کی انسانی ہمدردی کا دعویٰ مشکوک ہے۔ لہٰذا وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں سے چلے جائیں۔ اس لیے وہ فراڈ اور فریب ہیں۔

افغان قوم جہاد اور قربانی کی سرخیل ہے۔ اس نے نہ صرف غیرت وحمیت کی ایک تابندہ داستان رقم کی بلکہ دنیا کی زیر دست اقوام کو مزاحمت اور جہاد کی بھی راہ سجھائی۔ اس وقت اس کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ ہماری امداد اخلاقی، سیاسی اور سفارتی میدانوں تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہمیں روٹی کے ہر نوالے میں ان کو حصہ دار بنانا چاہیے۔ میں نے تجویز کیا تھا کہ ہم ہر روز چائے کی ایک پیالی اور ایک روٹی اگر ان کے لیے وقف کر دیں تو ان کی خوراک کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اور اس کا ہماری معیشت پر بھی برا اثر نہیں پڑے گا۔ پوری امت میں مزاحمت اور جہاد کی سپرٹ بھی زندہ ہوگی۔

ہم پاکستانیوں کو خاص طور پر سوچنا چاہیے کہ ہمیں ایک بڑا مقابلہ آن پڑا ہے۔ اگر آج ہم اس بار ہار گئے تو اگلا نشانہ پاکستان ضرور بنے گا۔ قوم کو اس سے آگاہ رہنا چاہیے۔ خدانخواستہ ایسا ہوتو ہم پھر صدیوں تک نہیں اُٹھ پائیں گے۔ نکسن نے ۱۹۸۲ء میں روس کے صدر برزنیف کو خط لکھا کہ ہمیں اصل خطرہ ایک دوسرے سے نہیں بلکہ مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک سرگرم اسلامی تحریکوں سے ہے۔ آج طاغوتی قوتیں ایک ہوگئی ہیں۔ پاکستان عصر حاضر کی اسلامی تحریکوں کا سرخیل ہے اس لیے وہ لازماً اسلام دشمن قوتوں کا نشانہ بنے گا۔ یہ نوشتہ دیوار ہے۔ اس لیے ساری قوتوں کو ایک ہو جانا چاہیے۔ فوج اور قوم کے درمیان اعتماد کا رشتہ بحال کیا جائے اور مزاحمت کا فیصلہ کر لیا جائے تو دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو سرنگوں نہیں کر سکتی نہ ہمارے افغان بھائیوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ملک کی تمام سیاسی قوتوں کو یکسوئی کے ساتھ امریکہ اور روس کے اس ظالمانہ فیصلے کے خلاف پوزیشن واضح کرنی چاہیے۔ یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں۔ افغان جہاد نے عملاً افغان اور پاکستانی قوموں کو یک جان دو قالب کر دیا ہے۔ پاکستانی قیادت پر لازم ہے وہ کوئی قدم ایسا نہ اُٹھائے کہ جس سے تاریخی اثاثہ ضائع ہو جائے۔ افغان قوم احسان فراموش نہیں۔ آج ہم اگر ان کا ہاتھ پکڑیں گے تو اس کا اجر ہمیں مستقبل میں ملے گا۔

# افغان قوم اور اقوام متحدہ کا تازہ حملہ اور پاکستان کی ذمہ داریاں

افغانستان پر پابندیاں عائد کرنے کے بعد بین الاقوامی نگران ٹیموں (Monitoring Teams) کی تعیناتی جہاں عالمی طاقتوں کا نیا سفاکانہ اقدام ہے وہاں ہماری کمزور سفارت کا نتیجہ بھی۔ اقوام متحدہ کی قرار داد نمبر ۱۳۳۳ جیسی ظالمانہ اور ناجائز قرار داد کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ یک خوری (Uni-Polar) طاقت امریکہ اس قرارداد کا محرک ہے۔ اِدھر ہماری سفارتکاری اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ ہم چین تک کو متحرک نہ کر سکے کہ وہ اس قرارداد کو ویٹو کر دیتا۔ اگر ہم ابتدائی مرحلے پر اسے قبول نہ کرتے تو یہ معاملہ سلامتی کونسل میں چلا جاتا۔ پھر صورت حال اس سے قطعی مختلف ہوتی۔ مزاحمت نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے افغانستان ۲۰۰۰ میں مزید پابندیاں لگائیں اور آج وہ پابندیوں کی نگرانی کے لیے اپنی ٹیمیں بھیج رہے ہیں۔

افغانستان اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے کسی بھی دوست پڑوسی ملک کے لیے نعمت خداوندی ہے۔ اس میں حریت کیش، جنگ جو اور آزاد منش لوگ رہتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے چیلنج کا مقابلہ کرنے اور ہر طرح کی سختیاں برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ساری دنیا طالبان کی دشمن ہے۔ میں پورے وثوق سے اور اپنی بہترین معلومات کے بل پر کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان طالبان کی کوئی فوجی مدد نہیں کر رہا۔ وہ اب بھی ان ہی ہتھیاروں سے لڑ رہے ہیں جو روس افغانستان میں چھوڑ کر گیا تھا۔ شمالی اتحاد کو مختلف ذرائع سے جو ہتھیار ملتے ہیں بالآخر طالبان تک پہنچ جاتے ہیں۔ شمالی اتحاد کے کمانڈر اسلحے سمیت طالبان سے آملتے ہیں جبکہ ایسی کوئی مثال نہیں کہ طالبان کے کسی کمانڈر نے وفاداری بدلی ہو۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عوام نے طالبان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ طالبان نے ہتھیاروں کی خوگر قوم سے ہتھیار واپس لیکر مثالی امن قائم کر دیا۔ ابھی کل کی بات ہے افیون کی کاشت میں افغانستان کا پہلا نمبر تھا لیکن آج طالبان کی وجہ سے افیون کا ایک پودہ بھی نہیں ملتا۔ ان کی عدالتوں میں فوری انصاف ملتا ہے۔ کوئی مقدمہ بغیر فیصلہ کے نہیں رہتا۔ اس کی درویش صفت قیادت منافقت سے پاک ہے۔ جس کی پالیسی کھلی اور شفاف ہے۔ وہاں جرائم باقی نہیں رہے اور ان کی حکومت اپنے لوگوں کی دل و جان سے قبول ہے۔ اسلام کے بارے میں ان کی تعبیر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر یہ اختلاف چودہ سو سال سے موجود ہے۔

حال ہی میں انہوں نے عیسائی مبلغین کو گرفتار کیا جو مسلمانوں کو مرتد بنا رہے تھے۔ طالبان نے انہیں متنبہ کیا لیکن وہ باز نہیں آئے بادل ناخواستہ انہیں گرفتار کرنا پڑا لیکن ایسے لوگوں کی گرفتاری کا قانون طالبان نے نہیں بنایا بلکہ ظاہر شاہ کے دور سے افغانستان میں روبہ عمل ہے۔ اس لیے کہ افغانوں مذہب پسند و ناپسند کا مسئلہ

نہیں افغان من حیث قوم مسلمان ہیں۔ وہاں کے سکھ اور ہندو افغان نہیں کہلاتے بلکہ اپنے مذہب کے حوالے سے شناخت کیے جاتے ہیں۔ کوئی بھی شخص محض پگڑی پہننے اور پشتو اور فارسی بولنے سے افغان نہیں بنتا وہ افغان اسی وقت کہلائے گا جب مسلمان ہوگا۔ اقوام متحدہ (امریکہ) افغانستان کے تمام دھڑوں پر مشتمل وسیع البنیاد حکومت کیوں قائم کرنا چاہتی ہے۔؟ جبکہ 1992 سے 1996ء تک افغان قوم افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کا مزہ چکھ چکی ہے۔ دوبارہ اس مصیبت کو بلانے کا کیا جواز ہے۔ جب کہ طالبان قحط سالی اور اقتصادی پابندیوں کے باوجود خوش اسلوبی سے حکومت چلا رہے ہیں۔ اس مطالبے کا اصل مقصد افغانستان میں خانہ جنگی کی ٹھنڈی آگ کو از سر نو گرم کرنا ہے۔ امریکہ محض اپنے مفادات کے لیے اس خانہ جنگی کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اس مرحلے پر امریکی چال کے پس پردہ مقاصد کو سمجھنا ضروری ہے۔

اگر طالبان سے امریکی جھگڑا ختم ہو جائے یا اسامہ بن لادن کا قضیہ ختم ہو جائے تو امریکی خفیہ ادارے ۳۵ ارب ڈالر کی خطیر رقم سے محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ پھر اس کا کوئی ہدف نہیں رہتا۔ چین کو امریکہ اپنا حریف ضرور سمجھتا ہے لیکن ابھی کھلم کھلا دشمن قرار نہیں دیا جبکہ اس سے تجارت بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب تک چین اسامہ بن لادن کی جگہ نہیں لیتا۔ امریکی اسامہ کا قضیہ زندہ رکھیں گے۔ حالانکہ طالبان صلح جو لوگ ہیں۔ انہوں نے اسامہ کے مسئلے کے حل کے لیے نہایت قابل عمل تجاویز پیش کی ہیں لیکن امریکہ نے انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اس لیے کہ امریکی افغانستان میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکائے رکھنا چاہتا ہے۔

افغانستان پر پابندیوں کی آڑ میں امریکہ پاکستان کا بازو بھی مروڑنا چاہتا ہے۔ (پاکستان پر ہاتھ ڈالنے کا یہ معقول بہانہ ہو سکتا ہے۔)

افغانستان اور پاکستان میں غلط فہمیاں پیدا کر کے دونوں کو باہم دست و گریباں کرنا بھی ایک مقصد ہے۔ جس سے صرف افغان قوم کو ہی نقصان نہیں ہوگا بلکہ پاکستان کو بھی سخت خسارہ ہوگا۔ ہماری مغربی سرحد غیر محفوظ ہو جائے گی۔ بھارت کو فائدہ ہوگا اور کشمیر کی تحریک کو نا قابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ دونوں ممالک میں جہاد ختم کرنا ہے۔ پاکستان میں ابھرنے والے جذبہ جہاد اور ایٹمی صلاحیت نے مل کر پاکستان کو غیر معمولی قوت میں ڈھال دیا ہے ان دونوں قوتوں کو ختم کرنا امریکی ہدف ہے۔ لہٰذا صرف افغانستان ہی ظالمانہ پابندیوں کا نشانہ نہیں۔ پاکستان پر بھی ان پابندیوں کا براہ راست اثر ڈالنا مقصود ہے۔

افغانستان اور پاکستان کو جدا کرنے والی ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف قبائلی آباد ہیں۔ انگریزوں نے اس سرحد کو بند کرنے کے لیے پوری ایک صدی تک کوشش کی۔ فارورڈ پالیسی کے تحت وانا، خیبر، رزمک اور دروش وغیرہ میں چھاؤنیاں قائم کیں لیکن ناکام رہے۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے سب سے پہلے ان چھاؤنیوں میں سے فوج کو واپس بلایا۔ انگریز نے شیر کی خالہ بن کر امریکہ کو اس خطے کو زیر دام لانے کے تمام گر بتائے۔ یہ بھی ضرور بتایا ہوگا کہ افغان قوم نا قابل تسخیر قوم ہیں لیکن امریکی غرور تکبر کی وجہ سے ان پر توجہ نہیں دے رہے۔ روس افغانستان آیا تو اس نے اس سرحد کو بند کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ناکام رہا۔ اب اگر

امریکہ کا یہ خیال ہے کہ وہ اس سرحد کو بند کر لے گا۔ تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ تاہم پاکستان اور قبائل میں نفرت پیدا کر کے منفی مقاصد کی تکمیل ممکن ہے۔

افغانستان نے امریکہ کے سامنے جھکنے سے صاف انکار کر کے واضح پالیسی اپنا لی ہے۔ اب امریکہ پاکستان کو افغانستان کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ کام وہ مرحلہ وار کرنا چاہتا ہے پہلے مرحلے میں وہ تیار شدہ چارج شیٹ کے ذریعے پاکستان کو بلیک میل کیا جائے گا کہ اگر ہمارے اشاروں پر نہیں ناچو گے تو تمہارا حشر عراق جیسا ہوگا۔ اگلے مرحلے پر ہماری ایٹمی تنصیبات پر حملہ کیا جا سکتا ہے پھر امریکہ چیدہ چیدہ مدارس کو دہشت گردی کے الزام میں نشانہ بنا سکتا ہے۔

جہاں تک مانیٹرنگ ٹیموں کی تعیناتی کا سوال ہے یہ بھی پاکستان کے لیے ایک پھندا بنایا گیا ہے پاکستان اگر مانیٹرنگ ٹیموں کو قبائلی علاقوں میں جانے کی اجازت دے گا تو اس سے پاکستان کا قبائل سے تصادم ناگزیر ہوگا۔ قبائلیوں میں پہلے ہی یہ خیال گردش کر رہا ہے کہ پاکستان اس روایتی نظام کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ مانیٹرنگ ٹیموں کا دائرہ کار بڑا وسیع ہے۔ منی لانڈرنگ، اسلحے کی ترسیل اور منشیات سمیت وہ ہر معاملے میں مداخلت کریں گے۔ منی لانڈرنگ کی آڑ میں وہ ہمارے بنکوں کو کھنگالتے پھریں گے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے سی ٹی بی ٹی کی آڑ میں انہیں انسپکشن کے جو مواقع نہیں ملے تھے اب وہ اس طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے انسپکٹر اپنا کام محدود نہیں رکھتے بلکہ ہر جگہ اپنا منہ مارتے ہیں۔ یہ انسپکٹر جمع شدہ معلومات کسے دیں گے یہ کوئی راز نہیں۔

افغانستان پر پابندیوں کے ساتھ ہی یہ خبر بھی امریکی اخبارات کی زینت بنی کہ چین پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی دے رہا ہے۔ چین نے اس کی فوراً تردید کر دی۔ تاہم یہ خطرہ ابھی موجود ہے اس کی آڑ میں درہ خنجراب کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ یا شمالی علاقہ جات میں بھی انسپکٹر تعینات کر دیے جائیں۔ اس سے پاکستان اور چین کے درمیان تناؤ پیدا ہو سکتا ہے۔

افغانستان پر پابندیوں کے ساتھ ہی یہ خبر بھی امریکی اخبارات زینت بنی کہ چین پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی دے رہا ہے۔ چین نے اس کی فوراً تردید کر دی۔ تاہم یہ خطرہ ابھی موجود ہے اس کی آڑ میں درہ خنجراب کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ یا شمالی علاقہ جات میں بھی انسپکٹر تعینات کر دیے جائیں جائیں۔ اس سے پاکستان اور چین کے درمیان تناؤ پیدا ہو سکتا ہے۔

افغانستان پر پابندیاں لگا کر اور مانیٹرنگ ٹیموں کی تعیناتی سے امریکہ نے نہایت گہری چال چلی ہے۔ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے پاکستان حکومت وعوام اور اہل دانش کو مل کر کام کرنا ہوگا قوم متحد ہو جائے اور ہمارے دوست ہمارا ساتھ دیں تو امریکی ریشہ دانیاں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ یہاں میں چند ضروری اقدامات کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔

ا۔ نہایت خوش آئندہ بات ہے کہ ملک کی تمام قابل ذکر دینی جماعتوں نے متحدہ موقف اپنایا ہے۔ ۱۹ اگست کو 36 دینی جماعتوں کے نمائندے دفاع افغانستان سیمینار میں موجود تھے لیکن اس مسئلے کا حل ہمیں افغانستان تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس میں پاکستان کے مفاد کے پس منظر میں دیکھنا ہوگا

اس لیے کہ ان پابندیوں کا حتمی ہدف پاکستان ہی ہے۔ 26 اگست کو اسی طرح کا ایک اور سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔ توقع ہے اس میں بھی ملک کی تمام دینی جماعتیں شریک ہوں گی اس کے علاوہ نمائندہ قبائلی جرگہ بھی شامل ہوگا۔ اس لیے کہ وہ ان پابندیوں کا لازمی ہدف ہے انہیں مطمئن کرنا ضروری ہے۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اس کام میں رکاوٹ نہ ڈالے بلکہ ان کوششوں کی معاون بنے۔

۲۔ اس مرحلے پر ایران کو اعتماد میں لینا اور اسے صورت حال کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ کرنا بھی ضروری ہے ایک وسیع البنیاد وفد ایرانی بھیجا جائے جو ایران قائدین کو سمجھائے کہ پاکستان اور افغانستان کے دیوار کے ساتھ لگنے کے بعد ایران کی باری آئے گی۔ وہ تو پہلے ہی ''دہشت گردوں'' کی لسٹ میں شامل ہے۔ اس لیے ایران کو اس ساری سازش کی تہہ میں اُتر کر سوچنا چاہیے۔

۳۔ اس وقت چین امریکہ مخالف قوت کے طور پر ابھر رہا ہے۔ امریکہ نے اسے ہدف بنانا شروع کر دیا ہے چنانچہ بھارت کی ناز برداری بھی اسی چین دشمنی کا نتیجہ ہے۔ ہمارے لیے چین کے ساتھ تعلقات بنا سنوار کر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ چین کو بھی اس صورت حال کا ادراک ہونا چاہیے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اگر پاکستان کے ساتھ کوئی واردات ہو جاتی ہے اسے ایٹمی صلاحیت سے محروم کر دیا جاتا ہے یا اسے افغانستان سے نبرد آزما کر دیا جاتا ہے تو اس سے چین کو بھی خسارہ ہوگا اس لیے چینکو خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔

۴۔ طالبان اور شمالی اتحاد دونوں جانتے ہیں کہ باہر انہیں لڑانے کی کوشش کسی نیک مقصد کے لیے نہیں کی جا رہی اس لیے انہیں خود پہل کر کے اس مسئلے کو حل کرنے اور باہمی صلح صفائی کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ کو عالمی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے خصوصاً عالم اسلام کو مشترکہ مفاد کی خاطر متحد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ افغانستان ساری اسلامی دنیا کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے اسلامی دنیا میں وفود بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مل بیٹھ کر معاملات طے پا جائیں۔

۵۔ پاکستانی قوم کو بھی اقوام متحدہ کی آڑ میں امریکی خطرات اور مضمرات سے آگاہ رہنا چاہیے اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے متحدہ یک جان ہونا چاہیے۔ ہمیں واضح کر دینا چاہیے کہ ہم اس مسئلے پر کسی سے کوئی ڈکٹیشن نہیں لیں گے۔ لیکن یہ بات لازم ہے کہ پوری قوم متحدہ یکجان ہو۔

# امریکہ نہیں، چائنا

1947ء میں پاکستان پیدا ہوا اور دو سال بعد 1949ء میں چائنا ہم عمر پڑوسیوں میں دوستی کا بے مثال رشتہ قائم ہے۔ دونوں کل بھی ایک دوسرے کی ضرورت تھے اور آج بھی۔ دونوں کے ایک دوسرے پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ 1949ء میں انقلاب کے بعد چائنا بھری دنیا میں تنہا تھا۔ امریکہ اور روس سمیت کوئی ملک چائنا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کو تیار نہ تھا۔ اس شدید تنہائی کے زمانے میں پاکستان نے چائنا کا ہاتھ تھاما اور یہی نقطہ آغاز تھا اس دوستی کا جو آج تک قائم ہے۔ حکمرانوں کے علاوہ چائنا کے عوام کو بھی اس کا احساس تھا پوری دنیا میں صرف پاکستان ہی واحد ملک ہے جو چائنا کی طرف داری کر رہا ہے اس بات نے چینی عوام کے دلوں میں پاکستانیوں کی محبت پیدا کر دی۔ اس کا ثبوت یہ ہے جب جنرل ایوب خان پہلی دفعہ چائنا گئے تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا، لگتا تھا جیسے ان کے استقبال کے لیے پورا چائنا ہی امڈ آیا ہو مسٹر بھٹو اس وقت وزیر خارجہ تھے پاک چائنا تعلقات کے ابتدا کا زیادہ کریڈٹ انہیں کو جاتا ہے۔ پاکستان مشکل وقت میں چائنا کا سہارا بنا تو جواباً چائنا نے بھی مشکل وقت میں پاکستان کو تنہا نہ چھوڑا 1965ء میں چائنا نے پاکستان کی کھل کر مدد کی اگرچہ اس سے پہلے 1962ء میں پاکستانی حکومت سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی تھی جس سے چائنا کو نقصان پہنچا تھا اور خود پاکستان کو بھی ہوا، کچھ یوں تھا کہ 1962ء کی چائنا بھارت لڑائی میں چائنا کی فوج نے اکسائی چن پر قبضہ کر لیا۔ چینی فوج مزید پیش قدم کر رہے تھی کارگل اس وقت ہمارے قبضے میں تھا۔ انڈیا کے لیے ساری سپلائی کا راستہ یہیں سے گزرتا تھا اگر پاکستان یہ راستہ روک لیتا تو بھارت کے لیے شدید مشکلات پیدا ہو جاتیں لہٰذا اس وقت کے امریکی سفیر نے ایوب خان کو کہا کہ آپ ہندوستان کا راستہ نہ کاٹیں تاکہ وہ چائنا کے سامنے مزاحمت کر سکے۔ پاکستان نے امریکہ کی بات مان لی اور اپنا جھکاؤ امریکہ کی طرف ظاہر کر دیا۔ یقیناً ہم سے یہ ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ یہ وہ سنہری موقع تھا جب ہوم چائنا کے باوفا دوست ہونے کا ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ کشمیر بھی آزاد کروا سکتے تھے مگر ہم نے امریکہ کی بات مان کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ اس واقعہ کے بعد اگرچہ چائنا کی ترجیحات تبدیل ہو گئیں تاہم دوستی کا سفر جاری رہا۔ 1962ء میں ہی جب ہم نے چائنا کے ساتھ بارڈر کا مسئلہ حل کیا تو اس وقت ہم نے جو کچھ کہا چائنا نے تسلیم کر لیا۔

چائنا میں امریکہ اور یورپ کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ چائنا کے بچے اور فوجی انکل سام اور لنڈن بن مانس کی تصویریں لٹکا کر ان پر نشانہ بازی کیا کرتے تھے۔ 1969ء میں امریکہ احساس ہوا چائنا کو نظرانداز کرنے کی پالیسی درست نہیں کیونکہ چائنا کو تنہا کرنے سے چینی قوم میں امریکہ اور یورپ کے خلاف

نفرت کے جذبات بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ مغرب کے متعصبانہ سلوک نے چینی قوم میں مزید بیداری پیدا کر دی تھی لہٰذا امریکہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ چائنا کو نظر انداز نہیں کر سکتا انہیں غالباً یاد آیا نپولین نے کہا تھا:

Let China sleep, when it wakes up the world will be sorry چنانچہ چائنا سے رابطہ بحال کرنے کا فیصلہ کیا گیا رابطے کے لیے پاکستان کو ذریعہ بنایا گیا۔ 1969ء میں ہنری کسنجر پاکستان کے دورے پر آئے۔ پاکستان پہنچ کر ان کی طبیعت خراب ہو گئی انہیں آرام کے لیے نتھیا گلی ٹھہرایا گیا۔ جہاں سے راز داری کے ساتھ انہیں چائنا بھیج دیا گیا بیماری کا بہانہ اس دورے کے لیے بنایا گیا تھا۔ چائنا میں ہنری کسنجر کی وزیراعظم چوائن لائی کے علاوہ باقی لیڈروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر بھی پاک چائنا دوستی کا خوبصورت مظاہرہ دیکھنے میں آیا جو چوائن لائی نے ہنری کسنجر سے کہا۔

Mr. Kessenger don't forget the bridge over which you have walked and come to meet us. چوائن لائی کا یہ جملہ ان کی پاکستان سے محبت ظاہر کرتا ہے۔ چائنا نے دراصل صرف پاکستانی حکمرانوں سے تعلق قائم نہیں کیا بلکہ وہ پاکستانی عوام کے دلوں میں بھی اُترے۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے جبکہ چائنا کے کیمونسٹ مذہب کے اس فرق کے باوجود پاکستان کے عوام چاہے وہ کسی بھی جماعت یا مسلک سے تعلق رکھتے ہوں چائنا سے محبت کرتے ہیں اور اسے اپنا حقیقی دوست سمجھتے ہیں ابتدا چائنا کو تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا اس کے پاس سیکورٹی کونسل کی سیٹ تھی نہ ویٹو پاور تاہم پاکستان نے ہر جگہ اور پلیٹ فارم پر چائنا کی تائید وحمایت کی جواب میں چائنا نے پاکستان کے لیے قراقرم ہائی وے تعمیر کی۔ قراقرم فائیٹر کی تیاری میں بھی چائنا نے تعاون کیا دونوں ممالک مل کر ایک جیٹ ائیر کراف بنا رہے ہیں۔ ٹینک فیکٹری چائنا کے تعاون سے ہی لگی ہے۔ بلوچستان سے معدنیات نکالنے کے لیے انہوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا اس کے علاوہ انہوں نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا جو شاید یہاں بیان کرنا مناسب نہیں اس دوطرفہ دوستی میں پاکستان نے چائنا کو گوادر تک رسائی کا موقع فراہم کیا۔ جس گوادر تک پہنچنے کے لیے روس خواب دیکھتا دیکھتا اپنے منطقی نتیجے کو پہنچ گیا۔ مندرجہ بالا سارے واقعات سے پتہ چلتا ہے چائنا اور پاکستان ایک دوسرے کے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں اور اس دوستی کے سفر میں ان دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا تعاون کیا تاہم ان سب کچھ کے علاوہ چائنا اور پاکستان میں ایک اور ایسا تعلق موجود ہے جس سے سارا مغرب پریشان ہے کیونکہ یہ تعلق مستقبل میں دنیا کی سیاست میں بنیادی کردار ادا کریگا۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا اس لیے مغرب نے کبھی پاکستان کو پسند نہیں کیا۔ اس کے برعکس چائنا پاکستان کو پسند کرتا ہے اور اس نے کبھی مذہبی تعصب کا اظہار نہیں کیا۔ چین نے مغربی مشنریز کی طرح کبھی اپنے نظریات پاکستانی عوام میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دونوں ملکوں کے عوام اپنے نظریے اور عقیدے پر رہتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب ہیں اور ایک دوسرے کے لیے محبت کے گہرے جذبات رکھتے ہیں۔ مغربی مفکرین اس صورتحال کا گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچے ہیں اسے ایس پی ہنٹنگٹن نے اس انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' میں کہتا ہے مستقبل میں، سلامک تہذیب اور کنفیوشس تہذیب

باہم مل کر یہودی اور عیسائی تہذیب کے مقابلے پر آئے گی یہ ایک نیا تھیسس (thesis) ہے جسے سامنے رکھ کر ساری دنیا کا نقشہ بن رہا ہے۔ امریکہ کی خواہش ہے بدھ مت کے پیروکاروں اور مسلمانوں کو اکٹھا نہ ہونے دیا جائے کیونکہ ان دونوں کے ملاپ سے جو قوت وجود میں آئے گی امریکہ اور یورپ اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ امریکہ اس نے تھیسس (thesis) کو سامنے رکھتے ہوئے دو کام کرنا چاہتا ہے۔ ایک مسلمانوں سے جذبہ جہاد ختم کر دیا جائے، جہاد کو دہشت گردی کا نام دے کر بدنام کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کی ابھرتی ہوئی خواہش ختم کی جا سکے۔ دوسرا چائنا کو مسلم ممالک سے کاٹ دیا جائے۔ گلگت کے واقعات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ مستقبل قریب میں ہمیں امریکہ اور چائنا میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ہم بیک وقت دونوں کے ساتھ نہیں چل سکیں گے اور حقیقی بات یہی ہے امریکہ کے ساتھ ہم نہیں چل سکتے۔ اس لیے ہمیں امریکہ سے ہٹ کر چائنا سے جڑنا پڑے گا اور یہی ہمارے مفاد میں ہے۔ تاہم اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ مستقبل کے حالات اور اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر جس طرح ہمیں چائنا کے ساتھ گہرا تعلق قائم کرنا چاہیے تھا وہ ہم نہیں کر سکے۔ جب میں آئی ایس آئی کا سربراہ تھا تو میں نے بہت اصرار کیا کہ ہمیں چائنا کے ساتھ ایسے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے جو Longlasting ہوں۔ میری تجویز تھی ہم اکٹھے Chamber of comerce بنائیں۔ باہمی تجارت کو فروغ دیں اکٹھی فوجی مشقیں کریں مگر افسوس ایسا نہ کیا گیا۔ چینی اکثر بدھسٹ ہیں اور بدھ ازم کی پرانی یادگاریں اور عبادت گاہیں پاکستان میں دیگر علاقوں کے علاوہ ٹیکسلا، مانسہرہ اور انڈس کوہستان میں واقع ہیں۔ اگر ہم اس طرف توجہ دیتے اور چینی عوام تک ان مقامات کی معلومات پہنچاتے تو سیاحت کے حوالے سے اچھی خاصی تجارت ہو سکتی تھی۔ ٹیکسلا میں ہم بدھسٹ یونیورسٹی قائم کر دیتے جہاں چائنا کے طلباء تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے اور یہاں ہم بدھسٹ کونشن کا اہتمام کرتے تو ہمارے تعلقات میں توانائی آجاتی مگر ہم نے ایسا بھی نہیں کیا۔ قراقرم شاہراہ بنی کتنے پاکستانی فوجی شہید ہوئے کتنے چینیوں نے اپنی جانیں دیں مگر آج تک اس شاہراہ پر کتنی تجارت ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں اس شاہراہ کی دیکھ بھال پر جتنا خرچہ آتا ہے وہ بھی پورا نہیں ہو پا رہا۔ میں کہتا ہوں جب ہم چائنا کے ساتھ دوستی کی بات کرتے ہیں اور یقیناً یہ ہماری ضرورت بھی ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کو ایک ادارتی شکل نہیں دیتے۔ میں کہا کرتا ہوں ہمیں مغرب کی طرف دیکھنے کی بجائے مشرق کی طرف نظر کرنی چاہیے۔ میں اسے Look East Policy کہتا ہوں۔ اگر ہم اس پالیسی کو اپنا کر چائنا کے ساتھ قدم بہ قدم چلے ہوتے تو آج معاشی طور پر اور صنعتی ترقی کے حوالے سے چائنا سے پیچھے نہ ہوتے۔ مغرب پر آس لگائے رکھی جس کا ہمیں کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اگر کبھی امریکہ نے ہماری مدد کی بھی اپنے مفادات اور اپنی غرض کے لیے جبکہ چائنا نے ہمیشہ بے لوث ہو کر ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ میرے خیال میں ہماری Look East Policy جو کامیاب نہیں ہو رہی اس کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ وہ وجہ یہ کہ ہماری حکومتوں میں اور پالیسی ساز اداروں میں ہمیشہ ان لوگوں کا قبضہ رہا ہے جو وڈیرے، جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں۔ ان کے اپنے ذاتی مفادات امریکہ سے وابستہ ہیں ان کے بچے وہاں پڑھتے ہیں ان کے لباس وہاں سے آتے ہیں، ان کے فلیٹس وہاں ہیں۔ ان میں سے اکثر کی

اپنی تعلیم وہاں کی ہے۔ یہ زبان ان کی بولتے ہیں لہٰذا ان کا جھکاؤ ہمیشہ امریکہ کی طرف رہا ہے اور رہے گا۔ اس لیے کہ یہ امریکہ کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتے اور نہ ہی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں جب تک یہ مراعات یافتہ طبقہ حکومت میں موجود رہے گا ہم امریکہ کی غلامی سے نہیں نکل سکتے۔ قومی مفادات کو سامنے رکھ کر فیصلے کرنے کے لیے جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جو جوان میں ہے ہی نہیں۔ میرے خیال میں ہمیں فیصلے کرنے چاہئیں۔ چائنا کو بھی معلوم ہے پاکستان اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لیے ان سے مل کر ایک بلاک بنانے کے لیے اور بحیثیت ایک سپر پاور کے اپنی ساکھ بنانے کے لیے اسے پاکستان کا تعاون درکار ہے۔ اسی طرح ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بھی طے ہے کہ ہمیں بھی چائنا کی ضرورت ہے لہٰذا پہلے سے موجود تعلقات کو اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس تصویر میں جتنا بھی رنگ بھرا جائے اتنا ہی کم ہے۔

# دھماکے غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہیں

## (روزنامہ امت، کراچی 5 ستمبر 2007ء بروز بدھ)

راولپنڈی میں ہونے والے یہ دھماکے نہایت افسوسناک ہیں اور لگتا ہے کہ حکومت کی اختیار کردہ پالیسیوں کے نتائج برآمد ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جب ہم بے سمت ہو جائیں تو کوئی بھی شخص ہمارے ساتھ واردات کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ ان واقعات میں ہمارے ازلی دشمنوں کے کردار کے امکان سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ امریکہ نے ہماری پشت پر اسرائیل اور بھارت کو افغانستان میں لا بٹھایا ہے۔ وہ محض بے کار تو نہیں بیٹھے ہوئے ہیں، وہ کام کر رہے ہیں۔ وہ پاکستانیوں کے جذبات کو بھڑکا کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں تو وہ ایسا ضرور کریں گے کیونکہ مخالف انٹیلی جنس ایجنسیوں کا یہی ایک طریقہ واردات ہوتا ہے کہ وہ اپنا کام دوسروں سے لیں۔ اس واقعے میں وہ بھی ملوث ہو سکتے ہیں۔

دوسرا امکان انتقامی کارروائیاں کا بھی ہو سکتا ہے۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے سانحے کا شاخسانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں کے بچے اس سانحے میں جاں بحق ہوئے ہیں تو وہ انتقامی کارروائی کریں گے۔ یہ انتقامی کارروائی بھی ہو سکتی ہے لیکن مجھے ان واقعات کے پیچھے ایک خاص سازش کارفرما نظر آتی ہے جس کے لیے ہمیں اردگرد کے واقعات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ جیسا کہ جارج بش نے کل ہی کہا کہ میں نے ایران پر حملے کے لیے فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔ امریکی منصوبہ یہ ہے کہ وہ ایران پر تین دن حملے کریں گے۔ ان حملوں کے دوران وہ 1200 مقامات کو نشانہ بنائیں گے۔ ان تفصیلات کے ساتھ امریکہ نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا ہے۔ احمد نژاد نے امریکی صدر کو جواباً کہا ہے کہ وہ حملہ نہیں کر سکیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ایران کے علاوہ یہ تیاریاں کسی اور کے لیے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں امریکہ اور اسرائیل کو اگر کسی ملک سے چیلنج کا خطرہ ہے تو وہ ایران نہیں ہے اس کے ایٹمی طاقت بننے میں ابھی بہت وقت ہے۔ لہٰذا ان کو اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ پاکستان سے ہے اور وہ بار بار پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ محفوظ ہاتھوں میں نہیں ہے جن کو تم محفوظ ہاتھ کہتے ہو۔ اور یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جن ہاتھوں میں آج پاکستان کا ایٹمی اثاثہ ہے وہ غیر محفوظ اور کمزور ہو گئے ہیں۔ جی ایچ کیو کے قریب یہ واردات امریکی عزائم کو آگے بڑھائے گی۔ وہ پھر واویلا کریں گے کہ جی ایچ کیو تک محفوظ نہیں ہے اس لیے ایٹمی ہتھیار بھی خطرے میں ہیں۔ وزیرستان میں اور دوسری جگہوں پر جب واقعات کو ملا کر دیکھا جاتا ہے تو دنیا کو وہ شاید باور کرانے میں کامیاب بھی ہو جائیں گے کہ پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت کا ہونا غلط ہے اور اسی لیے یہ سازشیں ہمیں ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنے

کے لیے کی جا رہی ہیں۔ ان کا یہ ایک مقصد ہوسکتا ہے۔
دوسرا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ فوج کو عدم استحکام کا شکار کرنا۔ گویا ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فوج اور عوام کو آپس میں لڑانا اور جب تک فوج ادارے کے طور پر مضبوط اور منظم ہے تو وہ ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایٹمی صلاحیت بھی ہے لہٰذا پاکستان کو تقسیم در تقسیم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مخاصمت کی صف آرائی کر کے پاکستان کے اندر ہی قوم کو تقسیم کر دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو قوم کو تقسیم کرنے کے کئی منصوبے نظر آتے ہیں۔ روشن خیالی اور انتہا پسندی کی تقسیم، مسٹر اور ملا کے درمیان تقسیم، اپنے ہی لوگوں پر چڑھ دوڑنا، کبھی بلوچستان میں جا کر آپریشن کر ڈالنا، کبھی وزیرستان، لال مسجد کا سانحہ۔ اس پر یہ دعوے کہ ہم نے اچھے اچھے کام کیے۔ 8 برس کی حکومت میں کچھ نہ کچھ کام ہو ہی جاتے ہیں لیکن ہمارے ملک کی قسمت داؤ پر لگ گئی ہے۔ لہٰذا صدر صاحب سے یہی گزارش ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور اپنی سلامتی کو مدنظر نہ رکھیں بلکہ ملک کو بچانے کی فکر کریں، جس طریقے سے ہمارا معاشرہ بکھر رہا ہے اسے روکنا ہے کیونکہ ملک تو برقرار رہے گا، انشاء اللہ اس کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ یہاں وہ عناصر موجود ہیں جو اس ملک کی سلامتی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال وکلاء کی تحریک ہے۔ اب اے پی ڈی ایم میں جس طریقے سے قوم پرست جماعتیں ملکی استحکام کے لیے جمع ہوگئی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کو کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ ان جماعتوں کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ آخر پاکستان پر عمل کیا جائے، عدلیہ کو آزاد کیا جائے اور حصول انصاف ہر ایک کی پہنچ میں ہو لیکن سرکاری سطح پر جس طرح سے تقسیم کی جا رہی ہے۔ اس سے معاشرے کے بکھرنے کا بہت اندیشہ ہے۔ معاشرے کی اس ابتری کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اب صدر صاحب رخصت ہو جائیں۔ فوج جا کر اپنا کام کرے اور سیاستدان اپنا کام کریں۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ فوج اپنے لوگوں کے ساتھ لڑ کر کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔ صدر صاحب اب فوج کو بھی بچائیں، عدلیہ کو بھی آزادی کریں، الیکشن کرائیں اور اس کے نتیجے کے طور پر ایک قومی حکومت بنائیں۔ ان انتخابات میں جو بھی جماعت کامیاب ہو وہ قومی حکومت کا حصہ بنے۔ اس وقت ہم پاکستان ایک نادیدہ جنگ لڑ رہے ہیں اور ہمیں اسباب کا ادراک ہونا چاہیے اور ہمیں اس کے لیے ایثار کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ہمارے حکمرانوں کو، ان طبقات کو جو اپنی مراعات کے ساتھ ہی ہیں۔ ملک کے بغیر یہ مراعات اور مفادات نہیں ہوسکتے۔ ملک میں ہر طرف کنفیوژن پھیلا ہوا ہے۔ دوسری جانب ڈیل اور مزید ڈیل کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے نواز شریف صاحب کی باتوں پر حیرانی ہوئی کہ انہوں نے سی این این سے گفتگو کرتے ہوئے اسی روایتی دہشت گردی کی بات کی حالانکہ دنیا بھر میں اور ہمار یہاں بھی صرف امریکہ کی دہشت گردی ہے۔ امریکی جارحیت کی وجہ سے دنیا بھر کا امن خراب ہے۔ امریکہ کا دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے، اپنے خیال، اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنے کی تمنا کی وجہ سے خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ ہماری خواہش یہی ہے کہ کوئی تو ایسا ہو جو امریکہ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر یہ کہے کہ جناب بہت ہو گیا اب ہم مزید اپنا گلا نہیں گھونٹ سکتے۔ ہم اپنے بچوں کو نہیں قتل کر سکتے۔ جو آپ کی اصطلاحیں ہیں انہیں ہم قبول نہیں کر سکتے تب ہی ملک کے اندر معاملات درست ہوں گے۔ ہمیں خوفزدہ کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہوگا ہم پر بیتے گی، ہم دیکھ لیں گے۔ امریکہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم خوف کی

حالت میں مرتے چلے جا رہے ہیں: ہمارا خون نچوڑا جا رہا ہے۔

یہ بم دھماکے ہماری انٹیلی جنس کی بھی ناکامی ہے لیکن جب شہری آزادیوں کو ختم کر دیا جائے تو وہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا اور انٹیلی جنس کو جس طرح بے دردی اپنے ہی لوگوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہیں نہ کہیں خلا تو رہ جائے گا۔ ہمارے جیسے ملک کے پاس اتنے ذرائع اور وسائل نہیں ہوتے کہ ہر معاملے پہ نظر رکھ سکیں۔ انٹیلی جنس اداروں کو اپنا کام کرنے دیں۔ فوج کو اپنا کام کرنے دیں۔ اس گرمی کو اب ٹھنڈا کرنے کی ضرورت ہے اور انٹیلی جنس اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ انٹیلی جنس اداروں کے سیاسی کردار کو اب ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اب ہمارے سامنے ایک بہت بڑا چیلنج آ گیا ہے۔

# زلزلے کی تباہ کاریاں اور تعمیر نو کے تقاضے

چالیس دن پہلے پاکستان کے شمال مغرب میں آنے والا زلزلہ بہت ہولناک تھا۔ اس نے اٹھائیس ہزار مربع میل کے علاقے میں خوفناک تباہی پھیلائی لیکن یہ تباہی کی راکھ سے موقع اور امکانات بھی ضرور برآمد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تاہم آگے بڑھنا اسی صورت میں مفید ثابت ہوتا ہے جب غلطیوں کا ادراک کیا جائے اور درست سمت اختیار کی جائے۔ مجھے اس حقیقت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عظیم آفت ہمارے اعمال کا شاخسانہ ہے۔ جزا اور سزا کے لیے اللہ کا نظام مقرر ہے جو حرکت میں آرہا ہے۔ قرآن پاک میں جا بجا ایسی تنبیہات دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کی زد میں صرف ہم نہیں دیگر اقوام بھی ہیں، تاہم اس عظیم آفت کے بعد اہل اسلام کو جان لینا چاہیے، ان کے بہت سے معاملات درست نہیں، ان کو درست کرنا ضروری ہے۔

## عوام کی بیداری، نظام کی ناکامی

یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی ہوگی کہ ایک وسیع و عریض علاقے میں بے حد و حساب تباہی سے نمٹنا پاکستان جیسے ملک کی صلاحیتوں سے باہر ہے۔ پاکستان ہی نہیں، امریکہ کو دیکھ لیں، کیترینا طوفان کے سامنے وسائل سے بھرا ہوا یہ ملک بھی بے بس دکھائی دیا۔ تاہم جہاں ریاستوں اور حکومتوں کا نظام منظم ہے، وہاں ایسی صورت حال سے بہتر انداز میں نمٹا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے پاکستان کو تین عناصر بروئے کار لانے کی ضرورت تھی۔

1- قیادت کے بروقت اور درست فیصلے

2- ریاستی مشینری کا فعال، باصلاحیت اور دردمند ہونا۔

3- عوام کی حمایت و امداد ............ جس میں عوام کے دلوں سے نکلنے والی دعائیں کروڑوں، اربوں کے عطیات اور جسمانی مشقت سب شامل ہیں۔

اگر کسی ملک میں یہ تین صلاحیتیں اور خوبیاں پائی جائیں تو وہ اس طرح کی صورت حال سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتا ہے، لیکن ہم نے ان میں سے کسی نہ کسی حوالے سے کمزوری دکھائی۔ البتہ اس زلزلے سے دو سچائیں نمایاں ہو کر سامنے آئیں۔ اول یہ کہ ساری قوم درد سے بے تاب ہو کر مدد کے لیے لپکی۔ قوم کا یہ درد ہمارا لازوال اثاثہ ہے۔ اس وقت بھی کہ عوام صورت حال کی سنگینی سے اچھی طرح بے خبر بھی نہیں ہوئے تھے، ان کی چھٹی حس بیدار تھی، وہ قبل از وقت ہی متاثرین کی مدد کے لیے دوڑ پڑے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں

اس واقعے کی سنگینی اور وسعت کا ادراک پیدا کر دیا تھا۔ حالانکہ حکومت کے کارندے قدرے غفلت میں مبتلا رہے، وہ اسے ایک معمولی تباہی سے تعبیر کرتے رہے اور مارگلہ ٹاور تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔

یہ حیرت انگیز تضاد قابل غور ہے کہ عوام الناس کا احساس بیدار تھا، اس لیے وہ تو چند گھنٹے کے اندر تباہ حال بھائیوں کی جانی و مالی امداد کو پہنچ گئے، لیکن حکومت کو حرکت میں آتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ اس زلزلے نے نہ صرف یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ یہ زلزلہ اس خطے کے تیس چالیس لاکھ انسانوں کے لیے ہی تباہ کن ثابت ہوا، بلکہ آزاد کشمیر کے پرانے اور صوبہ سرحد کے نئے ضلعی نظام کے لیے بھی ہلاکت خیز رہا۔ یہ دونوں نظام اس زلزلے کی زد میں آ کر بری طرح تباہ ہو گئے۔ ہماری قیادت کی بصیرت بھی اس امتحان میں پوری طرح کامیاب نہ رہی میرے خیال میں اس عظیم قومی تباہی کے بارے میں سود و زیاں کو جانچنے کے لیے فی الفور ایک قومی کمیشن قائم کر دیا جانا چاہیے۔ اب قوم کو خود احتساب کے عمل سے گزرنا اور آگے بڑھنا ہے۔ اس مرحلے پر احتساب کے عمل سے گریز کیا گیا تو ملک و قوم اس کے فوائد سے محروم رہیں گے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا کسی کے بس میں نہیں رہا کہ اس زلزلے نے کسی کو اُٹھا دیا تو کسی کو دبا دیا۔ ایک طرف اس سے ہزاروں افراد زندہ درگور ہو گئے اور ہمارا فرسودہ نظام جھاگ کے بے حقیقت بلبلوں سے زیادہ حقیر ثابت ہوا، تو دوسری طرف اس نے پوری قوم کو پہاڑ کی طرح کھڑا کر دیا۔ اس کے اندر جذبوں کا طوفان برپا کر دیا...... اب یہ قیادت کا امتحان ہے کہ وہ قوم کے اس قیمتی جذبے کو تعمیر نو کے کام میں کس طرح استعمال کرتی ہے؟ یہ قوم سازی کا موقع ہے جو قیادت کی ذمے داری ہے۔

## قوم اور فوج کی یکسوئی ناگزیر

اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہیے تھا کہ متاثرہ علاقوں میں پہلے سے موجود فوجی یونٹیں معطل ہو کر رہ گئی تھیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے باہر سے لوگوں کو آنا چاہیے تھا، وہ آئے مگر بہت تاخیر سے۔ اس نقصان کے ازالے کے لیے ضروری تھا کہ فوج عوام کے ساتھ مل کر کام کرتی تاکہ عوام کا جذبہ بھی زندہ رہتا اور عوام اور فوج کا امیج بھی بہتر ہوتا۔ قوم کو متحد کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں کیا گیا۔ اپوزیشن کو اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ میں اس اپوزیشن کی اسٹیرنگ کمیٹی کا رکن ہوں۔ آٹھ اکتوبر کو ہمارا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت پر کوئی تنقید نہیں کی جائے گی اور فیلڈ میں جا کر پورے جذبے سے کام کیا جائے گا۔ حالانکہ اس وقت پوری طرح سے اطلاعات بھی نہیں ملی تھیں۔ یہ حزب اختلاف کا ایک احسن فیصلہ تھا، جس میں قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن، مخدوم امین فہیم، حافظ محمد سعید، اقبال ظفر جھگڑا، عمران خان، چوہدری نثار علی خان اور راجہ ظفر الحق سمیت تمام قابل ذکر قیادت موجود تھی۔ سب نے متحد ہو کر فیصلہ کیا کہ حکومت سے ریلیف کے کام میں بھرپور تعاون کیا جائے گا، لیکن بدقسمتی سے اس پیش کش کا مثبت جواب نہیں ملا۔ پرکشش لفظی دعووں سے بڑھ کر کوئی عملی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اس عظیم سانحے پر پوری قوم تڑپ اُٹھی، اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ کشمیر واقعی پاکستان کی شہ رگ ہے اور کشمیریوں کو پاکستانی عوام اپنے بہن بھائی تصور کرتے ہیں جب کہ بھارت میں کسی نے اس تباہی پر کانٹا چبھنے کی کسک بھی محسوس نہیں کی اس نے یہ فرق واضح اور ثابت کر دیا کہ کشمیر بھارت کا حصہ نہیں، اس نے زبردستی اس زمین پر قبضہ کر کے اسے اپنا حصہ بنا رکھا ہے۔ جب کہ پاکستانی قوم کشمیریوں کو اپنے وجود کا ناقابل تقسیم حصہ تصور

کرتی ہے۔ اس موقعے پر صوبہ سرحد اور آزاد کشمیر میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ اس مثبت رویے اور اس فطری ردعمل کو دنیا دیکھے اور محسوس کرے۔ بعض کوتاہ بین دانشوروں نے کہا، بھارت نے کچھ نہیں کیا اور پاکستان نے بھی کچھ نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں پاکستان کی عوام کے بے اختیار ردعمل کو نظر انداز کرنا انتہا درجے کی سفا کی ہے۔ اپنے بھائیوں کے غم میں ہمارے کلیجے منہ کو آگئے ہیں۔ اس دردمندی کو نظر انداز کرنا ایک گمراہ کن طرز عمل ہے، اس کا مطلب یہ ہے ایک نیا کھیل شروع ہونے والا ہے۔

## نیٹو کا کردار کیا ہے؟

ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بعض بیرونی طاقتوں کی جانب سے ریاست کشمیر کو نیٹو کا اڈہ بنانے کی کوشش ہوسکتی ہے۔ کھلاڑیوں کا پلان یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس طرح اُبھارا جائے جس سے یہ واضح ہو کہ کشمیری ہندوستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ لیکن ساتھ ہی ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ آزاد کشمیر کے لوگ پاکستان سے بھی متنفر ہو جائیں۔ یہ خاصی پرانی سازش ہے۔ کشمیری پر پاکستان کی حکومت نے جو بعض فیصلے کیے اس سے کشمیریوں کے دل پر چرکے تو لتے رہے۔ لیکن یہاں اگر یہ تاثر دیا جائے کہ پاکستان نے بھی کچھ نہیں کیا تو اس سے خود کشمیر کی تحریک کے لیے بھی بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اس سازش کو صرف کشمیری عوام اور پاکستانی قوم کے ردعمل سے ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف اسلامی این جی اوز کی محبت کا پل اس رشتے کو ٹوٹنے سے بچائے گا۔ ان تنظیموں نے اس میں جو بھرپور کردار ادا کیا وہ لائق تحسین ہے۔ وہ سب سے پہلے متاثر علاقوں تک پہنچے اور وہاں پہنچے جہاں اور کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس کے پاس ریاست جیسی مشینری بھی نہیں تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ جنہیں آپ حقیر سمجھ کر بجھا رہے تھے وہی چراغ جلتے تو روشنی پھیلی۔

مغرب نژاد این جی اوز اس زلزلے میں بری طرح فیل ہوئی خصوصاً خواتین کے حقوق کی تنظیمیں جو عام حالات میں بہت شور وغوغا کرتی اور ملک بھر میں اپنا وجود ظاہر کرتی رہتی ہیں وہ فلاپ ہوگئیں۔ اس زلزلے کے متاثرہ لوگوں میں اکثریت خواتین کی تھی جو نہ صرف بڑے پیمانے پر شہید ہوئیں بلکہ جو زندہ بچ گئیں، اپنے گھروں سے محروم ہوگئیں اور ان کے جگر گوشے بھی ان سے چھن گئے۔ ان کے بیٹے، بیٹیاں، بھائی، ماں، باپ اور خاوند بھی نہ رہے۔ کون سی قیامت ہے جو ان پر نہیں ٹوٹی لیکن مقام حیرت ہے خواتین کے حقوق کی علمبردار تنظیمیں کہیں بھی ان کے دکھ بانٹتی دکھائی نہیں دیتیں۔ ان متاثرہ خواتین کی مدد کے لیے صرف اسلامی سوچ وفکر کی حامل خواتین میدان میں آئیں۔ اس زلزلے پر ملت اسلامیہ کے ردعمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک طرف چھوٹا سا حصہ ہمیں لبرل ازم اور سیکولرازم کا سبق اور اپنی اقدار اور نظریاتی سوچ چھوڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسے لاکھوں شہید ہونے والی خواتین، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کا کچھ بھی غم نہیں ہی۔ دوسری طرف قوم کا سواد اعظم ہے جو اپنی اسلامی سوچ وفکر میں پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہے، وہی اس موقع پر پوری شان سے بروئے کار آیا۔ الخدمت فاؤنڈیشن، الدعوۃ حتیٰ کہ تبلیغی جماعت نے بھی اپنے بھائیوں کے لیے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اگر کشمیر کا پاکستان سے شہ رگ کا رشتہ برقرار رہا تو وہ ان ہی تنظیموں کا مرہون منت

ہوگا۔قوم پوری طرح زندگی کا ثبوت پیش کر رہی ہے لیکن اسے ایک زبردست انقلاب میں ڈھالنے کے لیے قیادت کے لیے قیادت کو اجتماعی اقدام کرنا ہوگا۔اس سلسلے میں مثبت پیش رفت کے لیے میں چند تجاویز پیش کر رہا ہوں جو فوری امداد اور مستقل بحالی میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

☆ بلاشبہ تعمیر نو کا ایک عظیم کام درپیش ہے، لیکن یہ کام بہت احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔متاثرین کی غیرت کو امتحان میں ڈالے بغیر ان کی مشکلات حل کی جائیں، انہیں بھکاری بننے سے بچایا جائے۔ان کو بے گھر اور Displace کرنے کے بجائے پہاڑوں ہی میں بسایا جائے۔میرے خیال میں ایک لاکھ سے زیادہ شہادتیں ہوئی ہیں ان شہادتوں پر دل نہیں ہارنا چاہیے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے بڑا اجر ملے گا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو زندہ ہیں ان کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔ان کو تعمیر میں مدد ملی تو یہ جفاکش اور باہمت لوگ اپنے حالات خود بدل دیں گے۔ان کو چکوال، راولپنڈی یا اسلام آباد لا کر بسانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

☆ متاثرین کی مقام معیشت کو مضبوط بنانا ہماری پالیسی کی بنیاد ہونا چاہئے اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو زندہ ہیں، ان کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔دنیا بھر میں ایسی تباہیوں کے نتیجے میں متاثرین کی معیشت کو سہارا دینے کی ہر موثر ترین کوششیں ہو چکی ہیں، انہیں آزمایا جائے۔اس سارے معاملے میں ایک پہلو بالکل نظر انداز کیا جا رہا ہے اور وہ ہے مقام وسائل کا استعمال، یعنی Local Economy کو اُٹھانا۔مثال کے طور پر بالاکوٹ سے ناراں تک وادی کاغان اور آزاد کشمیر میں نیلم، جہلم اور لوپہ کی وادیاں زرعی معیشت پر انحصار کرتی ہیں۔مکئی، آلبو، چاول اور گندم کی کاشت کے علاوہ مقامی آبادی معیشت کا دارومدار مال مویشی (Live Stock) پر ہے۔اس مرحلے پر ان علاقوں میں مکئی کی فصل بالکل تیار تھی، مکئی نے بہت سے لوگوں کی جانیں بھی بچائیں اور آج بھی نا قابل رسائی علاقوں کے لوگ مکئی کے بھٹوں پر گزارہ کرتے ہیں۔اس کے بعد نئی فصل کاشت کرنا بھی ضروری ہے۔اگر آپ دو برس کاشت نہ کریں تو خطرہ یہ ہوتا ہے کہ زمین مستقلاً بنجر ہو جائے گی۔بارش و برف باری مٹی کو بہا لے جائے گی۔ہمیں ہاتھ سے چلنے والے چھوٹے ٹریکٹر سے گندم جو وغیرہ کی کاشت کے سلسلے میں مقامی تباہ حال لوگوں کو سہارا دینا چاہیے۔چینی ساخت کے ٹریکٹر درآمد کیے جائیں جو ہاتھ سے آپریٹ کیے جا سکتے ہیں۔بھوسا اسٹور کرنے میں کسانوں کی مدد دیں اور جن لوگوں کی بھینسیں، گائیں اور بکریاں مر گئی ہیں ان کو دودھ دینے والے جانور بکریاں، گائیں بھینسیں اور مرغیاں وغیرہ فراہم کی جائیں۔ان کے پاس گھاس موجود ہے، وہ سیزن آسانی سے گزار سکتے ہیں۔ورنہ ان لوگوں کی معیشت ڈسٹرب ہوگی اور اس کے اثرات پورے معاشرے میں پھیل جائیں گے۔کاشت کاری کا تحفظ اس لیے بھی لازم ہے کہ زلزلہ نے وہاں کی زمین کو نرم کر دیا ہے۔اب بارشیں ہوئیں تو یہ نرم مٹی بارش کے ساتھ بہہ کر دریاؤں کے ذریعے آگے آئے گی جس سے منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم میں سلٹ غیر معمولی مقدار میں جمع ہو جائے گی جس سے ان دونوں ڈیموں کو خطرات لاحق ہونگے۔

☆ اس سانحے کے نتیجے میں معذور ہونے والے افراد کی تعداد بھی ایک لاکھ تک ہوگی۔ ان کے لیے محتاج خانے بنانے کے بجائے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں معاونت کی جائے۔

☆ نہ جانے حکومت پاکستان نقصان کو گھٹا کر کیوں پیش کرتی ہے۔ یہ سرکاری بیان حیران کن تھا کہ متاثرین کی بحالی Manageable ہے، ہاں اگر ہمارا یہ عزم ہو تو یہ ناممکن بھی نہیں، قوم کا جذبہ موجود ہے اور ملکی خزانے میں بارہ ارب ڈالرز زرمبادلہ کے ذخائر موجود ہیں، انہیں استعمال میں لایا جانا چاہیے۔ میرے خیال میں یہ پانچ ارب ڈالر کا نہیں، دس بارہ ارب ڈالر کا کام ہے۔ حکومت یہاں بھی لاگت کو گھٹا کر پیش کر رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ زرمبادلہ کے ذخائر کو بچا کر نہ رکھا جائے ہمیں بیرونی امداد کے انتظار میں متاثرین کی حالت سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔

☆ این جی اوز کے کام کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں لیکن نیٹو جیسی تنظیموں کے مقاصد دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسی این جی اوز جن کے عسکری اور سیاسی ہیں انہیں آزاد کشمیر میں گھسنے دینا خطرناک ہوگا، ان کے لیے کام کے لیے دوسرے بہت سے علاقے ہیں۔ اس کے برعکس آزاد کشمیر میں پاکستان کی نظریاتی این جی اوز کو کام کا موقع دیا جائے۔ اس سے کشمیر اور پاکستان کے درمیان رشتہ مضبوط ہوگا۔

☆ اس مرحلے پر ہمیں بیرونی ترغیب پر نام نہاد دانش وروں کے توڑ کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ علاوہ ازیں ہر سیاسی جماعت کو بھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا ہوگا کہ اس نے اب تک کیا کردار ادا کیا ہے۔ اس زلزلے نے یہ حقیقت بھی آشکار کر دی کہ سوائے جماعت اسلامی کے کسی سیاسی جماعت کے پاس خدمت کو متاثر نہ کرے۔ میرے خیال میں جماعت کا دعوتی اور خدمت خلق کا کام اس کے سیاسی کام سے زیادہ موثر ثابت ہو رہا ہے۔ یہ سوال خود جماعت کی صفوں میں اُٹھتا رہا ہے۔ میں آج یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ سماجی کام عوام کے دل جیتنے کے لیے زیادہ موثر ہے۔ بشرطیکہ اس پر سیاسی سایہ نہ پڑے۔ ان کی سماجی خدمات کے سبب ساری قوم ان کے ساتھ ہوگی اور اسی کے ذریعے جماعت قوم کی تربیت اور کردار سازی بھی کر سکتی ہے۔ ایم کیو ایم نے بھی فلاحی کام کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ بھی قابل داد ہیں ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے بشرطیکہ اس کام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے اور قطعی انسانی ہمدردی تک محدود رکھا جائے۔

☆ بھارت زلزلے سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کی تحریک کو ختم کرنا چاہتا ہے، اس مرحلے پر بھارت کے بیانات اور دعوے چالبازی کے سوا کچھ نہیں، ہمیں دیوار برہمن کے مستقل خاتمے پر اصرار کرنا چاہیے کیوں کہ اس کی وجہ سے بہن بھائی ایک دوسرے سے جدا ہیں، بھارت کا رویہ اس موقع پر بھی انتہائی سفاکانہ ہے۔ اگر ہندوستان خود کہتا ہے کہ مجاہد تنظیمیں بھی ختم ہو گئیں اور ان کے کیمپ بھی نہیں رہے تو پھر وہ کیوں کشمیریوں کو رائے شماری کی آزادی نہیں دیتا، یہ بے حسی کی انتہا ہے۔ پاکستان اپنی پالیسی پر قائم رہے۔ اس سے ہٹ کے اگر کوئی فریم ورک تیار کیا گیا تو یہ نہ پاکستان کے حق میں ہوگا، نہ بھارت اور نہ ہی کشمیریوں کے حق میں ہوگا، یہ طرف استعمار کے حق میں ہوگا۔

- ☆ قوم کا وہ جذبہ جو آج بیدار ہے اسے زندہ سلامت اور برقرار رکھنا ضروری ہے۔ یہ جذبہ قوم کو نئے رخ پر ڈال سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک عظیم سماجی انقلاب کی بنیاد رکھنے کا یہ بہترین موقع ہے۔
- ☆ مذہبی اور اسلامی تنظیموں کے علاوہ ممی ڈیڈی کلاس کے لوگوں نے بھی حیرت انگیز طور پر متاثرین کی مدد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ مالدار لوگوں کے لیے رقم دینا تو آسان کام ہے لیکن اپنے ہاتھوں سے کام کرنا ان کی روایت نہیں، لیکن ہمارے ساتھ ریلیف کے کام میں اس طبقے کے لوگ آ کر ٹرکوں میں خود سامان لوڈ کرتے رہے۔ ان کے بچے ہسپتالوں اور کیمپوں میں کام کرتے رہے۔ انہیں خراج تحسین دینا ہم سب کا فرض ہے۔ انہوں نے خود کو اس قوم کا دردمند حصہ ثابت کیا ہے۔

# پشتو اور پختون خواہ

نسلی اعتبار سے میں پٹھان ہوں۔ میرے آباؤ اجداد سوات سے ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہو گئے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پنجاب میں ایک کروڑ افراد پٹھان نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کراچی میں کم از کم پچیس لاکھ پٹھان افراد آباد ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور دنیا کے کونے کونے میں بھی پٹھان قابل ذکر تعداد میں آباد ہیں۔ پٹھان کی ثقافت اور برصغیر کی ثقافت اور تہذیب گڈ مڈ ہونے کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور زمانہ تصنیف گیتا انجلی۔ جس پر انہیں نوبل انعام ملا اس میں آزاد تجارت کرنے والے ''کابلی والا کا'' کا کردار شامل ہے۔

شمالی مغربی علاقے کے پٹھانوں کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے علاقائی پابندی کو زندگی کا حصہ کبھی نہیں بننے دیا۔ رزق اور روزگار کی خاطر وہ ہمیشہ لمبے سفر کرتے رہے ہیں۔ باقی لوگوں نے جس طرح خود کو جغرافیائی طور پر محدود کر دیا ہے۔ پٹھانوں نے کبھی خود کو اس طرح محدود نہیں کیا۔ یہ وہی فلسفہ حیات ہے جس کا اظہار طارق بن زیاد نے ساحل اندلس پر کشتیاں جلاتے وقت کیا تھا کہ

ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ماست

پٹھانوں نے اپنے اس حریت پسندانہ مزاج اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر مشرق و مغرب میں اہم مقام اور آفاقیت حال کی ہے۔ گویا پٹھان وطنیت کے اس تصور کے ہی خلاف رہا ہے کہ جو انسان کو جغرافیائی حدود میں محصور کر دے۔ اس طرح وہ زبان حال سے کہتا ہے۔

ملک خدا تنگ نیست
پائے پٹھان لنگ نیست

پشتو کیا چیز ہے......؟ کیا یہ محض ایک محدود سی زبان ہے۔ جو لوگ پٹھان یا افغان اور پشتو یا پختو کی تاریخ اور روایت سے واقف ہیں۔ وہ کسی شخص یا جماعت کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ پشتو بولنے والے پٹھانوں کو کسی خاص علاقے کی نسبت یا نام کے تشخص کی ضرورت ہے۔ پشتو کسی علاقے یا چند علاقوں تک محدود ایک زبان ہی تو نہیں۔ یہ تو ایک نظریہ حیات ایک ضابطہ اخلاق اور انسانی منشور ہے۔ اس میں وہی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ جو اسلام کا مزاج ہے۔ جس طرح رب العالمین کا پیغام حضور ﷺ کے ذریعے ساری انسانیت تک پہنچایا گیا اسی طرح پشتو کا ضابطہ حیات ہمہ گیر ہے۔

پٹھانوں میں توحید کا عقیدہ ہمیشہ سے مقبول تھا اس لیے جیسے ہی اسلام آیا پٹھان قوم نے اجتماعی طور پر

اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنے آپ کو کسی علاقے نسل یا زبان کے بجائے اس عالم گیر نظریے سے وابستہ کر لیا آج اگر کوئی پشتو کو محض ایک زبان کا اپیرہن دیتا ہے تو یہ اسے محدود کرتا ہے۔ اس لیے کہ زبان کے طور پر پشتو اتنی محدود ہے جس نے دنیا کی زبانوں میں اپنا مقام حاصل نہیں کیا لیکن جب اس کو ہم چارٹر کے طور پر دیکھیں گے تو اس کی وسعت اور گہرائی کو ناپنا مشکل ہے۔ علاقائیت اور نسلی عصبیت جیسی چیزیں اس میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ پشتو کی بنیاد عقیدہ توحید عزت وغیرت، شجاعت وعزیمت اور حب دین پر ہے۔ علامہ اقبال نے افغانوں کی اسی غیرت و حمیت کو اپنایا۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ اسی خطے میں اسلامیت اور اسلام کی تمام تحریکوں نے ہمیشہ اسی خطے سے رشتہ جوڑا سید احمد شہید نے تحریک جہاد کا مرکز اسی خطے کو بنایا اور اسی لیے کہ ان سنگلاخ پہاڑوں کے مکینوں میں حمیت دین کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی طرح برصغیر میں تحریک خلافت شروع ہوئی تو ان کی نظر بھی افغانستان ہی پر پڑی۔ ہزاروں لوگوں نے اس کی طرف ہجرت کی۔ مسلمانان ہند پر جب بھی آزمائش وابتلا کا دور آیا ان کی نظر افغانستان پر اٹھی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پشتو اور پٹھانوں نے پوری امت کو اپنے سینے میں سمانے کی خواہش بھی تھی اور ہمت بھی۔ 48-1947ء میں جب کشمیر کا جہاد شروع ہوا تو اس موقع پر پاکستان کے پاس فوج نہ تھی۔ قائداعظم کی نظر پٹھانوں پر پڑی اور قائداعظم کے حکم پر پٹھانوں نے جہاد کشمیر میں بھرپور حصہ لیا۔ کشمیر کا جو خطہ آج آزاد ہے اس کا کریڈٹ پٹھان مجاہدین کو جاتا ہے۔ ہزارہا پٹھان اس جنگ میں شہید ہوئے۔

حالیہ جہاد افغانستان میں مجھے اپنے پٹھان بھائیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے ایسی خندہ پیشانی اور اخلاص کے ساتھ افغان مہاجرین کو پناہ دی جس کی پوری دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزینوں کو سنبھالنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اس طرح کی صورت کسی اور خطے میں آتی تو وہاں صورت حال یکسر مختلف ہوتی مگر جس وسعت قلبی سے یہاں کے عوام نے چالیس لاکھ مہاجرین کو برسوں مہمان بنائے رکھا اس کی مثال نہیں ملتی۔

مجھے پٹھانوں کی فراخدلی اور وسعت نظری نے بہت متاثر کیا ہے۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ جہاں پٹھانوں نے مہاجرین کو سینے سے لگایا۔ وہاں ایک ایسی جماعت نے ان کی کھل کر مخالفت کی تھی جس کے قائدین ''فخر افغاناں'' کہلاتے تھے۔ حالانکہ اس وقت کے ''پنجابی حکمران'' نے ان کو خوش آمدید کہا اور ان کے کاز کو اپنا کاز قرار دیا۔ لیکن فخر افغاناں انہیں روسی بھیڑیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہیں افغانوں کی لٹتی ہوئی عصمت وعزت پر کوئی تاسف نہیں ہوا بلکہ وہ طورخم پر بیٹھ کر سرخ سیلاب کا انتظار کرتے رہے لیکن جب ان کی بات کو نہ صرف پٹھانوں نے مسترد کر دیا بلکہ اپنے مظلوم بھائیوں کے لیے دل کے دروازے کھول دیے۔ یہ لوگ اس وقت بھی ''اصول پسندی'' کا پیٹ بھر رہے تھے مگر یہ محدود سا طبقہ پٹھانوں کے لیے اجنبی رہا جو ذاتی مفادات کے لیے کبھی برزنیف کو دوست بنا لیتا تو کبھی ترکئی اور کارمل کے دوستی کے گن گانے لگتا۔ یہ کیسی اصول پسندی تھی۔ جو لوگ پہلے ظاہر شاہ سے دوستی کا دعویٰ کرتے تھے مگر ظاہر شاہ سے اقتدار چھن جانے کے بعد سردار داؤد آ گیا تو اس کے دوست بن گئے۔ سردار داؤد کو ترکئی نے ختم کر کے کیمونسٹ پرچم لہرایا تو اس کی قصیدہ

گوئی میں لگ گیے۔ ترکئی کو معزول کر کے حفیظ اللہ امین آیا تو اس کے گن گانے لگے۔ حفیظ اللہ امین کو قتل کر کے کارمل آ گیا تو اسے اپنا بھائی کہنے لگے اور جب کارمل سے اقتدار چھین کر نجیب اللہ نے اقتدار حاصل کیا تو اس کے تعلقات استوار کر لیے اپنی اب الوقتی اور بدلتے رویوں کو یہ بے شک اصول پسندی قرار دے لیں غیرت دین دکھنے والے بہادر پٹھان اس بات کو بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔

جہاں تک صوبے کا نام بدلنے کا تعلق ہے تو نام بدلنے میں کوئی حرج نہیں نام تو بدلنا ہی چاہیے۔ آج جن خطوں پر پاکستان مشتمل ہے اس میں سے کسی کا نام پاکستان نہیں تھا مگر اس کا نام رکھنے میں کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ یثرب کا نام بھی بعد میں مدینہ پڑ گیا۔ پاکستان کا نام زبان کی بنیادی پر نہیں رکھا گیا تھا۔ اگر زبان کی بنیاد پر رکھا گیا ہوتا تو اسے اردوستان کا نام دیا جاتا مگر اسے نظریے کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جس نے اسے غیر محدود بنا ڈالا صوبہ سرحد کا نام بھی تبدیل ہو سکتا ہے مگر اسے پشتو سے منسلک کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم پشتو اور پٹھان کو محدود کر رہے ہیں۔ اس کی آفادیت ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اتفاق و اتحاد کے بجائے نفرت لڑائی کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا بھر میں زبان اور علاقے کے نام پر جگہ جگہ خون ریزی ہو رہی ہے۔ سری لنکا میں سنہالی اور تامل زبانوں کی لڑائی کیسی ہلاکت خیز ثابت ہوئی خود پاکستان کو اسی جنگ نے دو ٹکڑے کر دیا۔ پاکستان میں سندھ، پنجاب، بلوچستان کے ناموں پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ مگر ان ناموں کو بھی بدلنا چاہیں تو کیا حرج ہے۔ اسی طرح اگر صوبہ سرحد کا نام بدلنا ہے تو بے شک بدلیں مگر اس کا نام ایسا کیوں رکھیں جس سے تعصب پیدا ہو۔ جس سے نفرت کی بو آ رہی ہو۔ بالخصوص جب یہ نام اس جماعت کی طرف سے ہے۔ جس کی پوری سیاسی تاریخ تعصب کا عنصر غالب رہا ہے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کی تاریخ پر نظر ہے اور آنے والے ایام میں ان کی نظر جغرافیے پر ہے۔ جبکہ جغرافیے اور تاریخ کا آپس میں لازوال رشتہ ہے۔ تاریخ سے غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس جماعت نے تاریخی طور پر جو کچھ کیا اور وہ غلط تھا اگر انہوں نے روس کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائیں تو یہ غلط نہیں کہ تم ہندوستان سے دوستی کا دم بھرتے ہو۔ یہ بھی غلط تھا کہ باچا خان نے پاکستانی شہریت کی نفی کرتے ہوئے ایک ایسے ملک میں دفن ہونا پسند کیا جب روس وہاں سے نکل رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس سلسلے میں بھی ان سے غلطی ہوئی۔ یہ ان کی تاریخ ہے کہ انہوں نے بیگانوں سے محبت اور اپنوں سے نفرت تھی۔ اب یہ سب سے بڑی تاریخ غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اب جبکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا دور آ گیا ہے ...... مسلمان پھیل رہے ہیں ...... وسعت حاصل کر رہے ہیں ...... تو اس اہم تاریخی موڑ پر ایک بار پھر لسانی اور علاقائی عصبیت کے تنگ دائرے میں محصور ہو رہے ہیں۔ وحدت امت کے بکھراس اور وسیع نظریے کی نفی پر مبنی ایک متنازعہ نعرہ لیکر کھڑے ہو گیے ہیں۔

ہمیں اگر نیا نام رکھنے کا موقع میسر آ گیا ہے تو کیوں نہ ایسا نام رکھیں جس کی وجہ سے ہر کوئی اس سے پیار کرئے اس لیے اگر اس نام کی بنیاد پر تعصبات پھیل گئے تو اس کا سب سے زیادہ نقصان صوبہ سرحد کو ہوگا کیونکہ وہاں چار بڑی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان کے حصے میں آٹھ صوبے آئے انہوں نے اس کو بڑھا کر بتیس تک پہنچا دیا ہے لیکن انہوں نے کبھی کسی صوبے کا نام زبان پر نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ ہندو انتہا پسند جماعت بی جے پی نے بھی بمبئی کا نام زبان و نسل کے بجائے ایک دیوی کے نام پر رکھا پاکستان میں بھی

شکری کا نام ساہیوال اور لائل پور کا نام فیصل آباد رکھا۔ ان ناموں کی تبدیلی میں تعصب اور محدودیت کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ پھر پختون خواہ کے مطلب و معنی ہی نہیں۔ پشتو لغت اس کے معنی پر خاموش ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایک خاص نام پر اصرار کر کے پشتونوں کے مفادات کو کیوں نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔؟ اس کا فائدہ صرف دشمن کو ہو سکتا ہے۔ اس جماعت کے غلط فیصلوں نے ماضی میں بھی پشتون عوام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس وقت دنیا میں پشتونوں کا سب سے بڑا شہر کراچی ہے۔ جہاں پچیس لاکھ پشتون آباد ہیں۔ پنجاب میں پشتون نسل کے ایک کروڑ افراد رہتے ہیں۔ اتنے پشتون تو خود صوبہ سرحد میں نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک متنازعہ نام رکھ کر یہ لوگ کراچی اور پنجاب کے پشتونوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔؟ پشتو تو وہ ضابطہ اخلاق ہے جس پر ہم ساری پاکستانی قوم کو اٹھا کر سکتے ہیں۔ پشتو ایک ایسی خوشبو ہے جس سے ہم پوری قوم کو دل کو معطر کر سکتے ہیں۔ اسے پختون خواہ کی بوتل میں بند کر دینا پشتونوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس نام سے لازماً تعصبات ابھریں گے دوسرے لوگ بھی اس بنیاد پر اپنے گھٹیا مفادات کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ خلفشار اور افراتفری پھیلے گی اس کا سب سے نقصان تو خود صوبہ سرحد کو ہوگا۔ اس صوبے کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ہندکو، گوجری، سواتیکی، کوہستانی، کھوار وغیرہ دیگر زبانیں یہاں بولی جاتی ہیں۔ اس سے پنجاب بھی سرائیکی، پوٹھواری، ماجھے کی پنجابی جانگلی پنجابی کی بنیاد پر تقسیم ہوگا۔ سندھ کے لسانی گروپ بھی صوبے کی تقسیم کا پرچم بلند کریں گے۔ بلوچستان میں بھی تین بڑی اور بے شمار چھوٹی زبانیں بولنے والے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح کے مطالبے لے کر کھڑے ہو جائیں گے اس سے تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس سے ہماری نظریاتی اساس ختم ہو جائے گی۔ ہم نے تو لا الہ الا اللہ کا پرچم اٹھا کر پاکستان حاصل کیا ہے۔ ''بولیوں'' کے بت توڑ کر یہ مملکت خداداد حاصل کی ہے۔ اس میں نسل و لسان کی بنیاد پر جھگڑے کھڑے کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ پاکستان کی وحدت کو توڑنا مطلوب ہے۔ زبان کی بنیاد پر تقسیم کا سلسلہ چل نکلا تو یہ کہیں پر نہیں رکے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ''پختون خواہ'' پاکستان کے عوام کا مسئلہ نہیں بلکہ خود اس کا مسئلہ ہے۔ جو نان ایشو کو ایشو بنا کر اصل مسائل سے نگاہ ہٹانا چاہتا ہے۔ پاکستان کے عوام کا مسئلہ مہنگائی اور غربت ہے۔ کرپشن اور بدامنی ہے۔ ناانصافی اور ظلم ہے۔ جہالت اور فرقہ واریت ہے۔ پاکستان کے عوام تو ملک و ملت کو لوٹنے والوں کو احتساب چاہتے ہیں۔ کیا صوبے کا نام پختون خواہ رکھ دینے سے یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس سے کسی صوبے کے عوام کو حقوق نہیں مل سکتے۔ صوبے کے حقوق کا مسئلہ ہے تو اس کی کھل کر وکالت کریں۔ ہر پاکستانی کو رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر اس کے حقوق اس کے گھر کی دہلیز پر ملنے چاہئیں کیا صوبہ سرحد کا نام پختون خواہ رکھ دینے سے پشاور کے خوانین اپنے مزاروں ان کے حقوق دینا شروع کر دیں گے۔ پنجاب کا زمیندار اپنے کاشتکار سے انصاف کرنے لگے گا۔ آپ اگر سیاسی اور علاقائی بنیادوں پر جھگڑے کرنے شروع کر دیں گے۔ اس سے حقوق کا استحصال کرنے والے خوش ہوں گے۔ حقوق حاصل کرنے کے بجائے سیاسی جنگ لڑیں گے تو انا کا مسئلہ حل ہوگا۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ ایک خفیہ معاہدے کے تحت یہ معاملہ طے ہوا ہے؟ جمہوریت پسندی کا یہ تقاضا ہے نہیں آپ خفیہ معاہدوں کے ذریعے مسائل حل کرتے رہیں۔ اس طرح کے خفیہ معاہدے سے دھرنا قباحت نہیں

ہوتے۔ اور نہ آئندہ ہوں گے۔ ان لوگوں پر حیرت ہے جو اس طرح کے خفیہ معاہدے کراتے ہیں۔ اور کرتے ہیں اور پھر جمہوریت پسندی کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔

دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ صوبائی اسمبلی نے ''پختون خواہ'' کے بارے میں قرار داد پاس کر دی ہے کیا اسمبلی کو ملک و قوم پر وسیع الاثرات فیصلے کرنے کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔ جس کے بارے میں الیکشن کے وقت عوام سے پوچھا تھا نہیں گیا۔؟ اگر الیکشن کے وقت پختون خواہ کو ایشو بنایا گیا تھا تو اب ایک پارٹی کو ڈکٹیٹر شپ مسلط کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ قومی اسمبلی کو بھی عوام یہ حق نہیں دے سکتے کہ وہ این پی ٹی ای سی ٹی بی ٹی جیسے معاملات پر عوام کے مینڈیٹ کے بغیر دستخط کرے مستقبل کے بڑے فیصلے کرنے کے لیے عوام سے رائے لی جانی چاہیے۔ ریفرنڈم کرایا جانا چاہیے۔ یا نئے الیکشن کروا لیے جائیں۔ محض چالاکی سے کیا گیا مصنوعی فیصلہ دیرپا ثابت نہیں ہوگا۔ کیا ہم بھارت کا یہ دعویٰ مان سکتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی متفقہ طور پر بھارت سے الحاق کا فیصلہ کر چکی ہے؟

قومی اتفاق حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پختون خواہ پر ضد کرنے کے بجائے دوسرے ناموں پر اتفاق کر لیا جائے خیبر بھی ایک خوبصورت نام ہو سکتا ہے۔ یہ ایک یادگار مقام ہے جو نہ صرف پٹھانوں بلکہ سارے پاکستانیوں کے لیے باعث فخر ہے یہ خیبر ہی ہے جہاں ہم نے روس کے سرخ سیلاب کے سامنے بند باندھنے میں کامیاب ہوئے تھے خیبر ہماری جرأت محنت اور مدافعت کی علامت ہے۔ خیبر کے متعلق ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بڑے خوبصورت اشعار کہے ہیں۔

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسمان بھی جھک کر ملتے ہیں
اگر کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے ہوا تھرا کر چلتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ''پختون خواہ'' پاکستان کے عوام کا مسئلہ ہی نہیں ہے نہ ہی یہ پشتونوں کا مسئلہ ہے۔ ملک کو اتحاد و اتفاق سے محروم کرنے اور قوم میں نفاق و نفرت کا بیج بونے والا ایجنڈا پاکستانی عوام بشمول پٹھانوں کا نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف امریکہ اور بھارت کا ایجنڈا ہو سکتا ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس قسم کا کام کریں۔ جس سے ہمارے ہمسایہ اسلامی ممالک میں تقسیم کے رجحانات پیدا ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ نیو ورلڈ آرڈر کے علمبردار تقسیم افغانستان کے لیے کوشاں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے عوام یہاں امریکہ اور ہندوستان کے ایجنڈے پر عمل درآمد نہیں ہونے دیں گے بہادر اور غیور پٹھانوں کو جان لینا چاہیے کہ پشتو کی وسعت کی ایک چھوٹے خطے میں محدود کرنے والے پشتو کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔

# پاکستانی قوم کے نام!

ان سطور کی تحریر کے وقت میں اڈیالہ جیل میں قید ہوں اور اس بات کا مجھے احساس ہے کہ میری گرفتاری سے عوام کے دلی جذبات کیا ہیں اور پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتحال سے قوم کس کرب میں مبتلا ہے۔ میں ان حالات میں پہلے اپنے حوالے سے چند باتیں تحریر کرنا چاہتا ہوں۔

میرا تعلق تحریک پاکستان کی جدوجہد میں شامل خاندان سے ہے، میرے بزرگوں نے انگریز کے خلاف عملی جہاد کیا اور بچپن سے ہی میرے کانوں میں آزادی کی بولیاں رس گھولتی رہی ہیں۔ مَیں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کا جذبہ لے کر فوج میں شامل ہوا اور ایک سپاہی کی طرح اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر کے فوج سے ریٹائرمنٹ حاصل کی۔

الحمد اللہ! میں نے انتہائی نازک وقت میں بڑی سے بڑی آزمائشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے چند اہم موقعوں پر ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر اپنے قومی مشن کی تکمیل کو پورے ایمان کے ساتھ ادا کیا۔ دنیا کی ایک سپر طاقت پاکستان کے گرم سمندر تک پہنچنے کا خواب لے کر چلی اور اپنے اندر ہی پگھل کر ٹکڑوں میں بکھر گئی۔

افسوس کہ غیر نہیں، آج اپنے کہتے ہیں کہ یہ سب مغرب اور امریکی مفاد میں تھا۔ کاش اس قوم کے سامنے وہ حقائق آ جاتے اور ہماری آج کی نسل کو اس کی رفعت پرواز کا علم ہو جاتا کہ ہم کون ہیں اور کیا کر سکتے ہیں؟ اللہ نے ہم کو رمضان المبارک کی 27 ویں شب، نزول قرآن کے لحات میں یہ ملک کیوں عطا کیا تھا؟ ہم ریاست مدینہ کا تسلسل ہیں تو ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ میں نے فوج میں رہتے ہوئے اپنی قوم کے جذبوں کو پڑھا اور فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد عوامی زندگی میں شامل ہو کر اپنی قوم کی طاقت اور اس کے عزم کو اور اچھی طرح سمجھا۔ میرے نزدیک ہم ایک آئیڈیل ملک کی آئیڈیل قوم ہیں۔ ہمارا جغرافیہ اور ہماری شناخت ثابت کرتی ہے کہ وہ دوقومی نظریہ کی بنیاد پر قائم دنیا کی واحد مملکت پاکستان قدرت کا ایک عظیم انعام ہے۔

میں فخر کرتا ہوں کہ ہم نے دیوار برلن کو توڑ دیا، ہم نے سویت یونین کی مسلم ریاستوں کو آزادی کا راستہ فراہم کیا۔ آج بھی میرے گھر میں جرمن حکومت کی طرف سے بھیجا گیا دیوار برلن کا ٹکڑا موجود ہے۔ اس کے ساتھ جرمن قوم کا پاکستانی جنرل کو خراج تحسین میری نہیں پوری قوم کی عظمت کا اقرار ہے، کیونکہ میں پاکستانی سپاہی ہوں اور یہ تعارف ہی مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے اپنے دور کی ہر حکومت نے پیش کش کی کہ میں وزارت، سینیٹر، گورنر یا پھر کسی بھی ملک کی سفارت کا منصب قبول کر لوں۔ میرا جواب ہمیشہ یہ تھا کہ میں قوم کی خدمت کے لیے کردار (Role)

چاہتا ہوں، نوکری نہیں چاہتا۔ میری آخری سانس بھی اس وطن اور قوم کی امانت ہے۔ کچھ دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کوئی سیاسی جماعت یا تنظیم قائم کروں لیکن میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ میں کوئی جماعت بنا کر اپنی شناخت اور قوم کو تقسیم در تقسیم کے عمل میں نہیں لانا چاہتا۔ میری خدمات ہر جماعت، برادری، لیڈر کے لیے ہے جو اپنے ملک کے مفاد میں جذبات رکھتے ہوں۔ کچھ جماعتوں نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی، ایک وقت ایسا بھی آیا جب مجھے میری مرضی کے مطابق شریک اقتدار کرنے کے لیے میرے دوست آتے رہے لیکن میں نے اقتدار کو قبول نہیں کیا، کیونکہ میں اصلاح اقتدار چاہتا ہوں۔ میری منزل قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کا وہ خواب ہے جو پاکستان کو عالمگیر نظریہ کی حامل فلاحی ریاست بنانا ہے۔

یہاں ایک بات اور عرض کرتا چلوں، فوجی کی زندگی کئی کٹھن مراحل سے گزرتی ہے اور میری مدت ملازمت کا دور عالمی حالات کی وجہ سے بہت اہم گزرا ہے۔ لہٰذا انسانی فطرت کے مطابق اب میرے آرام کے دن ہیں کہ میں اپنے بچوں، پوتے، پوتیوں اور اہل خانہ کے ساتھ زندگی کے باقی دن سکون سے گزاروں، لیکن میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں خود کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سپاہی سمجھتا ہوں۔ میرا یقین اور ایمان ہے کہ واحد نظریاتی مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان جو ریاست مدینہ کا تسلسل ہے، مجھے تو کیا کسی بھی مسلمان کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے نبی آخر الزماں کی تعلیمات کو فراموش کر کے زندگی کو دنیا کے آرام و آسائش کی نذر کر دے۔ اس لیے میرا مشن ہے کہ میں مرتے دم تک اپنی قوم اور ملک کے لیے جدوجہد کرتا رہوں۔

اب میں موجودہ حکومت سے اختلاف رائے اور اپنی گرفتاری کی طرف آتا ہوں۔ پاکستان کے صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف جنرل مشرف میرے Junior اور ماتحت افسر رہے ہیں۔ ہم دونوں کے تعلق کے بارے میں ہر واقف شخص گواہ ہے کہ میں نے ہمیشہ جنرل مشرف کی پیشہ وارانہ فوجی صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بے شمار مواقع پر جب بھی میری ضرورت محسوس ہوئی، جنرل مشرف میرے پاس تشریف لائے اور میں نے اپنے علم اور تجربہ کی بنیاد پر ان سے تعاون کیا، جس میں میرا کوئی مفاد شامل نہیں رہا۔ جنرل مشرف نے بھی اقتدار حاصل کرنے کے بعد مجھے کئی بار مختلف مناصب کی پیش کش کی، لیکن میرا جواب وہی تھا جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

جنرل مشرف اور میرے تعلقات خاندانی بن گئے تھے۔ ان کے بچوں کی میرے ساتھ انتہائی محبت کے کئی ثبوت تحفوں کی شکل میں میرے پاس موجود ہیں۔ مجھے یہ بچے آج بھی اپنی اولاد کی طرح عزیز ہیں، لیکن جب 11 ستمبر 2001ء کے بعد جنرل مشرف نے پاکستانی خارجہ پالیسی پر یوٹرن لیا اور امریکہ اور اتحادی ممالک کے بلاک کی بلاچون و چراں حمایت کی تو مجھے اپنے ساتھ جنرل مشرف کے رویہ پر افسوس ہوا۔ میں نے بار بار کوشش کی کہ میں جنرل مشرف کو امریکی شکنجہ میں جانے سے بچاؤں، لیکن یہاں تو ''کلیسا میرے آگے ہے تو کعبہ میرے پیچھے'' والی بات تھی۔

آہستہ آہستہ جنرل مشرف جو مجھے عزیز تھے، مجھ سے دور ہوتے گئے۔ انہوں نے قومی غیرت و حمیت کی دھجیاں بکھیرنا شروع کر دیں۔ میری تنقید اور مشوروں کو انہوں نے امریکی پالیسیوں تلے دبانا شروع کر دیا اور

نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ امریکہ ہمارے علاقوں میں بمباری کرنے لگا۔ پاکستان میں اپنی فوج کے ساتھ عوام ہتھیار اُٹھانے لگے اور یہ وہ بھیانک سازش ہے جو امریکہ طویل عرصے سے کر رہا تھا مگر نا کام تھا۔

ڈاکٹر قدیر خان کو قید کر لیا گیا، ایٹمی اثاثے غیر محفوظ ہونے لگے، نظام تعلیم اور داخلی سیاست کے فیصلے اسلام آباد کی بجائے واشنگٹن کی ہدایت کے مطابق ہونے لگے۔ بلوچستان، سرحد میں قبائلی کشمکش اور بغاوت جیسی صورتحال نے ملک کو خطرناک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ بھارت اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے تعلقات کے اثرات نے کشمیر پر ہمارے موقف کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات کے لیے خفیہ مشن شروع ہو گئے، لاکھوں انسانوں کے قاتل امریکہ کے ایسے اقدامات جس کی خود امریکی معاشرہ اور ایوانِ نمائندہ گان مخالفت کرتے ہیں، جنرل مشرف خوشی کے ساتھ کرنے لگے، جس کی وجہ سے آج ہماری فوج اور عوام کے درمیان کہیں کہیں خوفناک تصادم نظر آتا ہے اور حالات ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ رکنے والا نہیں بلکہ یہ سلسلہ بہت آگے جا سکتا ہے جو امریکی حکومت کے منصوبے اور خواہش کے عین مطابق ہے۔ اگر میں یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہتا تو مجھے بھی شریک اقتدار کر لیا جاتا جس طرح میرے بعض دیگر ساتھی اقتدار کا حصہ ہیں۔

میں جس وزارت کی طرف اشارہ کرتا، مجھے مل جاتی، جہاں جس ملک میں جانا چاہتا سفیر کا عہدہ مل جاتا لیکن میں سپاہی ہوں، کس طرح برداشت کرتا کہ میرے وطن کی سرزمین کو غلامی کی نذر کر دیا جائے، اپنی ہی فوج کے ہاتھوں اپنے بچوں کا قتل اور خون بہایا جائے۔ یہی نہیں آگے چل کر تمام اخلاقی اور قانونی قدروں کو پامال کر دیا گیا۔ چیف جسٹس کو غیر قانونی، غیر آئینی طور پر ہٹایا گیا، پھر عذر گنا بدتر از گناہ کے مصداق عدالتوں کو اپنی مرضی کے فیصلے کرنے کا پابند بنانے کے لیے ایمرجنسی لگا دی گئی۔ بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے۔ وکلاء، صحافیوں، طلباء اور سیاسی کارکنوں پر تشدد کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔ جب اعتراف حق کے لیے میں چیف جسٹس افتخار چوہدری کو گلدستہ پہنچانے گیا تو مجھے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ جو سلوک میرے ساتھ روا رکھا گیا ہے، وہ دشمن ملک کبھی دشمن ملک کے فوجی کے ساتھ روا نہیں رکھتا، لیکن یہ ظلم اور زیادتی مجھے میرے مقصد سے نہیں ہٹا سکتی۔

مجھے اپنے مشن اور موقف پر فخر ہے۔ میں اپنے اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں، میں نے اپنے ملک کی اساس "دو قومی نظریہ" کے خلاف کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ پاکستان کے 16 کروڑ عوام کی امنگوں کا سودا کرنے والے پہلے بھی خسارے میں رہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی نا کام رہیں گے۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ یہ وقت عملی جدوجہد کا ہے، جو غلطی سوویت یونین نے افغانستان میں آ کر کی تھی، اس سے بھی بھیانک غلطی امریکہ نے افغانستان اور عراق میں آ کر کی ہے، جس کا بھیانک انجام اسے ان شاء اللہ پاکستانی قوم کے ہاتھوں ملے گا لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب ہمارے درمیان اتحاد ہو، ہم تمام سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر دفاع وطن کے لیے متحد ہو جائیں اور اپنے وطن کو ناپاک عزائم سے بچانے کے لیے حق و صداقت کا ساتھ دیں۔ جنرل حمید گل ایک فانی انسان کی لازوال آواز ہے جو آفاقی نظریہ کی رہنمائی میں سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت کا سفر طے کرتا ہے۔

# نوجوان نسل نسیم حجازی کی سوچ اپنائے

(روزنامہ الاخبار، اسلام آباد، 2 مارچ 2005ء، بروز بدھ)

نسیم حجازی (مرحوم) کا میرے ساتھ ذاتی تعلق تھا۔ جہاد افغانستان کے سلسلہ میں جب میرا (حمید گل) نام منظر عام پر آیا تو نسیم حجازی نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہنے لگے کہ میں افغانستان کے بارے میں ناول لکھنا چاہتا ہوں جس میں حمید گل اور حکمت یار میرے کردار ہوں۔ میں جب ملتان میں کور کمانڈر تھا تو نسیم حجازی میرے پاس آئے، وہ دو تین روز میرے مہمان رہے۔ ان سے میں نے تفصیلی تبادلہ خیال کیا، انہوں نے ہر پہلو سے میری شخصیت کا جائزہ لیا۔ میری فیملی پہلے ہی ان کی گرویدہ تھی چنانچہ ہم تمام گھر والوں کو ان کی مہمان نوازی پر بڑی خوشی ہوئی۔ میرے یہاں قیام کے دوران ایک واقعہ رونما ہوا۔

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ نسیم حجازی شوگر کے مریض ہیں۔ انہیں شوگر کی تکلیف ہوئی تو میرے اے ڈی سی نے انہیں دوائی کی ڈبل ڈوز دے دی جس سے انہیں ہائپوگلوکومیا کی شکایت ہوگئی، ہم سارے اہل خانہ گھبرا گئے۔ میں نے یہ صورتحال دیکھتے ہوئے شہد کی بوتل ان کے منہ میں انڈیل دی۔ خدا کا شکر ہے کہ شہد کی وجہ سے ان کی طبیعت سنبھل گئی۔

اس کے بعد جب وہ راولپنڈی میں صاحب فراش تھے تو میں ان کی عیادت کے لیے جایا کرتا تھا۔ ان کے بیٹے خالد حجازی اور نواسے اصلاح الدین سے بھی گفتگو ہوتی تھی۔ انہوں نے ایک ناول کا انتساب میرے نام کیا اور افغانستان کے جہاد کے بارے میں ناول لکھنا شروع کیا لیکن موت نے انہیں یہ ناول مکمل کرنے کی مہلت نہ دی جس کا مجھے زندگی بھر رنج رہے گا۔ البتہ ہاشمی صاحب کے پاس اس کے نوٹس ہیں کاش کہ کوئی ان کے اس ادھورے مشن کو مکمل کرے۔

پاکستان کے موجودہ مشکل حالات میں خصوصاً بلوچستان کے حالات سے ہر کوئی پریشان ہے۔ نسیم حجازی (مرحوم) کے بلوچستان کے تمام سرداروں کے ساتھ انتہائی قریبی مراسم تھے۔ تمام سردار نسیم حجازی کے گرویدہ ہیں، وہ موجود ہوتے تو موجودہ حالات کو سنبھالنے میں زیادہ مشکلات درپیش نہ آتیں۔

نسیم حجازی مرحوم نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ صحافت کی نذر کیا اور بطور صحافی ان کا کردار بھی ناقابل فراموش ہے۔

میرا تعلق اسی نسل سے تھا جس نے نسیم حجازی کے ناول پڑھ کر اپنی ذہنیت سازی کی اور اسلام سے محبت اور ایسی طرز زندگی کو اپنایا جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کے سچ کر دکھانا چاہتی تھی۔

میرے خواب بننے اور اپنانے میں نسیم حجازی کا بڑا عمل دخل رہا، میرے گھر کا ماحول پہلے ہی اسلامی اور پاکیزہ تھا۔ میں اپنی چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں، میری بڑی بہن کو نسیم حجازی کے ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ وہ ناول پڑھنے کے بعد اس کا ذکر فیملی میں کرتیں پھر ہم سب مل کر اس کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے۔ نسیم حجازی کے ناول ایسے تھے جن میں بے حیائی کا عنصر نہ تھا اور ان ناولوں کو پوری فیملی پڑھ سکتی تھی۔ بڑی بہن سے ان ناولوں کے بارے میں بار بار تذکرے سن کر مجھے بھی یہ ناول پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور ان کو پڑھ کر میرے اندر وہ جذبہ پیدا ہوا جس نے مجھے فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی۔ میرے اندر مجاہد بننے کا شوق پیدا ہوا۔

نسیم حجازی کے ناول پوری ایک نسل پڑھ کر پروان چڑھی، ان کی تربیت نسیم حجازی کی فکر سے ہوئی۔ یہ فکر اور جذبہ پاک فوج میں سروس اور جہاد افغانستان کے دوران بہت کارگر ثابت ہوا۔ اگرچہ میری فیملی کا ماحول اور علامہ اقبال بھی میرے افکار اور جذبے کا محور تھے لیکن نسیم حجازی کی سوچ اور فکر نے میرے اندر ہمیشہ نیا ولولہ بیدار رکھا اور اس سوچ اور فکر کا نتیجہ ہے کہ ہمیشہ اسلام کے سنہری اصول اور انداز میرے لیے مشعل راہ رہے۔ میں نے مادہ پرستی کو قریب پھٹکنے نہ دیا، انہی کی وجہ سے میں آج بھی سر فخر سے بلند کر کے چل سکتا ہوں۔ وطن اور دین کے بارے میں میری سوچ اور خیالات نے مجھے سفلی خیالات سے ہمیشہ دور رکھا جس پر میں خداوند تعالیٰ کا بے حد مشکور ہوں۔

آج جب پاکستان میں حالات دگرگوں دکھائی دیتے ہیں اور تہذیبوں کے ٹکراؤ کی باتیں چل نکلی ہیں۔ تو اس ماحول میں نسیم حجازی کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ نسیم حجازی اسلامی اقدار پر مبنی صاف ستھری تہذیب کے داعی تھے لیکن اس تہذیب سے ٹکراؤ کا اندیشہ بڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ ردعمل ہے مغرب کی تہذیب کی یلغار کا، ایسے وقت میں نسیم حجازی اس ٹکراؤ کے درمیان ایک مضبوط دیوار کی طرح کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس ٹکراؤ سے مقابلہ نسیم حجازی کی سوچ اور فکر کو اپنا کر کامیابی سے کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت جبکہ ہمارا معاشرہ محاذ آرائی کے جال میں پھنسا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ایسے مشکل وقت میں نسیم حجازی کی فکر، سوچ اور کردار سے رہنمائی وقت کی ضرورت بن چکی ہے۔ جس دور میں نسیم حجازی مرحوم نے اپنی سوچ اور فکر کو صحافت اور ناولوں کے ذریعے پھیلایا، اس وقت نظریہ پاکستان اور اس کے تحفظ و استحکام کو ایک عام سی بات سمجھا جاتا تھا لیکن آج جب کہ ان نظریات کی کھلم کھلا مخالفت ہو رہی ہے، روشن خیالی کا تذکرہ اسی تسلسل سے ہے اس لیے کہ اسے مغرب پرستی کی دوسری شاخ سمجھا جانے لگا ہے جبکہ نسیم حجازی مرحوم نے اپنے ناولوں کا ماخذ تاریخ اسلام کو بنایا اور انہوں نے مغربیت اور روشن خیالی کی نفی کی لہٰذا عصر حاضر میں نسیم حجازی کی سوچ اور فکر کو از سر نو اجاگر کرنے کی بہت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

نسیم حجازی اور علامہ اقبال کی سوچ و فکر کا جائزہ لیا جائے تو دونوں میں کوئی واضح فرق نہیں آتا۔ علامہ اقبالؒ نے یہ بات شاعری میں کہی۔ نسیم حجازی نے اس سوچ اور فکر کو نثر میں بیان کیا، چنانچہ آج کی نوجوان نسل کو ان سے ترغیب لینی چاہیے۔ یہ ہمارے رول ماڈل ہیں۔ آج کا نوجوان کھلاڑی ناچ گانے اور بے ہنگم موسیقی کی طرف راغب ہے جس کی وجہ سے وہ قومی اقدار اور حمیت سے بتدریج دور ہوتا جا رہا ہے۔ آج کے نوجوان اسلامی

اقدار کی طرف راغب کرنے میں علامہ اقبال اور نسیم حجازی کی سوچ اور فکر اپناتا ہوگی۔

معاشرے کی تشکیل میں عورت کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔اچھی ماں ہی اچھی نسل بنا سکتی ہے اور خواتین بالخصوص نسیم حجازی کی فکر وسوچ اپنا کر اپنی اولاد کو مجاہد بنانے میں بنیادی کردار ادا کر سکتی ہیں۔نو جوانوں میں لٹریچر پڑھنے کی ترغیب بھی ضروری ہے۔آج کی نوجوان نسل پروفیشنلزم پر یقین رکھنے لگی ہے۔وہ تعلیم کو ذریعہ معاش سمجھتے ہیں کہ کس سوچ کے ساتھ پیسہ کمایا جا سکتا ہے، یہ کردار سازی نہیں ہے۔کاش آج ایک نہیں کئی نسیم حجازی پیدا ہوں جو ہماری نئی نسل کی سوچ اور فکر کو تبدیل کر سکیں۔

# نیشنل سیکورٹی کونسل..........زہر یا تریاق؟

جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کے ساتھ ہی جمہوریت کو لاحق خطرات کی قیاس آرائیاں دم توڑ گئیں۔ نیشنل سیکورٹی کونسل کے قیام کا مطالبہ بھی وقتی طور پر پس منظر میں چلا گیا ہے۔ تاہم اس پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ دیکھنا ہے کہ نیشنل سیکورٹی کونسل ہے کیا؟

## سیکورٹی کونسل کی اہمیت

1985ء کے بعد یہ تجاویز وقتاً فوقتاً ابھرتی رہی ہیں۔ میں بھی اس کا حامی رہا ہوں لیکن میری نظر میں نیشنل سیکورٹی کونسل ماورائے آئین ادارہ بلکہ پیشہ وارانہ ضرورت ہے ممکن ہے دوسرے اسے مختلف انداز میں دیکھ رہے ہوں۔ جب فوج کو اس طرح کا کردار سونپنا چاہتے ہوں جس طرح ترکی میں ہے لیکن میں اسے مختلف پس منظر اور تناظر میں دیکھتا ہوں۔ نیشنل سیکورٹی کونسل ایک ہمہ گیر تصور ہے جس سے قومی بقا اور سلامتی کے لیے فوج اور انتظامیہ کو ایک دوسرے کا دست و بازو بن کر کام کرنے کا عملی موقع ملے گا۔ اس میں وزارت داخلہ انٹیلی جنس ایجنسیوں، وزارت خارجہ اور وزرات خزانہ کو ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا۔ اس میں اقتصادی سیکورٹی اور نفسیاتی تحفظ کے احساس کو قوم اجتماعی سلامتی سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان اس وقت ایک غیر مرئی جنگ لڑ رہا ہے۔ ہماری فوج اور حکومت روایتی طور پر مصروف جنگ نہ ہوں لیکن اس کے اثرات اور نتائج زیادہ خطرناک ہیں۔ دشمن کے عزائم ایک کھلی جنگ سے بھی زیادہ زہریلے ہیں۔ اندرونی طور پر فرقہ واریت قوم پرستی اور امن وامان کی صورت حال ملک کی رگوں سے خون نچوڑ رہی ہے۔ ہم اقتصادی، نفسیاتی اور غیر سرکاری تنظیموں کے ثقافتی حملے کا شکار ہیں۔ ہمارے چاروں طرف حالات سخت خراب ہیں۔ ایران افغانستان تنازعہ چین کی دوستی میں سردمہری اور ہندوستان کے معاندانہ رویے نے ہمیں حالت جنگ سے دوچار کر دیا ہے بلکہ ہم جنگ سے زیادہ بگڑی صورت حال سے دوچار ہیں۔ ان حالات میں پیشہ ورانہ مشاورت کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اس مشاورت کو صرف منتخب نمائندوں تک محدود کرنا خام خیالی ہے خصوصاً چودھویں ترمیم کے بعد اسمبلیاں بڑی تک اپنی لیڈروں کی غلام ہو کر رہ گئی ہیں۔ ویسے بھی تیسری دنیا کے سیاست دانوں کا ایک مخصوص پس منظر ہوتا ہے اور ملکی دفاع سلامتی جیسے معاملات کے تکنیکی پہلوؤں کے بارے میں انہیں زیادہ علم ہوتا ہے اور نہ ہی وہ زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں اس لیے ان کے مشورے میں جان نہیں ہوتی۔ اس طرح کی صورتحال سے ہم ماضی میں بھی دوچار ہوتے رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک مثال لیجیے سی ٹی بی ٹی پر دستخط ہوئے لیکن قوم کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پارلیمنٹ کو اتنے اہم معاملے پر اندھیرے میں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ کابینہ کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ کالا باغ ڈیم قومی ایجنڈے

اکاؤنٹس کے انجماد اور شریعت بل جیسے قومی معاملات پر فیصلے ہوئے اور ہر فیصلے پر مشاورت کی تشنگی واضح طور پر نظر آئی۔ بار بار حکومتی فیصلوں کو دباؤ کے تحت بدلا گیا۔ ہم تو شریعت کے دعویدار ہیں ہم پر تو مشاورت اللہ تعالیٰ نے لازمی کر دی ہے۔ ہماری وزارت خارجہ اور خزانہ پر امریکہ کے گہرے اثرات ہیں۔ دوسرے شعبوں کی کارکردگی بھی تسلی بخش نہیں ان حالات وزارت داخلہ خفیہ اداروں اور دفاعی امور کا سیکورٹی کونسل میں شکل میں مربوط کرنا ناگزیر ہے۔ اسلام میں تو فوج اور سول کا الگ الگ تصور ہی موجود نہیں۔ ہم ایک غیر اسلامی تصور پر اسرار کیوں کرتے ہیں۔ آئین کے دائرے میں رہ کر ایسا کردار ادا کرنا ضروری ہے۔ محب وطن فوج کو مشاورت میں شامل کرنے کا خائف ہونا قابل فہم نہیں۔ کسی خاندانی بزرگ سے فیصلہ کن مشاورت ہو سکتی ہے تو باضابطہ طور پر ذمہ داروں سے کیوں نہیں ہو سکتی۔ ایسا وہی حکومت کرے گی جو عوام میں غیر مقبول اور احساس کمتری کا شکار ہو یا پھر کرپٹ اور بدعنوان حکمران ایسا کریں جو اپنے جرائم چھپانا چاہتے ہوں ورنہ فوج قوم میں سے ہے اسے گلی کا چوکیدار سمجھنے کے بجائے افراد خانہ میں شمار کرنا چاہیے۔ تاثر یہ دیا جاتا ہے کابینہ کی دفاعی کمیٹی کافی کام کر رہی ہے لیکن یہ کمیٹی رسمی طور پر کبھی کبھی کام کرتی ہے۔ اسے متحرک اور فعال بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا سیکریٹریٹ ہو، اس کا کوئی سربراہ ہو، تمام وزارتوں خصوصاً خفیہ اداروں کی بھرپور نمائندگی ہو۔ جن کی دنیا بھر میں اہمیت مسلمہ ہے۔ ان وزارتوں کی طرف سے باقاعدہ تحقیق اور مطالعہ کا سنجیدہ نظام ہو اور اس کی بنا پر فیصلے کیے جائیں اور اس کی صدارت خود وزیر اعظم کریں۔ دنیا بھر میں اعلیٰ پیمانے پر مشاورت کا ایسا نظام موجود ہے۔ برطانیہ میں فوج، خفیہ ایجنسیوں اور اہم وزارتوں کے باہمی قریبی روابط ہیں۔ چرچل نے حالت جنگ میں یہ ہنگامی کابینہ بنائی۔ چین میں فوج کا اہم کردار ہے۔ ملٹری کمیشن کے چیئرمین کا عہدہ سب سے اہم ہے۔ امریکہ میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے نام سے ایک ادارہ موجود ہے۔ جس کے سربراہ سینڈی برجر کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ جو وزارت خارجہ انٹیلی جنس ایجنسیوں اور دفاع کی نگرانی کرتے ہیں۔ اعلیٰ امور ان کی حدود سے اس لیے باہر ہیں کہ کیونکہ وہ ہم جیسی صورت حال سے دوچار نہیں۔ 1945 میں امریکہ ایٹمی قوت بن گیا تو نیشنل سیکورٹی کونسل کو ضروری خیال کیا گیا۔ پاکستان کے لیے بھی نیوکلیئر صلاحیت حاصل کر لینے کے بعد یہ لازم ہو گیا ہے کہ فوج اس صلاحیت کی حفاظت میں شامل ہو جائے۔ ہندوستان میں جسونت سنگھ کو دفاعی منصوبہ بندی کا کام سونپا گیا ہے۔ ہمارے ہاں اس پر کوئی توجہ ہی نہیں۔ اس تناظر میں نیشنل سیکورٹی کونسل کی تجاویز گہرے غور و فکر کی متقاضی ہے۔ اہل دانش کو اس پر سوچنا چاہیے کہ یہ زہر ہے یا تریاق ایسا نہ ہو کہ قومی مفاد کی ایک اہم تجویز کی کلی بن کھلے مرجھا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ جنرل جہانگیر کرامت کا پیش کردہ تصور ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہو۔ میرا تصور ان سے مختلف ہے ان کے بیان کی سیاسی نوعیت سے ہٹ کر ان کی تشویش لائق توجہ اور مشاورت کی تجویز درست تھی۔ اگر یہ ماورائے آئین تصور تھا تو ہمارے نظام میں فٹ نہیں بیٹھتا لیکن اگر وہ موجودہ انداز حکمرانی اور مختلف سرکاری اداروں کی خراب کارکردگی بلکہ ناکامی کی بات کر رہے تھے تو اس سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اب تک حکومت کے خود بھی بڑے بڑے فیصلے کیے وہ سب واپس لینے پڑے اس کی وجہ مشاورت کے بغیر عجلت میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ جنرل جہانگیر کرامت نے فیصلہ سازی کے ڈھانچے میں جس کمزوری کی نشاندہی

کی ہے۔ وہ غور وفکر کی متقاضی ہے اگر جنرل جہانگیر کرامت کی تجویز ماورائے آئین تھی تو پھر سوال یہ ہے کہ عوام میں اس کی غیر معمولی پذیرائی کی وجہ کیا تھی۔ ۶ اور ۷ اکتوبر کی چیختی چلاتی سرخیاں تو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ عوام کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے انہیں کوئی ریلیف مل گیا ہو۔ یہ دراصل عوام کی نام نہاد جمہوریت سے بیزاری کی ایک جھلک تھی۔ نام و نہاد جمہوریت کو یہ قوم کب تک سہارا دیتی رہے گی عوام اصلاح احوال چاہتے ہیں۔ جمہوریت اگر بانجھ ثابت ہوتی ہے تو انہیں کسی طرف تو دیکھنا ہوگا۔ قوم کی اس کیفیت پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہے اس سے صرف نظر کرنے سے مزید مسائل پیدا ہوں گے۔ اداروں کے اندر حوصلہ ختم ہو جائے گا۔ عدلیہ کی ایکٹوازم کے دنوں میں مجھے اصلاح احوال کی امید ہوگئی تھی۔ میرے خیال میں عدلیہ نرم انقلاب کی طرف پیش رفت کا سبب بن سکتی تھی۔ پھر نرم انقلاب کی مجھے تمنا رہی ہے لیکن سپریم کورٹ کا ادارہ اپنے ساتھ عوام کی توقعات بھی لے گیا۔ اب افواج پاکستان دشمنوں کا آخری ہدف ہے اس کو لتاڑا جا رہا ہے اور اس کے اعلیٰ عہدیدار کو ہٹائے جانے پر بغلیں بجائی جا رہی ہیں۔ تاہم فوج کو کمزور کرنے والے یہ مت بھولیں کہ طاقت خود اپنا راستہ نکال لیتی ہے۔ فوج کی طرف سے حال ہی میں روایت سے ہٹ کر اظہار خیال عوام کے سامنے کیا گیا ہے اس کا مذاق کا اڑانے یا اسے نظر انداز کرنے کے بجائے اسے سمجھنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ صورت حال اس قدر سنگین ہے کہ لوگوں کی نگاہ سے حقائق چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ قوم پر مایوسی طاری ہے اور مایوسی کی وجہ سے اجلت میں فیصلے ہو رہے ہیں۔ جہانگیر کرامت جیسے اعلیٰ عہدیدار سے اجلت میں ایسی تجاویز نہیں آنی چاہیے تھیں لیکن دراصل یہ قوم اور عسکری ادارے کی نفسیاتی کیفیت کا ردعمل تھا۔ مان لیا کہ حاضر سروس جنرل کا ایسی بات کرنا غلط تھا لیکن جو قومی خزانے سے تنخواہ لیکر پاک فوج کی تضحیک پر مبنی کالم اور مضامین لکھ رہے ہیں انہیں کیوں کھلی اجازت ملی ہوئی ہے؟

ایسے وقت میں جب تمام ریاستی ادارے عوام کی مایوسی کا سبب بن چکے ہیں۔ موجودہ نظام میں اصلاح احوال کا کوئی شجر برگ وبار نہیں لا رہا تو ریاست کے سارے ادارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر مٹی کے کچے برتنوں کی طرح ٹوٹ رہے ہیں۔ فوج جیسے مضبوط ادارے کو زیر دام لانے کی کوشش کرنا بلکہ یہ تاثر پھیلانا کہ ہم نے فوج کو بھی گرا دیا ہے کہاں کی دانشمندی ہے۔ حالانکہ ایک ماہ کے اندر پانی خود اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہے لیکن جب بادشاہ کی قوت بحال ہوگئی تو پھر اختلاف کرنے والے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج واحد ادارہ ہے جس پر قوم مشکل حالات میں قوم اعتماد کر سکتی ہے۔ اس کو بھی گھر کی لونڈی بنانے کے چکر میں منتشر کرنے کی کوشش کی گئی تو پھر لوگ کدھر جائیں گے اگر صورت حال بہتر کرنے کی آخری امید بھی دم توڑ جائے تو یعنی فوج اور حکومت کے مابین تناؤ کی کیفیت پیدا ہو جائے اور قومی سربراہ کو بھی رائے دینے کا خمیازہ بھگتنا پڑے تو بگاڑ کہاں تک جا سکتا ہے؟

جہانگیر کرامت خطوط اور ملاقاتوں میں حکومت کو باور کراتے رہے ہیں کہ وہ کس سمت میں جا رہے ہیں اور انہیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ کام ان سے پہلے والے بھی کرتے رہے ہیں۔ اس کے اندر مختلف ہو سکتے ہیں۔ تاہم پہلی بار انہوں نے ایک باضابطہ تجویز دی۔ کیا ان کے لیے یہ تاریخ کا سبق ہے؟ بڑوں کو نصیحت نہیں کی جاتی وہ

اسے توہین تصور کرتے ہیں اور یہ فوج کی پہچان عمل ہے، لیکچر دینا نہیں۔ جنرل جہانگیر کرامت نے اپنے منصب سے ہٹ کر جو اظہار خیال کیا وہ ایک طرح سے جمہوری معاون تھا۔ جبکہ سیاستدانوں کو اپنے گریبانوں میں جھانک لینا چاہیے۔ کیا ان کا رویہ جمہوریت کا معاون ہے۔ یا جمہوریت کا مخالف؟ جنرل جہانگیر کرامت کی تجویز (ترمیم کے ساتھ) اعتماد کا خلا کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے لیکن عجلت اور کم فہمی نے ایک بار پھر اپنا کام کر دکھایا۔

## اختیارات کا ارتکاز......طاقت کا کمزوری

اختیار خدمت کے جذبے سے استعمال کیا جائے تو نعمت ہے لیکن اگر بہت زیادہ طاقت کی ہوس تو اختیار مصیبت بن جاتا ہے۔ ہمارا نظام اس قدر زنگ آلود ہو چکا ہے کہ اس کے اندر پہلے سے موجودہ اختیارات بھی نا قابل استعمال ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسے اختیارات کا نتیجہ ریاستی ظلم و ناانصافی اور کرپشن کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اور محض خرابیوں کو جنم دیتا ہے۔ زیادہ اختیار اہلیت کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ ناچ نہ جانے والے کو آنگن ہمیشہ ٹیڑھا ہی نظر آتا ہے۔

بے لگام اختیارات کی راہ میں واحد رکاوٹ قومی پریس رہ گیا ہے۔ اگرچہ اس پر بھی وار ہو رہے ہیں تاہم حتمی وار کا انتظار ہے۔ قومی پریس نے بڑی حد تک آزاد اور غیر جانبدار پالیسی اپنائی ہے بلکہ قومی معاملات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب یہ خطرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ تمام ادارے غیر موثر ہونے کے بعد جب عوام کی توقعات پوری نہیں ہوں گی تو پریس عوم کی ترجمانی کا کام کرے گا تو آنگن کا یہ کونہ بھی ٹیڑھا دکھائی دینے لگے گا۔

ارتکاز اختیار کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ 1988ء میں ہمارے ایٹمی پروگرام کو روکنے کے لیے بیرونی دباؤ شروع ہوا تو صدر وزیراعظم اور آرمی چیف کے درمیان ٹرائیکا وجود میں آیا۔ وزیراعظم پر دباؤ پڑتا تو وہ صدر غلام اسحاق خان کا کہہ دیتیں کہ اولڈ مین رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ جب کہ صدر وزیراعظم کو موردالزام ٹھہراتا اور دونوں اپنی اپنی پروگرام کشمیر اور طالبان پالیسی کے حوالے سے ہم پر زبردست دباؤ ہے۔ وہ طالبان کو رول بیک کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں مختلف معاہدوں کے ذریعے ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ کشمیر کے تنازعے کو منجمد کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ جہاد کی روح مردہ ہو جائے۔ پاکستان میں اسلام اور اس کے نام لیواؤں کو دیوار سے لگانا چاہتے ہیں اس موقع پر مکمل اختیارات نے وزیراعظم کو بیرونی دباؤ کے سامنے کمزور کر دیا ہے۔ اگر ٹرائیکا موجود ہوتا تو دباؤ کو دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر دباؤ کم کیا جا سکتا تھا۔ اب وہ ہمیں اس مقام پر لے آئے ہیں۔ جہاں وزیراعظم براہ راست دباؤ میں ہوگا۔ وہ کہہ سکتے ہیں آپ با اختیار ہیں آپ کے ادنیٰ سے اشارے پر فوج کے سپہ سالار، ملک کے صدر اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو اس کے اختیارات سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ جو چاہیں کریں۔ اس لیے استعمار کو تنہا اور کامل اختیارات کا حامل حکمران سوٹ کرتا ہے۔ خواہ شاہ ایران ہو یا مارکوس چلی کا پنوشے ہو یا مصر کا حسنی مبارک ان کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی اس وقت ہوتی ہے جب وہ سیاہ و سفید کے مالک ہوں۔ ہمارے وزیراعظم کے لیے کلنٹن کا بلاوا ایک ایسے ہی وقت میں آیا ہے۔

بیرونی دباؤ ہی کے نتیجے میں ایمل کانسی کو امریکہ کے حوالے کیا گیا۔ یہ بے لگام اختیارات کا ہی نتیجہ تھا

کہ وزیراعظم نے بغیر کسی قانون کے اپنے شہری کو امریکہ کے حوالے کردیا۔ امریکہ نے پاکستان کی حدود سے گزر کر افغانستان پر حملہ کیا تو ہماری طرف سے ایک ضعیف سے احتجاج کے علاوہ کچھ بھی نہ کیا گیا۔ صرف یہی نہیں اور بھی بہت سارے معاملات ہیں۔ ہمارے حکمران خوشامدی درباریوں کی طرح جھک جاتے رہے۔ کیا آج اس دباؤ میں مزید اضافہ نہیں ہو جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اختیارات کے ارتکاز نے ہمیشہ بیرونی اور اندرونی طور پر خطرات سے دوچار کیا ہے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ وزیراعظم اکیلے اس دباؤ کو کس وقت تک برداشت کرسکتے ہیں کھڑے رہیں گے یا سرنڈر کردیں گے۔ قوم کے لیے یہ بہت بڑا رسک ہے۔ سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر سرتاج عزیز کے حالیہ بیانات کی روشنی میں تو نیشنل سیکورٹی کونسل کے خدوخال نہ تو آئین سے متضاد ہونے چاہیں اور یہ سب کچھ ممکن ہے بشرطیکہ حکمران تعصبات کے خول سے باہر نکل آئیں۔

# مہاجرین کا مسئلہ اور اللہ کا حکم

یہ 1994ء کی بات ہے، افغان مہاجرین حکومت پاکستان کے ہاتھوں سخت مصیبت اور ابتلاء سے دو چار تھے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت کا دوسرا دور تھا۔ پولیس مہاجر خواتین کی بھی تلاشی لے رہی تھی۔ انتظامیہ کے ستائے ہوئے کچھ افغانی میرے پاس اپنی دکھ بھری داستان لے کر پہنچے کہ ان کے ساتھ زیادہ ہو رہی تھی۔ میں نے وزیراعظم بینظیر بھٹو سے فون پر بات کی۔ انہوں نے دوسرے روز ہی مجھے کھلانے پر بلالیا۔ اس موقع پر طویل نشست میں بہت سے موضوعات پر گفتگو ہوئی لیکن میرا اصل مدعا افغان مہاجرین کے لیے ریلیف حاصل کرنا تھا۔ میں نے انہیں بتایا، یہ لٹے پٹے لوگ وہ عالمی طاقتوں کی آویزش کا نشانہ بنے ہیں، انہیں مزید دکھ نہیں دینا چاہیے، آپ ان کے یتیموں، بے آسرا بچوں اور خواتین کے سر پر ہاتھ رکھیں، اس سے آپ اور پاکستان اللہ تعالیٰ کی مدد کے مستحق ہوں گے۔ انہوں نے لائق تحسین حد تک میری تجویز پر فوراً عمل کیا اور خود پشاور جا کر افغانوں سے ملیں اور انہیں تسلی دی۔ ان کی مراعات بحال کر دی گئیں اور پولیس نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے۔

افغان مہاجرین کے معاملات نمٹاتے وقت ہمیں آج بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں۔ وہی اللہ جو ہمارا آئینی حاکم اعلیٰ ہے اور جس کا حکم ماننے کا ہم نے اقرار کر رکھا ہے جس کا اس ضمن میں واضح حکم موجود ہے۔

''جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی وہ سچے مومن ہیں۔'' (انفال۔74)

دوسرے مقام پر مجاہدین کی امداد کرنے والے مسلمانوں کی ان الفاظ میں تعریف و تحسین کی گئی ہے......

''یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے، اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔'' الحشر۔19)

ایک وقت تھا پاکستان کی سرزمین پر 35 لاکھ افغان مہاجرین آباد تھا۔ اس میں شک نہیں اس دور میں افغان کے لیے وافر بین الاقوامی امداد آ رہی تھی لیکن پچاس فیصد سے زیادہ اخراجات حکومت پاکستان کے کندھوں پر تھے لیکن اس سے پاکستان غریب نہیں ہوا۔ اللہ نے مہاجروں کے لیے، آسمان سے بارشیں برسائیں، ہمیں خشک سالی کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ افغان مہاجرین کی بے ریا امداد کے عوض ہمیں اللہ تعالیٰ نے بے شمار برکات سے نوازا۔ آج ہم مہاجرین کے مسئلے میں پریشان ہیں۔ بے شک یہ اہم مسئلہ ہے لیکن اس مسئلے کا ادراک کرنے کے

لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھا جائے کہ افغان مہاجری ہیں کون؟ اگر سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا گیا تو یہ مسئلہ گھمبیر ہو جائے گا۔ عقل و دانش کے بجائے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں جو درست طرزِ عمل نہیں۔ اس وقت پاکستان میں جو افغان مہاجرین ہیں، ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول: وہ جو پہلے مرحلے کے مہاجرین ہیں یعنی سوویت یونین کی بمباری کی وجہ سے پاکستان آئے۔ یہ لوگ 1980ء کے عشرے کے شروع میں پاکستان آئے۔ یہ مجاہدین کے ہم نوا تھے۔ ان کی اکثریت افغانستان کے دیہات سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ جفاکش، راسخ العقیدہ مسلمان اور اخلاقی اقدار والے لوگ تھے۔ بھکاری نہیں تھے بلکہ سخت محنت کرنے والے لوگ تھے۔ ان دنوں پاکستان کو لیبر کی ضرورت تھی اور ان لوگوں نے یہ ضرورت پوری کر دی، پاکستان کی زرعی، تعمیراتی اور صنعتی ترقی میں حصہ لیا۔ بلوچستان کے علاقوں دالبندین، نوشکی، کاکڑ، خراسان وغیرہ میں ان کی محنت سے وسیع و عریض غیر آباد رقبہ باغات میں تبدیل ہو گیا۔ ایسی جگہوں پر پانی کے چشمے اُبل پڑے جہاں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً دالبندین کو ہی دیکھ لیں وہاں روزانہ کوئٹہ سے اپنے سٹاف کو پانی پلانے کے لیے ریلوے بوگیاں جاتی تھیں، آج وہاں سبزیاں کاشت ہو رہی ہیں اور وافر پانی بھی موجود ہے۔ یہ افغان مہاجرین کی محنت کا ثمر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ صوبہ سرحد پر مہاجرین کا بہت دباؤ رہا لیکن ان کی وجہ سے وہاں لیبر سستی رہی۔ مانسہرہ کے علاقوں میں کاشتکاری کے فروغ میں بھی ان مہاجرین کا اہم حصہ ہے۔

دوئم: کابل پر قبضے کے بعد کمیونسٹ اور آزاد خیال افغانیوں نے پاکستان کا رُخ کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کابل سمیت شہری علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پاس پیسہ تھا اور ان کا رہن سہن اور لباس مغربی طرز کا تھا، اس لیے انہوں نے ہمارے شہروں میں پہنچ کر بے شمار خرابیاں پیدا کیں۔ فحاشی پھیلائی اور جرائم کے مرتکب بھی ہوئے۔ ان کے اخلاق و کردار کی وجہ سے یہاں عوام میں افغان مہاجرین کے خلاف تاثر پیدا ہونا فطری امر تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ابتدا سے ہی پاکستان کے خلاف تھے اور محض حالات کے جبر کی وجہ سے انہوں نے یہاں پناہ لی تھیں۔ دوسرے مرحلے کے ان مجاہدین کو شہروں کی بجائے کیمپوں میں رکھا جانا چاہیے تھا۔

سوئم: آخری مرحلے میں قحط سالی سے متاثر ہو کر ہزاروں افغانوں نے پاکستان کی طرف ہجرت کی ہے۔ اکا دکا خاندان خانہ جنگی کی وجہ سے بھی آئے لیکن اکثریت قحط سالی کی وجہ سے مہاجر بنی ہے۔ اس ہجرت کی ذمے داری مغرب پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے طالبان حکومت کو قحط سالی سے نمٹنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس کی ذمے دار اقوام متحدہ بھی ہے جس نے امریکہ کے اشارے پر اقتصادی پابندیاں لگا کر افغانستان میں قحط کی صورت حال پیدا کر دی۔ افغانوں کو موجودہ مصائب سے دو چار کرنے میں بھارت، روس، امریکہ اور بعض ہمسایہ ممالک بھی شامل ہیں۔ ان بیرونی سازشوں کی وجہ سے مہاجرین آج بھی پاکستان آ رہے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ پاکستان اقتصادی پابندیوں کا براہ راست

نشانہ بنے گا۔ میرے خیال میں یہ سازشیں بھارت اور اسرائیل کے ذہن کی تیار کردہ ہے۔ وہ باور کرا رہے ہیں کہ طالبان کی کامیابیوں کا ذمے دار پاکستان ہے حالانکہ اس میں کوئی صداقت نہیں۔ اس صورت حال میں پوشیدہ سیاسی چالوں کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ بھارت اگر افغان عوام کا اس قدر ہمدرد ہے تو افغان مہاجرین کی دیکھا بھال کی ذمے داری خود قبول کرے، ان کو اپنی سیاست چمکانے کے لیے استعمال نہ کرے۔ یہ تو پاسکتان ہے جس نے مہاجرین کو یہاں جگہ دے رکھی ہے۔ ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ وسط ایشیا سے روانہ ہونے والوں کی منزل ہمیشہ دہلی ہوتی تھی۔ یہ پاکستان کا بڑا پن ہے کہ اس نے انہیں مہمان بنا کر رکھا اور آزادی کے حصول میں ان کی مدد کی۔ اس پر بھارت کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ ہم نے مہاجرین کا بوجھ اور دباؤ اس پر پڑنے نہیں دیا۔ بھارت نے اس کے علی الرغم دشمنی والا رویہ اختیار کیا ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک آزاد اسلامی افغانستان یقیناً پاکستان کا دوست ہوگا جو بھارت کو کسی طرح قبول نہیں۔

اسی لیے سازشوں کے بیج بوئے جارہے ہیں۔

بھارت کی یہ سازش بہت خطرناک ہے کہ افغان قوم کو پاکستان سے متنفر کیا جائے۔ پاکستان کے خلاف یہ پروپیگنڈہ زوروں پر ہے کہ وہ افغان مہاجرین سے اچھا سلوک نہیں کر رہا۔ اگر مہاجرین کے دلوں میں پاکستان کے لیے نفرت پیدا کرنے میں سازشیوں کو کامیابی مل گئی تو یہ بہت بڑا خسارہ ہوگا۔ اس کے بعد بھارت یقیناً یہ بھی چاہے گا کہ اس کے قدم کابل میں جم جائیں۔ اگر بھارت کو کامیابی ملتی ہے تو یہ ہماری افغان پالیسی کی ناکامی ہوگی۔ افغان پالیسی کی ناکامی پہلے ہی بہت نقصان پہنچا چکی ہے۔ یہی حال ہماری تجارتی پالیسی کا ہے۔ کل تک افغانستان میں ساری فیصد تجارتی حصہ پاکستان کا تھا۔ آج اسی فیصد دیگر ممالک کی تجارت ہے۔ ہماری تجارت کی شرح گھٹ کی بیس فیصد رہ گئی ہے۔ اس میں ایران کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ایران طالبان کی مخالفت کر رہا ہے لیکن اس نے تجارتی پالیسی کی وجہ سے ساری مارکیٹ پر قبضہ کرلیا ہے۔

یقیناً پاکستان پر مہاجرین کا دباؤ بہت زیادہ ہے لیکن اس کے لیے جارحانہ طرز عمل مناسب نہیں، مہاجرین کا دباؤ کم کرنے کا فطری طریقہ اپنانا چاہیے۔ افغانستان کا پچانوے فیصد حصہ آزاد اور امن وسکون سے مالا مال علاقہ، تجارت اور کاروبار کے لیے موزوں ہے، ہم اپنے لوگوں کو ترغیب دیں کہ وہاں جا کر سرمایہ کاری کریں، اس کی تعمیر وترقی میں حصہ لیں۔ اس سے جہاں پاکستان کی ہنر مند افرادی قوت کو روزگار ملے وہاں افغان مہاجرین بھی بخوشی واپس جانے پر آمادہ ہوں گے۔ اس وقت افغانستان میں چینی، کپڑے اور سیمنٹ وغیرہ کے 120 ایسے کارخانے ہیں جو پچانوے فیصد مکمل حال میں ہیں۔ اگر پاکستان سرمایہ کار وہاں جائیں تو معمولی کوششوں سے یہ کارخانے چالو ہو سکتے ہیں۔ اس کا دونوں ملکوں کو فائدہ ہوگا اور افغان مہاجرین کی واپسی کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔ محض سرحد پر طاقت کے بل پر مہاجرین کو روکنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس سے نفرتیں پیدا ہوں گی۔ خود ہمارے قبائلی علاقوں اور افغانوں کے درمیان خونی رشتے ہیں لہٰذا جبر سے معاملہ بگڑے گا سلجھے گا نہیں۔

افغانستان کے تاجر طبقے کی ذمے داری تھی کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتا۔ افغان تاجر ساری دنیا میں تجارت کرتا ہے اور خاصا کامیاب ہے لیکن وہ افغانستان میں ایک کوڑی بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں، اس لیے کہ وہ اسلامی قواعد و ضوابط کے مطابق تجارت کرنے پر تیار نہیں۔ پاکستان میں ایسے بھی افغانی تاجر ہیں جو کروڑوں اربوں میں کھیلتے ہیں۔ آپ غربت افغان مہاجرین کے کیمپ اکھاڑنے کے بجائے ان تاجروں کو افغانستان بھجوانے کا بندوبست کریں۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ پاکستان اور افغانستان یک جان اور دو قالب ہیں۔ ہماری معیشت کا انحصار ایک دوسرے پر ہے۔ ایک کا نقصان دوسرے کا نقصان ہے۔ وہ پاکستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ ان کے نوجوان نسل ہمارے کلچر سے متاثر ہے۔ وہ اب بھی پاکستانی اخبار اور پاکستانی ٹیلی ویژن کے لیے ترستے ہیں۔ ایک قوم جب آپ کا عملاً حصہ بن چکی ہے تو آپ کیوں اس کو الگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ حکومت اور عوام کو چاہئے کہ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ افغانستان کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہیں گے۔، حالات بدلنا شروع ہو گئے ہیں اور ان کے ریلیف بھی آ رہا ہے۔ امریکہ بھی تا دیر اپنی موجودہ پالیسی کو برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ افغانستان کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔ ہمیں استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ایک غیور قوم کی عزت نفس کو مجروح و پامال نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ طالبان حکومت بھی پاکستان سے مشاورت کرے۔ باہم مل کر مہاجرین کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ افغانستان کی تعمیر و ترقی میں مال دار اور باصلاحیت افغانوں اور پاکستان کو شامل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ پاکستان کی حکومت اور عوام کو چاہئے کہ وہ مہاجرین کے بارے میں صبری کا مظاہرہ نہ کریں۔ مشکل وقت کٹ جائے گا۔ اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہئے کہ ہم مہاجرین کو دھکے دے کر نہیں نکال سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری ذمے داری ہے۔ ہمیں حوصلہ دکھانا چاہئے جیسے ہی افغانستان میں تعمیر و ترقی کا سلسلہ شروع ہو گا، ان کی واپسی شروع ہو جائے گی۔ افغانستان میں صنعت کا مستقبل انتہائی روشن ہے۔ کیونکہ وہ ملک معدنیات سے لبریز ہے۔ قحط و بدحالی ہمیشہ افغانوں کا مقدر نہیں رہے گی۔ آزمائش کی گھڑی گزر جائے گی۔ رحمت کی گھٹائیں چھائیں گی تو پاکستان پر بھی ضرور برسیں گی۔

یہی جذبہ ہمارا کشمیری مہاجرین کی طرف بھی ہونا چاہیے۔ ان کی تعداد 25 ہزار سے زیادہ نہ ہو گی اور ہم جو ملک کی شاہ رگ کے بارے میں بات کرتے نہیں تھکتے ان مہاجر بھائیوں کے بارے میں انتہائی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سیاسی جلسوں، پتنگ بازی اور شادی بیاہ اور سماجی دعوتوں پر تو بے پناہ خرچ کر دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق مہاجرین کو پناہ دینے اور اپنے رزق میں انہیں شریک کرنے سے گریزاں ہیں، اسی لیے تو ذات باری تعالیٰ نے ہم سے منہ موڑ رکھا ہے۔

......❁......

# کشمیر پالیسی کی ناکامیاں

## جمعیت المجاہدین جموں وکشمیر پاکستان

### روزنامہ نوائے وقت 24/5/06

پاکستان کی کشمیر پالیسی کی مکمل ناکامی کے آثار اور نتائج واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ کشمیر پالیسی میں منفی تبدیلیوں کا آغاز نائن الیون کے فوراً بعد ہی ہوگیا لیکن جنوری 2004ء میں اعلان اسلام آباد کے ذریعے پاکستان نے اپنے ہاتھ ہی کاٹ ڈالے۔ سب سے خطرناک بات یہ ہوئی کہ پاکستان نے تسلیم کرلیا کہ وہ آزاد کشمیر سے کسی کو مقبوضہ کشمیر میں داخل نہیں ہونے دے گا، پھر باڑ لگانے کی اجازت بھی دے دی گئی جو عملاً سرنڈر تھا۔ یہ ہماری قومی پالیسی سے مکمل انحراف بھی تھا۔ اور کشمیریوں کے حق پر ڈاکہ بھی۔ ہمیں کیا حق تھا کہ ہم کسی کشمیری کو اس کے اپنے وطن میں آنے جانے سے روکیں۔ لائن آف کنٹرول تو ویسے بھی دیوار برہمن ہے جسے کشمیر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ہم تو دینی، قومی، اخلاقی اور قانونی طور پر کشمیری قوم کے آئینی حقوق کے محافظ ہیں۔ ہم نے کشمیر پر "جوں کا توں معاہدہ" (Standstill Agreement) کر رکھا ہے، اس معاہدے میں پورا کشمیر شامل ہے، اس کو ہم بدل نہیں سکتے، یہ معاہدہ کسی اور نے بلکہ خود قائداعظم نے کیا تھا۔ اس معاہدے کے تحت ہم اہل کشمیر کو سہولیات بہم پہنچانے کے پابند ہیں نہ کہ انہیں اپنے ہی علاقے میں آر پار جانے سے روکیں۔

میں نے بہت پہلے کہا تھا کہ بھارت کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کون کشمیری لائن آف کنٹرول کو عبور کرتا ہے، بھارت تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تحریک مزاحمت دم توڑ جائے۔ وہ اس وقت تک پاکستان پر الزامات لگا کر دباؤ برقرار رکھے گا جس تک اس کا یہ ہدف حاصل نہیں ہو جاتا۔ پاکستان نے بھارت کی خاطر تحریک کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا لیکن بھارت ہماری "خدمات" کو یکسر نظرانداز کر کے الزامات لگائے جا رہا ہے، اس طرح صدر کرزئی بھی پاکستان پر الزام عائد کر رہے ہیں، اس کے باوجود کہ پاکستانی فوج ان کی خاطر سات سو سے زیادہ افراد کی قربانیاں دے چکی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا، خود پاکستان کی حکومت، فوج اور آزاد کشمیر حکومت تحریک آزادی کو کچل ڈالنے میں بھارت کی معاون بن گئی۔

پاکستان کے ساتھ کشمیر کا جسم و جان کا رشتہ ہے اس کی پہلی وجہ تو دو قومی نظریہ ہے۔ جو ہماری اساس اور جواز ہے۔ دوسری یہ ہے کہ پاکستان کی اقتصادی زندگی کشمیر سے نکلنے والے پانیوں کی رہن منت ہے۔ کشمیر پر بھارتی قبضے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وقت آنے پر وہ دو قومی نظریے کو باطل ثابت کرنا چاہتا ہے۔ جیسے کہ بنگلہ دیش

بننے پر بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے کہا تھا" ہم نے دوقومی نظریے کو خلیج بنگال میں ڈبو دیا۔" اسی مقصد کے لیے اس نے اکھنڈ بھارت کا شوشہ بھی چھوڑ رکھا ہے۔ آج کل بھارت سے جو بھی سیاست دان یا ناچ گانے والے آتے ہیں وہ ایک ہی بات کرتے ہیں کہ تقسیم غلط تھی، یہ ختم ہونی چاہیے۔ کشمیر سے آنے والے پانی سے ہی پاکستانی کی گندم، گنا، چاول اور ساری زراعت وابستہ ہے۔ بھارت اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ پیش گوئی کی جارہی ہے کہ آنے والے برسوں میں پانی کی شدید قلت ہو جائے گی۔ بھاشا ڈیم بھی 2016ء تک بننے کی نوید دی گئی ہے۔ اس وقت تک ہماری حالت کیا ہو چکی ہو گی؟ بگلیہار ڈیم کے ڈیزائن تبدیل کرنے کے ڈرامے سے ہمیں دھوکا دیا جارہا ہے لیکن اس سے دریائے چناب میں ستائیس فیصد پانی کم ہو جائے گا۔ نہ صرف پانی کم ہو جائے گا بلکہ ریت جمع ہو کر پانی کی روانی میں رکاوٹ بن جائے گی۔ اس نتیجے میں دریاؤں کا رویہ بھی بدل جائے گا۔ اگر مجاہدین نے وولر ڈیم کو تباہ نہ کر دیا ہوتا تو ہمارے لیے دریائے جہلم پر بھی مسئلہ پیدا ہو چکا ہوتا۔ دریائے چناب پر بھارت چھوٹے بڑے آٹھ ڈیم بنا رہا ہے۔ اس دریا کے پانی کو تو وہ کسی بھی وقت روک سکتے ہیں۔ ہماری تمام مشرقی دفاع لائن دریائے چناب سے نکلنے والی نہروں پر منحصر ہے۔ سیالکوٹ، لاہور اور دیپال پور کے علاقے میں ہمارے سب مورچے دریائے چناب سے نکلنے والی نہروں کے کنارے لگتے ہیں۔ دریائے سندھ پر لیہ کے مقام پر بھی ایک ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ ان کا پلان یہ ہے کہ پاکستان کو پانی کی مار دو تا کہ یہ سر کے بل چل کر آئیں اور کہیں حضور ہم سے غلطی ہو گئی تھی ہمیں اپنے ساتھ شامل کر لو، ہماری غلطی کو معاف کر دو۔

پاکستان کے قیام کے وقت ہیں 6500 کیوسک فی کس پانی پانی ملتا تھا، بعد میں صدر ایوب خان نے مشرقی دریا جو کشمیر سے نکلتے تھے بھارت کو دے دیئے، حالانکہ متنازعہ خطے کے کسی دریا کا فیصلہ کرنے کا انہیں کیا حق تھا؟ دوسرے لفظوں میں انہوں نے تقسیم کشمیر کا فیصلہ پہلے ......... یہ مزید کم ہو کر 750 کیوسک رہ جائے گا اور اس پر کون سی قوم زندہ رہ سکتی ہے۔ بھارت کے پیش نظر اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ وہ پاکستان کو کشمیر سے کاٹ کر اقتصادی شہ رگ سے جدا کرنا اور عملاً پاکستان کو تحلیل کرنا چاہتا ہے۔

قوموں کے فیصلے کبھی غلط بھی ہو جاتے ہیں، پالیسیاں ناکام بھی ہوتی ہیں، لیکن اس کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے اور ناکامی کی تلافی بھی ہو جاتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ غلطی تسلیم کی جائے۔ یہاں تو اصلاح کی بجائے غلطی پر اصرار ہے، جسے انگریزی میں "Investment in error" کہتے ہیں، یعنی آپ جو بیج کر گندم کاٹنا چاہتے ہیں۔ صاحب بصیرت لوگوں کو پہلے ہی نظر آ گیا تھا کہ اس میں پاکستان کے لیے رسوائی اور ملامت کے سوا کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ اپنے ہی دوستوں کی طرف سے خفت اُٹھانی پڑے گی۔ وہ لوگ جو پاکستان کی مٹی چومتے تھے، اس کی گھڑیوں کے ساتھ اپنا وقت ملاتے تھے، اس ملک کے چاہنے والے تھے، جو مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کے پرچم کو سلامی پیش کرتے تھے، اس پالیسی نے سب سے زیادہ ان کے دل دکھائے، مجاہدین کی شہادتوں میں اضافہ ہوا۔ پاکستان کے ان جانثاروں کے ساتھ زیادتی ہوئی حالیہ ضمنی انتخابات میں پہلی بار ووٹ کی شرح میں اضافہ کر کے پاکستان کی پالیسی پر اپنی مایوسی کا کھلا اظہار کیا۔ اس کو بھی چھوڑیں پاکستان کے ہاتھ کیا

آیا؟ حریت کانفرنس جو سیاسی محاذ پر ہماری اصل وقت تھی، مجہول رویے کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ کشمیریوں کا اتحاد پارہ پارہ ہوا۔ آج وہ جان چکے ہیں ان کا اتحاد نہ ہونے میں ان کی خطا نہیں بلکہ پاکستان کا قصور ہے۔ جس نے انہیں مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لیے سبز باغ دکھائے۔ وہ عملیت پسند تھے لیکن ان کی تصوراتی اڑان اس قدر اونچی کر دی گئی جس کا حشر یہی ہونا تھا۔ پاکستان نے کشمیری قوم کا اپنی قیادت پر اعتماد ختم کر دیا۔ چنانچہ عوام ان سے الگ ہوگئے، آج کشمیر قیادت کے بغیر ہے۔ صرف سید علی شاہ گیلانی ہیں لیکن ان کو پاکستان کی حمایت ہی حاصل نہیں، اس سے صورتحال مزید پیچیدہ ہو رہی ہے۔

پاکستان کی پالیسی کے خراب نتائج کے باوجود کشمیر کی تحریک عوامی اور عسکری سطح پر جاری ہے اور جاری رہے گی۔ مجاہدین بھارتی قابض فوج کے خلاف آج بھی نبرد آزما ہیں، لیکن اس کا جواب آنا شروع ہوگیا ہے۔ یہ جواب آپ بلوچستان میں دیکھ سکتے ہیں، کبھی کبھار کراچی اور دوسرے شہروں میں بھی اس کا ردعمل دکھائی دیتا ہے۔ کراچی کے مقدس اجتماع میں جو کچھ ہوا، اس میں بھارتی ہاتھ کی یاس آرائیں ہو رہی ہیں۔ اب ایسا نظر آتا ہے کہ مسئلہ ختم ہونے والا نہیں۔ بھارت نے کشمیر میں تشدد ختم نہیں کیا جب کہ ہم نے اعتماد سازی کے نام پر سازی لچک دکھا دی۔ بھارت نے اعتماد سازی کے اقدامات (CBMs) کو فہم اور ثقافت کے تبادلوں تک محدود رکھا ہوا ہے۔ وہ کسی مثبت پیش رفت کے لیے تیار نہیں۔ بگیہار ڈیم کو تکنیکی بحث میں الجھا دیا گیا ہے۔ سیاچن میں بھی وہ من مانی کر رہے ہیں۔ نام نہاد دوستی کا جھانسا بھی دیتے ہیں اور دفاعی بجٹ میں اندھا دھند اضافہ بھی کر رہے ہیں۔ پاکستان کی پالیسی کی کمزوری نے خود ہی کو نقصان پہنچایا۔ ہمارا اصل ہتھیار جرأت اور شجاعت رہا ہے، متحدہ ہندوستان میں ہم اقلیت میں تھے لیکن اس کے باوجود ہماری دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس رعب نے پاکستان کے کردار میں اہم کردار ادا کیا۔ صدیوں تک پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ کچھ بھی کر گزرنے اور مرنے مارنے والے لوگ ہیں لیکن جہاد کو بدنام کر کے ہم نے خود اس اثاثے کو گنوایا ہے' اپنی یہ طاقت کھو دی۔ یہی جذبہ اور طاقت تھی جس کو بنیاد بنا کر قائداعظم نے کہا تھا۔

"We shall have India divided or India destroyed"

(ہندوستان کو تقسیم کریں گے، ورنہ تباہ کر دیں گے) ان کے سامنے قائداعظمؒ کی بات تسلیم کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے قائداعظم کھوکھلا نعرہ نہیں لگاتے۔ وہ جو کہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ ہم نے اس جذبے کو ضائع کر دیا، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بازیابی کے لیے ہمیں طویل اور صبر آزما جدوجہد کرنی پڑے گی۔

کشمیر پر جو بھانت بھانت کے فارمولے دیے گئے اس کا مقصد مسئلہ کشمیر کو حل کرنا نہیں بلکہ امریکہ کو خوش کرنا تھا۔ سوال یہ ہے کہ امریکی فرمانبرداری میں اتنا آگے جانے کے باوجود کیا امریکہ ہم سے مطمئن ہوگیا؟ نہیں...... امریکہ مطمئن ہوتا تو بھارت کے ساتھ معاہدہ اور ہمیں نظر انداز نہ کرتا۔ امریکہ نے بھارت کے ایٹمی کلب کا رکن بنا لیا اور ہمارا ایٹمی پروگرام اس نے ابھی تک انسانیت کے لیے خطرناک قرار دے رکھا ہے۔ امریکہ کی نگاہ میں ہماری وہ عزت ہے جو کسی کمزور اور کاسہ لیس ملک کی ہونی چاہیے۔ کونڈولیزا رائس کھل کر کہہ

رہی ہیں ہم نے پاکستان کے لیے "گاجر اور ڈنڈے" (Carrot and Stick) کی پالیسی اپنا رکھی ہے، پاکستان پر مسلسل دہشت گردی کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے لیے اسے ناکام ریاست قرار دیا جا رہا ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے اپنی پالیسی کے جو ممکنہ فائدے بتائے تھے۔ وہ سراب ثابت ہوئے، الٹا نقصان ہوا۔ ہم نے کشمیر کا مسئلہ بھنور کی نظر کر دیا، جہاں وہ چکر کاٹ رہا ہے اور اس کی کوئی منزل دکھائی نہیں دیتی۔ اس مسئلے کو راہ راست پر لانے کے لیے ہمیں مزید کتنی قربانیاں دینی پڑیں گی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ سرنگ کی دوسری طرف روشنی دکھائی دینے کا جو دعویٰ کیا گیا تھا، وہ نظر کا فریب ثابت ہوئی۔ شاید روشنی عالم خواب میں دیکھی گئی تھی، ورنہ کسی اور کو بھی نظر آ جاتی۔ ہمارا لچک در لچک کا سفر ابھی تک کسی منزل تک نہیں پہنچا، بھارت نے کوئی لچک نہیں دکھائی، اسے ہماری کمزوری سے یہ حوصلہ ملا کہ اونتی پورہ (سری نگر) کے ائربیس کو وسعت دے رہا ہے۔ حال ہی میں اس نے فوجوں میں مزید اضافہ کیا ہے۔ افغانستان اس نے اپنے لوگوں کی حفاظت کے لیے کمانڈوز بھیج دیئے ہیں۔ اور افغان حکومت جو زبان استعمال کر رہی ہے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ کابل کی نہیں دہلی کی زبان ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے تاجکستان میں دوشنبے کے قریب اپنا ایک بہت بڑا فوجی اڈا بنا لیا ہے۔ ایک ماہ بعد وہاں مگ 29 کے دو سکوارڈن تعینات کر دیئے جائیں گے۔ بھارت کے مقاصد سمجھنا مشکل نہیں......اونتی پورہ، دوشنبے اور کابل ملا کر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے خلاف گھیرا مکمل کیا جا رہا ہے۔ اسلام آباد، دوشنبے اور اونتی پورہ سے لڑاکا طیارہ کی صرف بیس منٹ کی مسافت پر ہے۔ بھارت اپنی ائیر فورس کی طاقت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے اور ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان یہ ہوا ہے کہ ہم نے کشمیریوں کا بھروسہ کھو دیا دوسری طرف بین الاقوامی طاقتوں کو اپنا کھیل کھیلنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ انہوں نے اپنا کھیل شروع بھی کر دیا ہے۔ کشمیریوں کا بھروسہ کھو دیا دوسری طرف بین الاقوامی طاقتوں کو اپنا کھیل کھیلنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ انہوں نے اپنا کھیل شروع بھی کر دیا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ امریکہ افغانستان اور عراق میں پھنسا ہوا ہے ورنہ اب تک یہ کھیل مکمل ہو چکا ہوتا۔

نجات کا راستہ موجود ہے اور مایوسی کفر ہے، مجھے یقین ہے، ہماری غلطیوں سے کشمیر کی تحریک جس اندھیری سرنگ میں گھر گئی ہے، سے نکلنے کا امکان اب بھی موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان کی قیادت کو احساس بھی ہے کہ اس نے غلطی کی ہے؟ اس لیے جب تک غلطی کا ادراک اور اعتراف نہ کیا جائے اصلاح ممکن نہیں ہوتی۔ اصلاح احوال سے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں نے اس پالیسی کے نتیجے میں مار کھائی ہے جن میں کشمیر عوام اور مجاہدین قابل ذکر ہیں ان کو مطمئن کیا جائے۔ اصلاح اور رجوع کا راستہ ہر وقت کھلا ہوتا ہے لیکن اس پر چلنے کا ارادہ چاہیے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی قیادت سے اپیل کریں کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرے اور اصلاح کا راستہ اختیار کرے، وہیں لوٹ جائے جہاں سے غلطی کا سفر شروع کیا تھا۔ میرے خیال میں اصلاح احوال کے لیے فوری طور پر مندرجہ ذیل اقدامات ناگزیر ہیں۔

ا۔ کشمیر پر پالیسی کی سمت درست کرنا ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے اقوام متحدہ نے کشمیر پر قراردادوں کو اُٹھا کر باہر نہیں پھینک دیا جو مسئلے کی بنیاد ہیں "معاہدہ جوں کا توں" ابھی موجود ہے۔ اس لیے ہمیں

مختلف فارمولوں کے ویرانوں میں بھٹکنے کے بجائے اپنے موقف کی تجدید کرنی چاہیے۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں پر ڈٹ جانا چاہیے۔

۲۔ کشمیریوں میں آزادی اور جدوجہد کا جذبہ موجود ہے۔ وہ تھکے نہیں، ان کے خلاف یہ پروپیگنڈا قطعاً غلط ہے کہ وہ اس جدوجہد سے اُکتا چکے ہیں۔ تاہم تحریک کو دوبارہ اپنے پیروں پر اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ کشمیریوں میں آزادی کا احساس تازہ کریں۔ آزادی ملے گی تو تھکن کا احساس بھی دور ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حریت کانفرنس کو دوبارہ منظم کیا جائے۔ وہ ایک ہونگے تو پھر قیادت کا فیصلہ بھی خود کریں گے۔ اور جو حقیقی قائد ہوگا ابھر کر آئے گا۔

۳۔ مذاکرات کا دروازہ نہ کھلا رکھیں، لیکن بے مقصد مذاکرات سے جلد سے جلد پیچھا چھوڑ دیا جائے۔ کشمیری قیادت کو بھی یہ باور کرانا چاہیے۔ کہ ان کو مجاہدین اور عوام سے تعلقات درست کر لینے چاہئیں، بھارت سے مذاکرات مشق فضول ہیں۔ وہ لوگ جو پاکستان میں ہمارے مہمان بن کر آتے ہیں، انہیں اپنی عزت کا پاس ہونا چاہیے۔ اگر ان کی پالیسی بھی وہی رہی جو اسلام آباد والوں کی ہے تو انہیں مستقلاً اسلام آباد یا دہلی میں بیٹھنا پڑے گا، کشمیر میں ان کے لیے کوئی کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ وہ جتنا جلد فیصلہ کرلیں ان کے حق میں بہتر ہے۔ وہ اعلان کر دیں کہ ہم نے بھارت کے ساتھ مذاکرات کر کے ہر طرح کی کوشش کی لیکن بھارت ٹس سے مس نہیں ہوا اس لیے ہم اس سے لاتعلق ہو رہے ہیں۔

۴۔ جہاد جاری رکھنا ہوگا جو ہماری اصل طاقت ہے۔ دہشت گردی کے لیبل کے خوف سے جہاد ترک نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان اپنے عقیدے پر قائم ہوگا تو دلوں پر اس کا سکہ رواں ہوگا جو مسلمان غلامی قبول نہیں کرے گا اور جو استعمار کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کرے گا وہ بہر حال دہشت گرد کہلائے گا۔ اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ مجاہدین مزاحمت ضروری کریں مگر ثابت کر دیں کہ وہ دہشت گرد نہیں۔

۵۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چین کو اس معاملے میں شامل کیا جائے، اس لیے کہ چین بھی ایک پارٹی ہے چین پہلے ہی امریکہ کی اسی خطے میں موجودگی کو پسند نہیں کرتا۔ شنگھائی کانفرنس نے اعلان کر دیا ہے کہ اب امریکہ کو یہاں سے نکل جانا چاہیے اگر امریکہ یہاں سے نکل جاتا ہے تو مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے خاصی پیش رفت ممکن ہے، جو بھی صورت پیش آتی ہے، چین کی اس معاملے میں شمولیت ضروری ہے۔

۶۔ اس وقت امریکہ ایک ڈوبتا ہوا جہاز ہے۔ ہندوستان نے ڈوبتے ہوئے جہاز کا ٹکٹ کیوں کٹوا لیا؟ غالباً اس لیے کہ امریکہ یہاں سے نکلے گا تو اس خلا کو پُر کرنا آسان ہوگا۔ وہ تیل کے ذخائر سے مالا مال علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، تاکہ چین کو باہر اور پاکستان کو دباؤ میں رکھا جا سکے۔ اس لیے اس کے کسی بھی منصوبے میں کشمیر پاکستان کے حوالے کرنا فٹ نہیں بیٹھتا لیکن بھارت کے یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ وہ تو خود ایک ایسی کشتی ہے جس کے پیندے میں اَن گنت چھید ہو چکے ہیں۔

۷۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امریکہ اور اسرائیل بھی بھارت کی پشت پر ہیں۔ اسرائیل ہر طرح سے اس کی

مدد کر رہا ہے۔ ہندوؤں اور یہودیوں میں دفاعی تعاون عروج پر ہے لیکن شاخ نازک پر بننے والا آشیانہ ناپائیدار ہوا کرتا ہے۔ کشمیر کے علاوہ اس وقت بھارت میں آزادی کی پندرہ بڑی تحریکیں چل رہی ہیں۔ خصوصاً نو ریاستوں میں ماؤسٹ تحریک کا زبردست غلبہ ہے۔ 76 اضلاع میں ماؤسٹوں کی تحریک جڑیں پکڑ چکی ہے۔ اس لیے بھارت کا سپر پاور بننے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا اُلٹا اس کا وجود خطرے میں لہٰذا گھبرانے کے بجائے ہمیں صبر کرنا چاہیے۔ اگر وقت اجازت نہیں دیتا، تو انتظار کرلیا جائے۔ انتظار کی ایک بڑی مثال چین کی ہے۔ 1888ء میں جب میک موہن لائن کھینچ کر اور ایک نقشہ بنا کر برطانوی وزراء نے چین کو بھجوایا تھا تو اس نے اس کا جواب ہی نہیں دیا تھا۔ بار بار جواب طلب کیا گیا لیکن چین تب کمزور تھا، اس نے جواب نہیں دیا، اچھے وقت کا انتظار کیا۔ 1920ء میں جب چین نے طاقت پکڑ لی تو اس مسئلے کو دوبارہ زندہ کرلیا۔ اور اب وہ اسے اپنی مرضی سے حل کرسکتا ہے اور آج بھارت خود میک موہن لائن پر معاملہ کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ جلد بازی سے غلط فیصلہ کرنے سے بہتر ہے کہ ہم انتظار کریں۔ بڑے بڑے مسائل راتوں رات حل نہیں ہوتے، لیکن اس کے لیے حوصلے اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے موقف سے دستبردار نہ ہوں، ثابت قدم رہیں وقت بدلنے کو ہے، انشاء اللہ۔

# مسئلہ کشمیر...... مذاکرات اور ثالثی کے جال

وزیراعظم نواز شریف نے حال ہی میں قومی ایجنڈے اور کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا اعلان کیا تو اس کے بعد بحث ایک نئے رُخ پر چل پڑی۔ اس سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس فضا میں مسئلہ کشمیر پس منظر میں دھکیل دیا گیا ہے اور قومی ترجیحات میں ہماری موت و حیات کے مسئلے کو ثانوی حیثیت دی جا رہی ہے۔ یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ کہیں قوم اس مسئلے کو کم اہمیت نہ دینے لگے۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد خطے میں جو غیر معمولی تبدیلی آئی ہے اس کا ادراک ضروری ہے۔ تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ امریکہ کا رویہ تبدیل ہوا ہے، خود ہندوستان نے بھی اپنا موقف بدلا ہے۔ انتہا پسند ایل کے ایڈوانی جو کل تک آزاد کشمیر پر حملے کی دھمکیاں دے رہا تھا اب لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد قرار دینے کی پیش کش کر رہا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے بارے میں طرز فکر میں علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر غیر معمولی تبدیلی کے باوجود قوم اس مسئلے پر اس قدر متوجہ نہیں ہو رہی ہے جتنی ضرورت تھی۔ مجھے یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ امریکہ کی سوچ کے بدلتے زاویوں اور ہماری لاپروائی سے کہیں تحریک آزادی کشمیر اور جدو جہد آزادی کو ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔ قوم کو اسی طرح ہوشیار اور بیدار رہنا ہوگا جس طرح وہ اپنی ایٹمی صلاحیت پر مستعد چوکیدار کی طرح پہرہ دیتی رہی۔

امریکہ نے حال ہی میں مسئلہ کشمیر کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کے حل پر زور دیا ہے۔ مگر وہ بھارت اور پاکستان کو شملہ معاہدے کی روشنی میں مذاکرات کا مشورہ دے رہا ہے، حالانکہ شملہ معاہدہ فرسودہ ہو چکا ہے اور مسئلہ کشمیر کے حل میں یہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ حکومت پاکستان نے دوطرفہ مذاکرات کے ضمن میں یہ موقف اپنایا ہے کہ ماضی میں دوطرفہ مذاکرات بے سود رہے ہیں ۔اس لیے اب بھی ان کی افادیت مشکوک ہے۔ البتہ یہ معلوم نہیں کہ حکومت کب تک اس موقف پر ڈٹی رہے گی۔ حال ہی میں بنگلہ دیش کی وزیراعظم حسینہ واجد نے بھارت اور پاکستان کا دورہ کیا تاکہ دونوں ممالک کے مابین کوئی مصالحتی کردار ادا کریں۔ بھارت نے ان کی ثالثی کی پیشکش پر خاموشی اختیار کی ہے، تاہم یہ سارک سربراہ کانفرنس کے کولمبو میں ہونے والے اجلاس کے لیے حالات سازگار بنانے کی کوشش دکھائی دے رہی تھی۔ اب یہ سوال سامنے ہے کہ آیا کسی ثالث کی امداد مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ جنیوا میں پانچ بڑوں کے اجلاس میں بھی پاکستان اور بھارت سے کہا گیا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ حل کریں تاہم انہوں نے کوئی طریقہ کار نہیں بتایا صرف اصرار کیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اقوام متحدہ کی واضح قراردادوں کی روشنی میں یہ مسئلہ حل کرنے کی تجویز پیش کی جاتی لیکن ابھی تک دوطرفہ مذاکرات یا ثالثی پر بات ان کی ہوتی ہے۔

''ثالث بخیر'' ہمیشہ مسئلہ کشمیر کو مزید پیچیدہ بناتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر پر ثالثی ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے مجاہد جو سری نگر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ان کے بڑھتے قدم روک دیئے گئے۔ آج

تک ہم اس ثالثی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ کاش ہم ثالثی کے اس دام فریب میں نہ آئے ہوئے۔۱۹۶۲ء میں جب ہندوستان چین کے ہاتھوں شکست سے دو چار ہو رہا تھا نہرو کے ایما پر امریکہ نے مداخلت کی اور مسئلہ کشمیر کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کی ذمہ داری اُٹھائی۔ اس کا تذکرہ ایوب خان کی کتاب "Friends not Master" میں موجود ہے۔ سردار سورن سنگھ اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات کے چھ دور ہوئے لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ ماضی قریب میں ہم نے جنیوا میں جیتی ہوئی بازی بھی ثالثی کے اسی ڈرامے میں ہار دی اور مجاہدین کی کامیابی کو شکست میں بدل دیا اور سرزمین افغانستان میں ایک اسلامی حکومت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس میں امریکہ کی چالیں اور سازشیں شامل تھیں۔ ہماری بہت سی کامیابیوں کو ثالثی کی آڑ میں ناکامی میں بدل دیا گیا۔ ''ثالثی'' نے مشرق وسطیٰ میں بھی گل کھلائے ہیں۔ نہر سویز پر قبضے کے بعد جب مصری فوجیں صحرا سینا میں پیش قدمی کر رہی تھیں تو فوراً ثالثی کا ڈول ڈالا گیا۔ اس کے نتیجے میں ''کیمپ ڈیوڈ معاہدہ'' وجود میں آیا۔ بعد ازاں اس کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی کوکھ سے اوسلو معاہدے نے جنم لیا۔ اوسلو معاہدے کے ذریعے فلسطینیوں کی پچاس سالہ تحریک آزادی کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ اسی طرح بوسینا میں جب تک مسلمان پٹ رہے تھے، کسی کو ثالثی کا خیال نہیں آیا، لیکن جب انہوں نے دیکھا یورپ کے قلب میں ایک جادمرکز ابھر رہا ہے تو انہوں نے حسب روایت ثالثی کا جال بچھا دیا۔ اس کے نتیجے میں ''ڈے ٹن معاہدہ'' ہوا۔ اس معاہدے کا نشانہ آج کوسووا کے مسلمان بن رہے ہیں۔ اگر استعماری قوتیں بوسنیا کے جہاد کو جاری رہنے دیتیں تو آج کوسووا کے مسلمان ظلم کی چکی میں پس نہ رہے ہوتے بلکہ آزادی کے لیے کئی منزلیں طے کر چکے ہوتے۔ ثالثی کے نام پر ایک طرف بوسنیا کے مسئلے کو الجھا دیا گیا اور دوسری طرف کوسوو کے مسلمانوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ غرضیکہ مسلمانوں کے معاملے میں اسلام دشمن قوتیں ہر مقام پر منصف ثالث نہیں ہوئیں۔

یہ بات بہت اہم ہے کہ آج بڑی طاقتوں کو احساس ہو گیا ہے کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا حالات بگڑتے جائیں گے۔ اگر ہم نے انہیں یہ امید دلا دی کہ اصل اور اصولی حل کے بغیر بھی مسئلہ کشمیر حل ہو سکتا ہے تو پھر ہم مارے جائیں گے۔ لیکن اگر ہم اپنے اصولی موقف پر ڈٹے رہے تو جس طرح جرأت عمل سے ہم ایٹمی طاقت بننے میں کامیاب ہو گئے کشمیر کو آزاد کرانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ اس وقت تناؤ میں اضافہ مسئلہ کشمیر کے حق میں ہے اگرچہ جنگ کا فوری طور پر خطرہ نہیں تاہم ہمیں جنگ گریزاں پالیسی نہیں اپنانی چاہیے۔ ہماری پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ ہم جنگ سے بچنے اور گریز کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے لیکن اگر اس سے نتائج برآمد نہیں ہوتے تو پھر جنگ کی راہ اپنانا مجبوری ہے۔

### تنگ آمد بجنگ آمد

بدقسمتی سے ہمارے حکمرانوں میں جرأت اور وژن کا فقدان ہے۔ ہر حکومت کو صحیح راستے پر رکھنے کے لیے دباؤ ڈالنا پڑتا ہے۔ مسئلہ کشمیر پر حکومت کو غلط راستے کا انتخاب کرنے سے روکنے کے لیے لازم ہے کہ حکومت پر اسی طرح کا دباؤ بڑھایا جائے جو ایٹمی دھماکوں سے قبل حکومت پر ڈالا گیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کو اس پر بڑی یکسوئی سے کام کرنا چاہیے۔

امریکہ پاکستان کی جوہری صلاحیت پروان چڑھنے سے تو روک نہیں سکا، اب اس کی پریشانی یہ ہے کہ

جہادی عمل کو کیسے روکا جائے۔ وہ چین کے کان میں بھی سرگوشیاں کر رہا ہے کہ جہاد تمہارے لیے بھی خطرہ ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں، چین ہمارا عظیم ہمسایہ دوست ملک ہے۔ وہ عالم اسلام کا بھی دوست ہے۔ ہمارا اس کے ساتھ کوئی تناؤ رہا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ لیکن امریکہ اسے مسئلے بنا کر چین سے ہمارے تعلقات خراب کرنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔ ان حالات میں ایک طرف ہمیں چین کو مطمئن کرنا ہے اور دوسری طرف جہاد کشمیر کو آگے بڑھانا ہے۔ مجاہدین کشمیر کی مادی مدد میں اضافہ کرنا چاہیے تاکہ جہاد میں تیزی پیدا ہو سکے۔

ہندوستان نے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے بعد جو پسپائی اختیار کی وہ اس کی نفسیاتی شکست ہے۔ کشمیر میں ان کی عسکری کیفیت میں بھی مایوسی صاف جھلکتی ہے۔ حال ہی میں ایڈوانی نے اعلان کیا ہے کہ وہ کشمیر میں مزید افواج بھیجیں گے۔ لیکن ''ٹائم'' اور ''نیوزویک'' ہمیں یہ باور کرانے کوشش کر رہے ہیں کہ کشمیر میں صورتحال ہندوستان کے مکمل کنٹرول میں ہے۔ یہ سراسر غیر حقیقی تجزیہ ہے اور اس کے اندر بھی ایک سازش ہے اگر بھارت کا کنٹرول ہے تو کشمیر میں مسلسل فوجی اضافے کا کیا جواز ہے؟ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ کشمیر میں مقیم بھارتی فوج پر محض تھکاوٹ کے ہی آثار نہیں بلکہ اپنے سیاستدانوں کے خلاف ان میں جذبہ بغاوت بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اس صورتحال میں کہ جب دو چار ہاتھ ہی لب بام رہ گیا ہے ہماری حکومت نرمی اور کاہلی دکھاتی ہے تو قوم کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دینی چاہیے۔ پاکستان کا جغرافیہ اور تاریخ محض ایٹمی دھماکوں سے تبدیل نہیں ہوگا، بلکہ ان دھماکوں کے اثرات سے مسئلہ کشمیر حل ہوگا اور کشمیر کے حل سے صورتحال تبدیل ہوگی۔

بھارت کی پوزیشن کمزور ہے مگر مذاکرات کا کوئی جواز نہیں بنتا اس لیے کہ جب آپ مذاکرات کی محفل سجائیں گے تو پھر اس میں تجارت کی بات ہوگی اور آپ سے یہ بھی کہا جائے گا کہ کشمیر میں مجاہد نہ بھیجیں حالانکہ پاکستان نے کوئی عملی امداد فراہم نہیں کی، مگر پھر کہا جائے گا کہ بیس کیمپ میں جہادی سرگرمیاں روک دی جائیں۔ ہمیں تو کشمیر پر ایک قدم آگے بڑھانا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ بیس کیمپ کو تقویت دیں اور اسے جہاد کی پشتیبانی کے لیے یکسو کریں نہ کہ پہلے کی پوزیشن سے بھی پسپا ہو جائیں۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ آزاد کشمیر کو اعلان جہاد کر دینا چاہیے۔ یہ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ تحریک آزادی میں بھرپور کردار ادا کرے اور تاخیر نہ کرے کیوں کہ پہلے ہی کافی تاخیر ہو چکی ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ دونوں طرف کے کشمیری الحاق پاکستان کا اعلان کریں اس ضمن میں ان کے جائز مطالبات اور شرائط کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ بے شک انہوں نے آزادی کے لیے لازوال قربانیاں دی ہیں مگر انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آج اگر بین الاقوامی سازش خطہ متارکہ جنگ کے آس پاس تقسیم کشمیر کی لکیر کھینچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو نقصان کس کا ہوگا؟ صرف پاکستان چاہتا ہے کہ تقسیم کشمیر نہ ہو لہٰذا اس کا واحد حل یہ ہے کہ وہ پاکستان سے ملنے کے معاملے میں یکسو ہو جائیں۔ الحاق پاکستان کے لیے مراعات کا پیکیج پہلے ہی طے کر لیں۔ زیادہ بہتر ہے کہ ہم ''برنک مین شپ'' پالیسی اختیار کر لیں اور اس کے نتیجے میں جنگ بھی ہو سکتی ہے۔ ہم یہی دعویٰ تو کر رہے ہیں کہ اگر مسئلہ کشمیر حل نہ ہوا تو جنگ ہو جائے گی۔ ظاہر ہے جنگ کی صورت میں ایٹم بم کشمیر میں نہیں چلیں گے بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے اندر تباہی مچائیں گے۔ ان حالات میں پاکستانی قوم قوم کو بہت کچھ داؤ پر لگانا ہوگا۔ ہم کشمیر کی خاطر پہلے ہی تین جنگیں لڑ چکے ہیں اور اگر مستقبل میں ایک اور ہولناک جنگ پاکستان پر مسلط کی

جائے تو پھر یہ علم تو ہو کہ یہ جنگ کس مقصد کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اہل کشمیر واضح طور پر الحاق پاکستان کا اعلان کریں تا کہ بے یقینی کے بادل چھٹ جائیں اور پوری پاکستانی قوم تحریک آزادی کو تقویت دے سکے۔ میں اہل کشمیر پر اپنی رائے مسلط نہیں کرتا، تاہم نہیں دعوت فکر دیتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ دہلی اور اسلام آباد دو طرفہ مذاکرات کے ذریعے یا کسی ثالث کے ذریعے کشمیر کا کوئی فیصلہ کشمیریوں کی عدم موجودگی میں کریں گے تو مجاہدین کشمیر اسے قطعاً قبول نہیں کریں گے۔ کشمیری عوام کے دل اور دماغ اسی صورت میں کسی فیصلے کا ساتھ دے سکتے ہیں جب کہ حل رائے شماری کے ذریعے تلاش کیا جائے۔ کشمیر کا مسلمان قربانی دے رہا ہے اس لیے کہ یہ طے ہے کہ غاصب کو بالآخر یہ خطہ چھوڑنا پڑے گا۔ ایٹمی دھماکے کے بعد ہندوستان کی گرفت بہت کمزور پڑ گئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ کشمیر کو چھوڑ جائے جیسے روس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ان حالات میں کشمیریوں، پاکستان اور ہندوستان کے لیے بہترین راستہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق رائے شماری کرانا ہے۔ اگر کوئی دوسری راہ چنی گئی تو اقوام متحدہ کی قرارداد کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ جبکہ قرارداد میں ترمیم کرنا اب آسان کام نہیں۔ اس لیے پہلے سے وضع شدہ طریقے کے مطابق مسئلہ کشمیر کو حل کرنا چاہیے۔ اس نازک صورتحال میں بڑی احتیاط سے آگے بڑھنا ہوگا۔ ہماری سوچ اس دباؤ کے تحت نہیں ہونی چاہیے جو ایٹمی دھماکوں سے قبل ہم پر تھا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ کشمیر کے حوالے سے آئندہ جو بھی لائحہ عمل طے کیا جائے اس میں مختلف وجوہ کی بنا پر کشمیریوں سے پیدا ہونے والی دوریاں ختم کرنے کے اقدامات ضرور ہوں۔ اس حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ ماضی میں پاکستانی پالیسی کی وجہ سے اہل کشمیر ذہنی تحفظات کا شکار ہوئے ہیں، ضروری ہے کہ شکوک و شبہات کو صاف کیا جائے۔

دفاعی علوم کے ایک طالب علم کے طور پر میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھارت کے پاس پسپائی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں وہ مذاکرات کے ذریعے اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے۔ ہم اس بھیڑیے کی دم کشمیر کی چٹان سے آزاد کیوں کرائیں ...... جب تک وہ کشمیریوں کا لہو چاٹنے سے باز نہیں آجاتا اور اس مسئلے کو کشمیریوں کی آزاد رائے کے مطابق حل کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاتا ......؟ کہا جاتا ہے بیرونی مداخلت ہوگی یہ ہوگا، یہ وہ ہو جائے گا ...... یہ سب لغو باتیں ہیں۔ ہمیں صاف طور پر یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ یہ ہماری پوزیشن ہے ہم اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اگر رائے شماری کرانا چاہتے ہو تو ٹھیک بصورت دیگر کشمیر چھوڑ جاؤ تمہارے لیے یہی راستہ بچا ہے۔ ان کے پاس کوئی نظریہ نہیں اس لیے وہ ہماری نظریاتی سوچ پر کوئی ضرب نہیں لگا سکیں گے۔ ہم اپنے موقف پر ڈٹے رہے تو انہیں بالآخر سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف افغانستان کے مسئلے کا فوری حل بھی کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے ضروری ہے، ورنہ اس کے مضر اثرات سے پاکستان اور کشمیر دونوں محفوظ نہیں رہیں گے۔ ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم امریکہ سے آزاد ہو چکے ہیں، اب ہمیں امریکہ کے اشاروں پر چلنے کی ضرورت نہیں ...... لیکن اگر ہم امریکہ کی ہدایات بھی مانیں اور اس کے خلاف مزاحمت بھی کریں، تو اس کے نتائج زیادہ نقصان دہ ہوں گے۔

# شہ رگ کے بغیر پاکستان زندہ نہیں رہ سکتا

## ایک متحدہ لبریشن کونسل کی تشکیل ناگزیر ہے

## (جہاد کشمیر 16 اکتوبر 1996ء)

معروف عسکری مدبر جنرل حمید گل تحریک آزادی کشمیر کے تمام فریقوں کے لیے قابل عمل نسخہ تجویز کرتے ہیں۔

مسئلہ کشمیر کی سچائی ہمیشہ کی طرح آج بھی اٹل ہے کہ اسے وہاں کی عوام کی مرضی کے مطابق حل ہونا چاہیے۔ چاہے اسے عالمگیر سیاسی اور معاشرتی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے، قرآن وسنت کی راہنمائی میں دیکھا جائے یا دلیل و برہان کا سہارا لیا جائے کوئی دوسرا حل ممکن ہی نہیں۔ لیکن حالات جس نہج پر پہنچ چکے ہیں ان میں مشکلات ابھی تک موجود ہیں ...... کچھ تو پاکستان کی حکومتیں اپنے کمزور کردار کی وجہ سے ایسے فیصلہ کن مرحلے میں ناکام رہیں اس میں ان کی افغانستان کے حالات کو سمیٹنے میں ناکامی بھی شامل ہے۔ اگر افغانستان کا مسئلہ غلط پالیسی اپنانے سے پیچیدہ نہ بنا دیا جاتا تو کشمیر پر اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے، بدقسمتی سے پاکستان جہاد افغانستان کے ثمرات سمیٹ نہ سکا حالانکہ اس میں پاکستان نے زبردست قربانیاں بھی پیش کیں تھیں۔

### امریکہ نوازی کب تک؟

مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہماری سبھی حکومتوں نے بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ بے نظیر حکومت ہو یا نواز شریف حکومت کشمیر کے بارے میں ہر دور میں منفی پالیسیاں اختیار کیں۔

نواز شریف ہی کے دور میں آپ کو یاد ہوگا کشمیر کے معاملے میں بڑی کمزور پالیسیاں وضع کی گئیں۔ کبھی کبھار تو کچھ دو اور کچھ لو تک بات آ پہنچی۔ کوئی جرأت مندانہ موقف اختیار نہ کیا گیا۔ نیچے دروں نیمے بروں والی حالت رہی۔ بالآخر یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ اپنی رات کے بجائے امریکہ کے پروگرام اور رائے پر انحصار کیا جاتا ہے۔ شملہ معاہدے پر اصرار جاری رکھا گیا اور کہا گیا شملہ معاہدے کے ذریعے آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے سے معاملات طے ہو جائیں گے۔ یہ خیال بھی غلط نکلا کہ اس کے ذریعے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ شملہ معاہدہ 1972 میں سائن ہوا تھا 24 سالوں میں خارجہ سیکریٹریوں کے درمیان صرف ایک ملاقات ہوئی ہے جو بات ہوئی وہ بھی چند گھنٹے کی تھی۔ شملہ معاہدے کے پس منظر میں ہونے والی یہ بات چیت بھی کامیاب بھی نہ ہو سکی۔ اس کا دونوں نے اعتراف کیا کہ اس فریم ورک میں بات نہیں ہو سکتی۔ شملہ معاہدے کے تحت مذاکرات بے سود ہیں۔

اس کے بعد سے ثالثی کی بات شروع ہوگئی ہے۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ثالثی قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ یاسر عرفات بھی چلے آرہے ہیں اور امریکہ کے سینیٹر بھی آرہے ہیں دوسرے لوگ بھی آرہے ہیں ثالثی وغیرہ کے بارے میں سوچنا بھی فضول ہے ہمارا موقف ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت استصواب کرایا جائے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو تو اقوام متحدہ میں لیکر جاتے ہیں جہاں جنگ کا خدشہ ہوتا ہے اس کے لیے اقوام عالم مل کر سوچ بچار کرتیں ہے۔ یہاں تو نیوکلیئر وار کو خدشہ ہے اسے دو فریق کیسے حل کر سکتے ہیں۔ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی ایسی جنگ ...... فہم ہے کہ دنیا کو اس پر تشویش کیوں نہیں۔ یہ مان بھی لیا جائے کہ پاکستان سے کوتاہیاں ہوئیں، لیکن امریکہ بھی اس کوتاہی میں شامل ہے جو دنیا کی واحد سپر پاور ہے، جسے دنیا کے معاملات درست کرنے کا دعویٰ ہے۔ جس نے ایک عرصہ تک اس مسئلہ پر پاکستانی موقف کی تائید بھی کی ہے۔ کیا اس تلخ حقیقت سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے؟ آج یہ پہلے کے مقابلے میں سے زیادہ سیریس مسئلہ ہے تو امریکہ کیوں اس میں کردار ادا کرنے سے گریز کر رہا ہے؟ حکومت کو اس کی تہہ میں جانا چاہیے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ ہمارے اور کشمیر کی سرحد پر چین واقع ہے جس کے بارے میں امریکہ کے اپنے عزائم ہیں۔ چین امریکہ کی اس خطے میں سازشوں کو ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ جو ویٹو پاور لیکر خود بھی سلامتی کونسل میں بیٹھا ہوا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ ثالثی کرو تب بھی چین کو باہر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آخر چین کی ثالثی کیوں قبول نہیں کیا جاتی ......؟ وہ ثالثی کرنے کی بہترین پوزیشن میں ہے ہماری سرحد اس کے ساتھ لگتی ہے ہمارے مفادات مشترکہ ہیں۔ اگر کشمیر کے بارے میں خودمختار ٹرسٹی شپ وغیرہ کی بات تجویز آتی ہے ...... تو کیا چین اسے قبول کرلے گا؟ اس لیے اگر ثالثی قبول کرنی ہے تو چین کی ثالثی قبول کرنی چاہیے مگر یہ بالکل واضح ہے کہ مغرب کا اپنا ایک ایجنڈا ہے، اپنا پلان ہے۔ وہ طویل مدتی منصوبہ سازی کرتے ہیں وہ اس کے ذریعے سے اس علاقے میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں چین کو دبانے کے لیے موقع مل رہا ہے۔ چین ہمارا بہت اچھا دوست رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ہم اس کے مقابلے میں بارہ ہزار میل دور اور مستقبل میں زوال پذیر قوت پر انحصار کیوں کریں؟ چونکہ وہ اپنے پلان پر عمل کر رہے ہیں اس لیے انہیں کشمیر میں خون بہتا نظر نہیں آتا۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا کشمیر میں شہادتیں ہوئیں اور جو ہو رہی ہیں، جو مظالم ہوتے ہیں، ایکسٹرا جوڈیشنل قتل ہوتے ہیں، وہ انہیں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی بات کرتے ہیں اور ہمیں بھی یہ راستہ دکھاتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں حقوق کی خلاف ورزی کا انطباق کتوں پر تو ہو سکتا ہے، گھوڑے پر وہ ترس کھاتے ہیں عام انسان بھی ان کی ہمدردی کے مستحق ہیں، لیکن ان کے نزدیک ایک پوری قوم کے انسانی حقوق کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ انسانی حقوق یا کے متعلق ان کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو جتنی شدت کے پسند کرتے ہیں۔ اتنی ہی شدت کے ساتھ وہ ہماری آزادی سے خوفزدہ ہیں۔ انگریزی میں یوں کہا جان سکتا ہے کہ They relish their freedom but they fear our freedom مغرب کا یہی خوف ہے جس کی وجہ سے ہمیں مختلف طریقوں سے اُلجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ کبھی معاشی مسائل میں اُلجھا کر، کبھی لڑا کر، گھٹیا ترین مفادات حاصل کرکے قوموں کو ان کی آزادی سے محروم رکھنا انہیں گوارہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب کا اخلاقی نظام تباہ

ہو چکا ہے۔ یہ پورے مغرب کی اخلاقی گراوٹ ہے جو انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

سوال یہ ہے ہم اخلاقی گراوٹ کی اس انتہا کو چھونے والے لوگوں کی خاطر اپنے موقف سے کیوں ہٹیں۔ یہ بے سود امریکہ نوازی کب تک؟ مسئلہ کشمیر کو آخر اقوام متحدہ کی قرار دادوں سے حل کرنے پر اصرار کیوں نہ کریں۔ وہ مسئلہ جس پر خوفناک جنگ ہو سکتی ہے اور دنیا کی بہت بڑی آبادی غرق ہو سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس پر دھاندلی کا ساتھ دیں ہمیں کمزوری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں اور معاملات اس جگہ تک لے جانے چاہئیں جہاں تک کشمیر کی آزادی کے لیے جانے کی ضرورت ہے۔ کشمیر کی آزادی کے موقف سے ہٹنا نہیں چاہیے۔ اقوام متحدہ کی قرار کے موقف دادوں پر ڈٹے رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں ایک ہی اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ جنگ ہو جائے گی، تو ہو جائے جنگ ...... جنگیں تو ہوا کرتیں ہیں، لیکن ہندوستان اس پوزیشن میں نہیں کہ جنگ کر سکے۔ اس کی میں وجوہ بیان کرتا ہوں۔

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی فوجیں کشمیر میں پھنسی ہوئی ہیں۔ باقی فوجوں کے ساتھ وہ فیصلہ کن حملے کی پوزیشن میں نہیں، فیصلہ کن حملہ نہیں ہوگا تو حملے کا کوئی فائدہ نہیں۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دونوں کے پاس نیوکلیئر صلاحیت (caqpability) موجود ہوتا ہے۔

۳۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ جس دن جنگ شروع ہوئی مسئلہ سکیورٹی کونسل میں چلا جائے گا جو نہ امریکہ چاہتا ہے نہ ہندوستان۔ اس کو تو وہ سکیورٹی کونسل سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔

## کشمیری قیادت کے لیے راہ عمل

اس لیے میں سمجھتا ہوں ہمیں جنگ سے جو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے بالکل غلط ہے۔ اس لیے جنگ سے خوف کھائے بغیر ہمیں وہ تمام اقدامات کرنے چاہئیں جو مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ پاکستان کی حکومت، بلکہ نظام سے نالاں اور مایوس ہیں۔ لوگ جس طرح کے مسائل سے دوچار ہیں، انصاف سے محروم ہیں وہ بجا طور پر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان میں کوئی نظام ہی نہیں اور پاکستان سے جو تصورات وابستہ کیے گئے تھے وہ تو ادھورے رہے۔ اب یہ تصویر بدل رہی ہے۔ اس بے نظامی سے نجات ناگزیر ہے۔ اگر پاکستان نے زندہ رہنا ہے تو ظالمانہ نظام کو بدلنا ہوگا۔

نظام کی خرابی اپنی جگہ، لیکن میں سمجھتا ہوں کشمیریوں کو اس مفروضے کی بنا پر پاکستان سے اپنی محبت اور رغبت میں کمی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ ان کی اس تحریک آزادی میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ بے شک پاکستان میں فرسودہ نظام ہے اور اگر کشمیر نے اس کے ساتھ الحاق کیا تو پاکستان اسی نظام کو اس کی جھولی میں ڈال دے گا، لیکن ضروری نہیں کشمیری پاکستان کے ساتھ اس نظام کو بھی قبول کریں۔ میں یہ ہی بتانا چاہتا ہوں کہ کشمیری کیا کریں ...... میرے خیال میں جس طرح اہل کشمیر کا یہ فرض ہے کہ کشمیر آزاد کرائیں تا کہ صدیوں کی غلامی سے نجات پائیں اسی طرح ایک نئے نظام کے لیے بھی جدوجہد کریں تا کہ آزادی کے ثمرات سے صحیح معنوں میں فائدہ ملے۔ کشمیریوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ پاکستان سے الحاق سے پہلے اسے اس نظام سے نجات دلائیں۔ اب

وقت آ گیا ہے کشمیری قوم کی قیادت ...... ساری قیادت مل کر اس بات کا اظہار کر دے کہ ہم پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں۔ بھارت سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ ہم استصواب رائے کا حق دو، ورنہ قیادت کشمیر کو یکطرفہ طور پر اعلان کرنے سے نہیں روک سکتے۔ میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کشمیر کے آزادی کے خواہ عوام جس نصب العین کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں، وہ اس نصب العین سے مختلف نہیں جس کے لیے پاکستان بنا تھا۔ ہمارے خواب اور امنگیں یکساں ہیں۔ پاکستانی عوام بھی موجودہ نظام کے گرداب سے نکلنا چاہتے ہیں تا کہ آزادی اور قیام پاکستان کے حقیقی ثمرات سے فیض یاب ہو سکیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کشمیری عوام آزادی کے لیے پاکستان سے الحاق کا اعلان ضرور کریں کہ یہی ایک راستہ ہے آزادی کا...... لیکن کشمیریوں کا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ وہ پاکستان کو پاکستان بننے میں مدد دیں۔ پاکستان کو موجودہ نظام سے نجات دلائیں، پاکستان میں شامل ہونے سے پہلے پاکستان کو اپروچ کریں اور کہیں کہ آؤ آپس میں بیٹھ کر ایک آئینی ڈرافٹ بنائیں اور اس کو باقاعدہ آئینی ترمیم کے شکل میں منظور کریں۔ ہم اس draft constitution پر آپ سے معاہدہ کریں گے جس میں کشمیر کے لیے ایک نئے سٹیٹس کا تعین ہو جائے کہ سوائے چار محکموں کے باقی سارے کے سارے محکمے کشمیر کا اندرونی معاملہ ہونگے۔ صرف مواصلات، کرنسی، دفاع اور لر امور خارجہ مرکز کے پاس ہوں گے باقی شعبوں میں کشمیر اندرونی طور پر خود مختار ہو۔ مواصلات بھی ریاست کی حد تک اندرونی معاملہ ہو۔ اس طرح اندرونی طور پر یہ خود مختاری ہندوستانی آئین کے آرٹیکل ۳۷۰ سے بڑھ کر اور صحیح معنوں میں آزادی ہوگی۔ اس میں یہ شرط بھی دی جائے کہ یہ آئینی ترمیم پاکستان کے دونوں ایوان متفقہ طور پر منظور کریں۔

یہ مرحلہ زیادہ دور نہیں ہوگا لیکن اس کے لیے کشمیری قوم کا اپنے موقف پر ڈٹ جانا اور کشمیری قیادت کا اقوام متحدہ کی قراردادوں پر یکسو ہونا ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر جو دوسرے تھرڈ آپشن وغیرہ ہیں، اس سے تقسیم کشمیر کا راستہ نکل سکتا ہے تقسیم کشمیر کا ہر فارمولہ چاہے وہ پاکستان کی طرف سے ناردرن ایریا کے سلسلے میں آئے یا ہندوستان کی طرف آئے یا امریکہ کی طرف سے، اس کو قطعاً مسترد کر دینا چاہیے۔

## تقسیم کشمیر کی کوششیں

یہاں میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی طرف سے ناردن ایریا کا سٹیٹس بدلنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ۲۸ نومبر ۱۹۹۱ء کو دفتر خارجہ کی طرف سے یہ معاملہ آیا کہ شمالی علاقوں کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ میں نے اس پر اعتراض اُٹھائے کہ اقوام متحدہ میں کشمیر کا 860000 مربع میل کا رقبہ بتایا گیا ہے اور stand still agreement ہے۔ اس سے ہم پیچھے ہٹیں گے تو خود اقوام متحدہ کی قراردیں کو منسوخ کر دیں گے۔ اس طرح آزاد کشمیر ہائیکورٹ کے فیصلے کی روشنی میں بھی یہ ایک مسئلہ بن جائے گا۔ جس میں ہائی کورٹ نے شمالی علاقہ جات کو کشمیر کو جزو لاینفک قرار دیا ہے لیکن بدقسمتی سے شمالی علاقہ جات کو کئی بار کشمیر سے کاٹ کر پاکستان میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح سے تو ہم ہندوستان کو کشمیر کی ریاستی حیثیت کو ختم کر کے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کھلی چھٹی دے دیتے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۹۱ تو اس کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا تھا یہ مسئلہ اس وقت

پیش ہوا جب کہ نواز شریف وزیراعظم تھے اور جنرل آصف نواز اس وقت چیف آف آرمی سٹاف تھے میں اس وقت کور کمانڈر تھا۔ جب کور کمانڈر کانفرنس میں اس مسئلہ کو لایا گیا تو میں نے اس کا تجزیاتی جائزہ لیکر اس کے پاکستان پر بدترین اثرات کی روشنی میں اس کی بھرپور انداز میں ناقابل تردید حقائق کی بنیاد پر مخالفت کی۔ اسی وجہ سے ان کے پاس اس فیصلے کو موخر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ شمالی علاقہ جات کی حیثیت کو بعد میں مناسب وقت پر تبدیل کیا جائے لیکن جنرل آصف نواز سے اختلاف کرنے کی بنیاد پر وہ میرے سے ناراض ہوگئے لیکن ظاہر ہے کہ اختلاف کرنے کے بعد میں فوج کے کسی اعلیٰ عہدے پر نہ رہ سکتا تھا اس طرح دفتر خارجہ کے ارادے پورے نہ ہوسکے۔

۱۹۹۳ میں معین قریشی دور میں پھر یہ مسئلہ آیا اور ناردرن ایریا کو ''نمٹانے'' کا فیصلہ کرلیا گیا۔ ۱۶ اکتوبر کو الیکشن ہورہے تھے۔ اس سے صرف دس دن پہلے معین قریشی شمالی علاقوں کو پاکستان میں شامل کرکے اس کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ میں پہلے تو قائم مقام صدر جناب وسیم سجاد کے پاس گیا کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے اس خطرناک اقدام کو روکیں مگر انہوں نے اس معاملے میں کوئی کردار ادا کرنے سے معذوری ظاہر کردی۔ اس لیے میں معین قریشی کے پاس گیا۔ ان سے میرے پرانے مراسم تھے۔ میں نے تفصیل سے پوری صورت حال ان کے سامنے پیش کی اور کہا، یہ کام امریکہ کے لیے تو مفید ہوسکتا ہے، مگر پاکستان اور تحریک آزادی کشمیر کے لیے سخت مہلک ثابت ہوگا۔ میں نے کہا، اگر آپ نے ایسا اقدام کیا، تو مجھے اس کے خلاف مزاحمت کے لیے اگر سڑکوں پر بھی نکلنا پڑا تو میں دریغ نہیں کرونگا۔ انہوں نے کہا، نہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی مجھے اس مسئلے کے خطرناک عواقب کا اندازہ نہ تھا۔ اس طرح خدا خدا کرکے یہ معاملہ ایک بار پھر ٹل گیا۔

اس معاملے میں اب بھی بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف سے بھی تقسیم کشمیر کی باتیں ہورہی ہیں۔ تقسیم کشمیر کی ہر تجویز کو مسترد کرنا ضروری ہے۔ مثلاً کہا جارہا ہے ڈوگرہ الگ ہوجائیں یا فلاں چلا جائے، فلاں کو ادھر اور فلاں کو ادھر کردو۔ ڈوگرہ بھی کشمیری ہیں۔ کشمیر میں انہیں تحفظ مل سکتا ہے۔ ہمارے ہاں اقلیتیں غیرت اور تحفظ کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ اور ان کو پورے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اندرونی طور پر خودمختار کشمیر ہوگا تو انہیں مکمل خودمختار کشمیر سے زیادہ حقوق ملیں گے۔ زیادہ فائدے حاصل ہونگے۔ بھارت میں ضم ہونے اور تقسیم کشمیر سے جو فائدے ہوسکتے ہیں ان سے کئی گنا زیادہ فائدے حاصل ہونگے۔ یہ کشمیری لیڈرشپ کا فرض ہے کہ وہ ڈوگروں اور پنڈتوں کو بتائیں کہ تمہاری جڑیں اس سرزمین میں ہیں۔ تمہارا مستقبل اس سرزمین کا اتحاد قائم رکھنے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ تم پاکستان کے ساتھ الحاق کرتے اور خودمختار رہتے ہو تو مستقبل کی ابھرتی ہوئی مارکیٹ وسط ایشیاء کے ساتھ تمہارے روابط ہوں گے۔ پاکستان میں تمہیں ریل اور جہاز کے رابطے چند گھنٹوں میں تاشقند پہنچادیں گے۔ تم ریل کے راستے سے کراچی سے صرف پندرہ لاکھ ڈوگروں کی کیا حیثیت ہوگی، وہ بھی ایک صوبے کی حیثیت سے؟ اس لیے ڈوگروں اور پنڈتوں کے مفاد میں ہے کہ وہ پاکستان کے اندر رہتے ہوئے اپنی خودمختاری کی بات کریں اور پاکستان کے آئین کے اندر خودمختاری پر مطمئن ہوجائیں۔

اسی طرح لداخ کے بدھواں کا معاملہ ہے انہیں ریاست سے الگ ہونے سے کیا فائدہ ہے؟ لداخ

آ کر کیوں دور دراز دلی کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ لداخ کے دو لاکھ سے کم بدھ کشمیر کے حصے بخرے ہونے کے بعد ہندوستان کی یونین کا حصہ بنتے ہیں تو سوائے فضائی رابطے کے ان کا تو بھارت سے کوئی رابطہ نہیں رہتا۔ محض چین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے انہیں بیس بنایا جائیگا۔ ایک مصنوعی خوشحالی لانے کی کوشش کے لیے جائے گی کہ ڈالر آ جائیں، لیکن وہاں ہم نے دیکھا جہاں ڈالر آئے وہاں بہت مصائب بھی آئے ہیں۔ بدھ تو امن پسند لوگ ہیں انہیں ان مسائل میں اُلجھنا نہیں چاہیے جب کہ ان کی ایک طرف تبت ہے۔ وہ نئی جنگ کا کیوں مہرہ بننا چاہتے ہیں؟ اس میں سراسر خود ان کا نقصان ہوگا۔ ہم نے اس قسم کے مہرے بننے والوں کا انجام دیکھا ہے۔ جیسے افغانستان کو روس کا مہرہ بنا دیا گیا تھا تو لاکھوں انسان اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پھر مغربی طاقتوں نے اسے اپنا مہرہ بنانے کی کوشش کی، اس کا آج حشر دیکھ لیں۔ لہٰذا کسی طرح بھی بدھوں کے حق میں نہیں کہ وہ دہلی کے اشاروں پر ناچیں۔ دہلی نے انہیں دلائی لامہ کی وجہ سے یہ نعرہ دیا ہے، مگر بھارتیوں کو دلائی لامہ سے کوئی پیار نہیں۔ اگر دلائی لامہ سے پیار ہوتا تو نہرو نے ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ نہ لگایا ہوتا۔ اس وقت ان کو تبت یاد نہیں آیا۔ یہ محض ان کی مفاد پرستی ہے اور اس کے پیچھے امریکہ کی گہری سازش ہے۔ ڈوگروں اور بدھوں کو اس سازش سے خبردار رہنا چاہیے۔

کشمیر کی ساری آبادی کے حق میں یہ ہے کہ ان کی وحدت نہ ٹوٹے۔ کشمیر کے اندر ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ اس میں گوجر ہیں ...... ذہین اور فعال کشمیری ہیں جو پورے برصغیر کو راہنمائی فراہم کرتے رہے ہیں۔ پر امن بدھ ہیں۔ بلتی اور شینا بولنے والے ہیں ...... اور صدیوں سے مسلمانوں سے شیر و شکر ہو کر رہنے والے ڈوگرے اور پنڈت ہیں۔ اس اتحاد کو قائم رہنا چاہیے۔ صرف اسی طرح پوری آبادی معاشی اور تجارتی اعتبار سے ترقی کر سکتی ہے۔

اِدھر ان کے پاکستان کا حصہ بن جانے سے پاکستان کے نظام میں بھی تبدیلی آئے گی۔ پھر ہندوستان کے اندر شودر کو بھی ایک نئی سوچ ملے گی جو کہ پہلے ہی آ رہی ہے۔ ہندوستان کے اندر زبردست سماجی تبدیلی آ رہی ہے۔ بی جے پی اور برہمن کی طرف اس تبدیلی کا ردِ عمل دیکھنے میں آ رہا ہے۔ یہ ردِ عمل ذات پات کو بچانے کے لیے ہے۔ اس طرح برصغیر میں ہم ایک بڑی تبدیلی کے دھانے پر بیٹھے ہیں اور کشمیر کا اس میں بہت بڑا رول ہوگا۔

## کشمیر پالیسی کیا ہو؟

اب آتے ہیں آزادی کشمیر کے ضمن میں پاکستان کے کردار کی طرف ...... پاکستان کو ہر قسم کی امداد فراہم کرنی چاہیے۔ اس تحریک کو اس حد تک لے کر جانا چاہیے کہ ہندوستان کے لیے کشمیریوں کے حق خود رادیت سے محروم رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہے یعنی ہم ایک طرف تو سیاسی تحریک کو کشمیر میں ابھاریں اور دوسری طرف عسکریت کو Controlled Militancy کے ذریعے اس مرحلے تک لے جائیں تاکہ ہندوستان کی فوج کشمیر سے نکلنے کے بجائے پھنستی چلی جائے۔ اس حد تک پھنس جائے کہ اس کی بلیڈنگ کا عمل شروع ہو جائے۔ یعنی

قطرہ قطرہ کر کے اس کے جسم کا سارا خون بہا دیا جائے اور اس کی قوت کو زائل کر دیا جائے اور جب ایک دن یہ قوت ٹوٹے تو اس کے نتیجے میں ان کا سارا انظام بکھر کر رہ جائے۔ ایسا انتشار ہندوستان کو اسی طرح اندر سے توڑ کے رکھ دے گا جیسے روس ٹوٹا۔ ہندوستان انتشار اور ٹوٹ پھوٹ میں مبتلا ہوگا تو دوسری اقلیتوں کو بھی آزادی ملے گی اور ہندوستان کی بڑی ریاستیں بھی تقسیم ہونگیں۔ اس طرح جب ہندوستان کی اجارہ داری ختم ہوگی تو اس خطے کی دوسری اقوام بھی سکھ کا سانس لیں گی۔ بنگلہ دیش بھی آزادی کا سانس لے گا، سری لنکا، مالدیپ اور سکم کو بھی چین آئے گا اور ایک نیا مارکیٹ کا نظام بھی وجود میں آئے گا جس کی اس خطے کو اشد ضرورت ہے۔ جس پر آج کے ہندوستان نے اجارہ داری کے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ اس سے برصغیر کو سکیورٹی کا ایک نظام اور ایک نیا نظام معیشت بھی ملے گا آج سکیورٹی کا نظام درست نہیں، کیونکہ ہندوستان ایک بہت بڑا اور طاقتور ملک ہے مگر اس کے جارحانہ طرزِ عمل نے سب کو گھائل کر رکھا ہیں۔ اس کے خواب ہمارے خوابوں سے براہ راست ٹکراتے ہیں۔ بلکہ اس کے منصوبے سری لنکا، مالدیپ اور اس سارے خطے بلکہ مڈل ایسٹ کی خوشحالی کے بھی خلاف ہے۔ اگر ہم نے کشمیر میں ان کی خاطر خواہ بلیڈنگ کر دی اور سیاسی تحریک سے اس مسئلے کو مطلوبہ حد تک بڑھا دیا تو مستقبل میں اس خطے کے ڈیڑھ ارب لوگ ہمارے احسان مند ہوں گے کہ ہم نے انہیں امن، آزادی، احساس تحفظ اور خوشحالی سے ہمکنار کیا۔

یہاں یہ سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ کشمیر پاکستان میں اندرونی طور پر خود مختار ہوتا ہے تو ہندوستان کے بہت سے علاقے بھی اس قسم کی چیز مانگیں جو پاکستان کشمیر کو دے گا اور پاکستان کے اپنے صوبے بھی اس کا مطالبہ کریں گے۔ ہمارے صوبوں کے لیے وہی خود مختاری کافی ہے جو ہمارے آئین میں موجود ہے اور جو پہلے وہ ان کو ملنی چاہیے۔ یہ بھی کم خود مختاری نہیں، مگر یہاں پر ایسا نہیں ہو رہا ہے، یہاں پر ابھی تک انگریز کا ہومرکزیت کا نظام چھوڑا ہوا موجود ہے۔ لیکن دوسے صوبے اس بنیاد پر اندرونی خود مختاری نہیں مانگ سکتے۔ اس لیے کہ کشمیر تو جنگ کر کے، اپنے خون کے نذرانے دیکر یہ چیز حاصل کریگا دوسرے صوبوں کو آزادی کی وجہ سے یہ سب کچھ ملا ہوا ہے لیکن بہر حال اگر یکساں مواقع فراہم کر دیے جائیں، باقی صوبوں کا سٹیٹس بھی اَپ ہو جائے تو بھی فرق نہیں پڑتا ہے۔

## آزاد کشمیر کا کردار کیا ہو؟

تحریک آزادی کے سلسلے میں آزاد کشمیر وہ راستہ اختیار نہیں کر رہا ہے۔ جس کی ضرورت تھی۔ میرے خیال میں آزاد کشمیر اس مسئلے کا اہم ترین فریق ہے۔ اس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے پاکستان سے ان کا جوں کا توں معاہدہ (stand still agreement) ہے۔ اس بنا پر انہیں حکومت پاکستان سے ڈیمانڈ کرنا چاہیے کہ تم ہمیں صحیح معنوں میں بیس کیمپ بننے کا موقع دو، تا کہ ہم کشمیر کی آزادی میں اپنا بھر پور کردار ادا کر سکیں۔ بصورت دیگر تاریخ نہ پاکستان کو معاف کرے گی نہ آزاد کشمیر کو آزاد کشمیر کی کمزوری، اس کی غیر یکسوئی اور تحریک سے غیر وابستہ ہونے کی روش قطعاً نا قابل معافی ہے۔ یہاں کی جو جماعتی خلفشار پیدا کیا گیا ہے لوگوں کو تقسیم کر کے رکھ دیا گیا

ہے اور متحد ہو کر جو کردار ادا کیا جا سکتا تھا اس سے اس خطے کو جس طرح محروم کیا گیا ہے۔ یہ اسے تاریخ کے سامنے شرمندہ کرے گا۔ مستقبل کا مورخ ان سے کہے گا کہ تمہاری وجہ سے کشمیر تقسیم ہو کہ تم نے ٹھیک وقت پر آواز نہیں کی، صحیح سمت میں قوت صرف نہیں کی اور ایک آواز نہیں ہوئے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ آزاد کشمیر میں موجود گروہی سیاست سے ہٹ کر ایک متحدہ لبریشن کونسل بنائی جائے جس میں یہاں کے تمام معروف لیڈر ہوں یہ باقاعدہ اپنے امیر کا انتخاب کریں جیسے مقبوضہ کشمیر میں آل پارٹیز حریت کانفرنس تشکیل دی گئی ہے، یہاں بھی آل پارٹیز اتحاد تشکیل دیا جائے۔ آگے چل کر یہ کونسل آل پارٹیز کے ساتھ مل کر پوری ریاست کی سطح پر ایک جامع اور نمائندہ ڈھانچہ بنائے۔ اس میں وادی اور آزاد کشمیر کے ساتھ ساتھ جموں، لداخ اور ناردرن ایریا کی بھی نمائندگی ہوتا کہ یہ گرینڈ کونسل الحاق پاکستان کا اعلان کر سکے۔ آزاد کشمیر میں بہت تجربہ کار قائدین موجود ہیں۔ یہ ان کے تدبر اور اخلاص کے امتحان کا وقت ہے۔ میں یہاں خصوصیت سے سردار ابراہیم صاحب کا ذکر کرونگا وہ آگے آئیں اور جہادی راستہ اختیار کرلیں۔ شاید اس عمر میں اللہ ان سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہو۔

دوسرے پاکستان پر جو الزام لگ رہا ہے کہ وہ امداد کر رہا ہے۔ یہ الزام بھی آزاد کشمیر پر شفٹ ہو جانا چاہیے۔ حالانکہ پاکستان اگر کوئی مدد کرتا ہے تو کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے۔ اس لیے کہ کشمیری پاکستان کا شہری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر کشمیری ایک ووٹ پاکستان اور دوسرا کشمیر میں پول نہ ہوتا۔ یہ دو ووٹ کا حق دیکر ہم نے تسلیم کیا ہے کہ ہر کشمیر ہمارا شہری ہے۔ اس طرح پاکستان کا حق بنتا ہے کہ وہ کشمیر کو ہر قسم کی امداد فراہم کرے، لیکن پھر بھی حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان اس الزام سے بری الذمہ ہو جائے اس کے بجائے آزاد کشمیر تحریک آزادی کو سیاسی اور عسکری امداد دینے کے لیے ہر ممکن کردار ادا کرے اور باقاعدہ لبریشن کونسل کے متحدہ پلیٹ فارم کو بنیاد بنا کر یہ کام کیا جائے۔ اس کونسل کا باقاعدہ ایک امیر جہاد ہو۔

دوسرے جہاد کشمیر واقعی جہاد ہے، اس لیے ہمارے جو مجاہد باہر سے آتے ہیں ان کا بھی کشمیر کے اندر جانے کا حق بنتا ہے۔ بوسینا کے اندر لوگ جاتے رہے ہیں اس کے اندر خود امریکن شہری گئے ہیں جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہاں بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ بیس کیمپ کا بھی یہ حق ہے کہ باہر سے بھی لوگوں کو بلائے اور خود بھی اس جہاد میں عملی طور پر شامل ہو۔ مثال کے طور پر اگر کشمیر کا بیس کیمپ طالبان سے درخواست کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے کہ وہ طالبان کو بلائے۔ اگر وہ کہیں ہم شریعت نافذ کر رہے ہیں تو ان سے کہا جائے کشمیریوں کی مدد کرنا بھی شریعت کا حصہ ہے بھارتی آرمی پر چڑھائی کی جائے، اور کشمیریوں کی مدد کی جائے گی اگر آزاد کشمیر طالبان حکومت اور افغانستان سے مدد کی درخواست کرے تو ایسا ہو سکتا ہے۔

پاکستان کی عجیب پالیسی ہے، پیاز بھی کہہ رہا ہے اور جوتے بھی۔ الزام بھی لے رہا ہے کہ کشمیریوں کی مدد کر رہا ہے لیکن مدد کرنے سے گریز بھی کر رہا ہے۔ یہ واضح نہیں ہو رہا ہے کہ اصل پالیسی ہے کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اچھی حکمت عملی ہو سکتی تھی کہ طویل دورانیے کے لیے ہندوستانی فوج کو مبتلا رکھا جائے۔ اگر ہمارے مقاصد میں نہ صرف کشمیر کو ہندوستان سے آزاد کرانا بلکہ ہندوستان کے ٹکڑے کروانا بھی ہو اگر واقعی یہ حکمت عملی ہے تو کشمیر کو اس کا پتہ ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر حکمت عملی وضع کرنی چاہیے۔ کشمیریوں کو یہ معلوم ہو کہ ٹھیک ہے

ہم نے قربانیاں تو دی ہیں، اس کے نتیجے میں اچھا ہے کشمیر بھی آزاد ہو۔ ہندوستان کے دوسرے مسلمان بھی آزاد ہوں ہندوستان کو بھی یہ فکر کرنا چاہیے کہ وہ کھیل جو کشمیر میں وہ کھیل رہا ہے اس سے اس کی عسکری قوت ہی ختم نہ ہوگی بلکہ اخلاقی جواز بھی ختم ہو جائے گا۔ ابھی ابھی ہم نے دیکھا ہے۔ کابل میں طالبان بغیر کسی جنگ کے داخل ہو گئے یہی بھارت کے ساتھ ہوگا۔ جب ان کی افواج کی عسکری اور اخلاقی قوت ختم ہوگی تو وہ اس بری طرح وہاں سے بھاگیں گی جیسے روس افغانستان سے بھاگا تھا...... جیسے ابھی ہمارے مجاہدین کابل سے نکل کر چلے گئے۔ مجاہدین بہت طاقتور تھے لیکن جب اخلاقی جواز ختم ہوتا ہے تو فوج کمزور ہو جاتی ہے۔ پاکستان کو کچھ کرنا ہے تو نئی سطح کے معاملات کرنے چاہیں۔ چند جدید ہتھیار، مثلاً سنگر میزائل، اینٹی ٹینک وغیرہ مجاہدین کو ملنے چاہئیں۔ اور اب بڑے ہتھیار بھی آ جانے چاہیں، چاہے قلیل مقدار میں ہوں، جن کی مدد سے وہ انڈیا کی فوج کو پہاڑوں میں اور وادیوں میں بھاگنے پر مجبور کر سکیں۔ اس سے بھارتی فوج کو وہ ایسا تھکائیں گے کہ اس کے بعد ہندوستان کی ساری منصوبہ بندی بکھر جائے گی۔ اگر ہندوستان راہ راست پر نہیں آتا تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہم اسے کہہ سکتے ہیں کہ ٹھیک ہے تم ہم سے بات نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی تم سے بات نہیں۔ ہم کرنا چاہتے۔ کشمیر تم سے بات کرتا رہے گا اور ہماری مدد ان کو حاصل رہے گی۔ ایک دن تم گورباچوف کی طرح خود کہہ دو گے کہ میں جا رہا ہوں تم چاہے بات کرتے ہو یا نہیں۔

میں نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک بار عرض کیا تھا کہ ہندوستان کی آخری پوزیشن کیا ہوگی...... میں نے لکھا تھا کہ آخری پوزیشن یہ ہوگی کہ وہ وادی سے باہر آ کر کشمیریوں سے کہے گا ہم تو جا رہے ہیں تم اپنے آزاد کشمیر کو خود آزاد کر لو اور اس کے بعد وہ جموں آ کر بیٹھ جائے گا۔ لیکن ہمیں جموں میں بھی سیاسی سوچ پیدا کرنی ہے اور وہ کام کرنا چاہیے کہ اس کو قدم وہاں بھی جمانے کا موقع نہ مل سکے۔

آخری بات یہ کہ ہمیں کشمیر کی اتنی اہمیت سمجھنی چاہیے جتنی جسم کے لیے شہ رگ کی ہوتی ہے۔ جسم کے دوسرے اعضاء کے بغیر جینے کا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن شہ رگ کے بغیر نہیں۔ مشرقی پاکستان کی شکل میں ہمارا پاؤں یا بازو کٹ گیا تو ہم Survive کر گئے۔ لیکن شہ رگ کٹنے سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے وقتی حالات کو سمجھتے ہوئے اور مستقبل بعید کے امکانات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے فیصلے کیے جائیں۔ ہمیشہ دور تک سوچا جائے کہ آگے کیا تصویر بن رہی ہے، تصویر صاف ہے کہ چین ایک ابھرتی ہوئی پاور ہے اور امریکہ ایک غروب ہوتی ہوئی طاقت۔ امریکہ کے ساتھ ہمیں اپنا معاملہ اسی حد تک رکھنا چاہیے کہ چونکہ اب وہ تھپڑ مارنے کی پوزیشن میں ہے......تو وہ تھپڑ ہم نہ کھائیں۔ لیکن ہم انتظار کریں جب اس کا تھپڑ مارنے والے بازو شل ہو جائے یا سوکھ جائے۔ تھوڑا سا صبر، تھوڑا سا حوصلہ اور تھوڑا سا انتظار اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے میں مدد دیتا ہے۔

......❁......

# پاکستان کی کشمیر پالیسی، گرداب میں

اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ ہماری کشمیر پالیسی گرداب میں جا گری ہے۔ صدر پاکستان نے نہ جانے کس مجبوری کے تحت عجلت میں ایک مباحثہ چھیڑا، جو اب اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہا ہے۔ ان کا یہ اقدام نہ صرف بے وقت اور بے محل تھا بلکہ اس میں کوئی گہری سوچ بھی نظر نہیں آتی۔ صدر مشرف محب وطن شخص ہیں۔ وہ کہتے ہیں کشمیر کی محبت ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے، لہٰذا کشمیر کاز سے ان کی کمٹ منٹ پر شک کرنا بھی درست نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے دیرینہ اصولی اور جائز موقف سے پیچھے ہٹنا کیوں گوارہ کیا۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ بھارت کی نیت اور رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؟ ایسا لگتا ہے انہوں نے برصغیر کی ہندو مسلم تاریخ سے کوئی سبق نہیں لیا۔ میں سمجھتا ہوں تاریخ نے ان پر جو بھاری بوجھ ڈالا ہے اس کا بے پناہ دباؤ وہ محسوس کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے ضمیر کا بوجھ مسلمانوں پر گزرنے والی کربلا میں جارج بش کے "جرم یزید" میں شرکت کرنا پڑی۔ پھر کارگل کی ناکام مہم جوئی، جعلی ریفرنڈم، دھاندلی پر مبنی انتخابات، ملک کی تعمیر نو میں بدترین ناکامی، نیب کی عدم افادیت، وانا میں اپنے ہی بھائیوں پر بمباری، عبدالقدیر خان جیسے قومی ہیرو کی رسوائی، کسی واضح مقصد کے بغیر افواج کا جانی و مالی نقصان، قوم کی ان سے بڑھتی ہوئی دوری، وردی اتارنے کا مخمصہ، سب سے بڑھ کر قضیہ کشمیر میں مکمل ناکام پالیسی۔ ایسے معاملات کو سامنے رکھ کر انسان کی بساط کیا پہاڑ بھی ہوں تو قائم نہیں رہ سکتے۔ پے در پے نفسیاتی حملوں سے دباؤ اور کنفیوژن کا شکار ہونا عین فطری بات ہے۔ تاہم نائن الیون کے بعد انہوں نے سرنگوں ہونے کی، جو پالیسی اختیار کی، وہ بڑی حد تک اختیاری تھی۔ انہوں نے اپنی اور عظیم قومی قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ تو اپنی "خدمات" کا مناسب معاوضہ وصول کرنے سے بھی قاصر رہے۔ کم از کم وہ "کشمیر بارگین" کا آپشن اختیار کر سکتے تھے لیکن انہوں نے پہلے امریکہ اور پھر بھارت کو اپنا سب کچھ پیش کر دیا، مگر اس کے بدلے میں خود کچھ نہ لے سکے۔

[illegible] میں آگرہ جانے سے پہلے صدر محترم نے ایک مشاورت بلائی، میں بھی اس میں موجود تھا۔ اس مشاورت میں میں نے بہت اصرار کیا تھا کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کو محور بنا کر بات کریں جو ہمارا جائزہ اور قانونی موقف ہے۔ کشمیری قیادت کا مقام بلند کریں۔ جو آپ کی اصلی قوت ہے اور تقسیم کشمیر کی ہرگز کوئی بات نہ کریں ورنہ بعد میں ہم بہت پشیمان ہوں گے۔ صدر نے جواباً مجھ سے سوال کیا: چناب لائن پر تقسیم نہیں ہونی چاہیے؟ میں نے جواب دیا: نہیں۔ یہ اپنے درست موقف سے انحراف بھی ہوگا اور ہم کشمیر کی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ بلکہ بھارت بھی چناب کی لائن ہرگز قبول نہیں کرے گا، کیونکہ وہ مذہبی لائن ایک اور

تقسیم سمجھے گا جو دوقومی نظریے پر مہر تصدیق ثابت کرنے کے مترادف ہوگی، جسے بھارت کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کرے گا، کیونکہ وہ مذہبی لائن ایک اور تقسیم سمجھے گا جو دوقومی نظریے پر مہر تصدیق ثابت کرنے کے مترادف ہوگی، جسے بھارت کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ وہ تو یونین آف انڈیا کو وسیع تر بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے قبول کرنے سے اس کا یہ خواب تشنہ رہ جائے گا۔ اسی طرح امریکہ اور مغربی بلاک کو بھی دریائے چناب پر تقسیم قبول کرنی ہوگی۔ کیونکہ وہ چین کے خلاف کھڑا کرنے کے لیے جس مقصد کے لیے بھارت کی پیٹھ تھپتھپا رہے ہیں، وہ مقصد ہی خطرے میں پڑ جائیگا۔ وہ بھارتی افواج جو لداخ میں چین کے سامنے کھڑی ہیں، ان کے لیے رسد کا کوئی مناسب راستہ دریائے چناب کے مشرق میں موجود نہیں۔ صرف وادی کشمیر کے اندر سے گزرتا ہوا راستہ جوزوجیلا اور کارگل سے ہوتا ہوا لیہ تک پہنچتا ہے۔ بھارت نصف صدی کی کوششوں سے ہماچل پردیش میں منالی قصبے سے لیہ تک ایک عارضی راستہ بنا سکا ہے۔ جو سال میں آٹھ ماہ بند رہتا ہے اور چار ماہ کھلتا ہے اس پر چھوٹی گاڑیوں کے گزرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس پر صدر مشرف نے کہا، کہ پھر ہم بھارتی فوج کو جائنٹ کنٹرول کے ذریعے راستہ دیں گے۔ میرا جواب یہ تھا کہ یہ بات اور بھی خطرناک ہوگی۔ جائنٹ کا مطلب ہے ہمیں بھارت کے ساتھ دفاعی معاہدہ تو کرنا پڑے گا جو سراسر چین کے خلاف ہوگا۔

آج بھارت نے دل کی بات کہہ دی ہے کہ اسے مذہبی تقسیم کسی طرح بھی منظور نہیں اس بہانے وہ کشمیر پر غاصبانہ تسلط قائم رکھنا چاہتا ہے لیکن ہم پھر بھی انہیں جائنٹ کنٹرول کیوں پیش کر رہے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم چین کے خلاف بھارتی صف بندی میں معاون بننا چاہتے ہیں......؟ مشترکہ دفاع کا دوسرا مطلب ہے کہ ہم اسے خود شاہراہ ریشم سے لیکر آزاد پتن اور میر پور تک پہنچنے کی سہولت فراہم کردیں گے۔ دوسری طرف ہم چین کے ساتھ روابط رکھنے میں بھارت کے محتاج ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کا تمام تر فائدہ بھارت کو ہوگا یا پھر امریکہ کو۔ اس طرح اس خطے میں استعمار کے مختلف مقاصد پورے ہوں گے۔ دوسری طرف بھارت نے کہا ہے کہ وہ جغرافیائی نقشے تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ یہ بہت گہری چال اور خطرناک پالیسی ہے۔ آج تمام اسلام دشمن دنیا کی مشترکہ سوچ یہی ہے کہ اس لیے نقشے بدلنے سے یہود ہنود یا عیسائیوں کا تو کوئی فائدہ نہیں کہ وہ سب تو پہلے ہی آزاد ہو چکے ہیں، محکومی کا شکار تو صرف مسلمان ہیں۔ وہ آزاد ہوں گے تو نقشے ضرور بدلیں گے بلکہ ان اندازے کے مطابق مسلمانوں کی آزادی کی تحریکیں کامیاب ہو جائیں گی تو دنیا بھر کے دو درجن بھر نئے ممالک قائم ہو جائیں گے صرف روس میں مسلمانوں کی آزادی کے سلسلے میں کم از کم سات نئے ملک وجود میں آسکتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ اس سے جغرافیائی نقشے تبدیل ہوں گے، یہ تبدیلی امریکہ کو پسند ہے نہ ہندوستان اور نہ اسرائیل کو قبول ہے۔

نومبر 2001ء میں ہماری قیادت نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کو نعرہ لگا کر امریکہ کے سامنے سرنگوں ہونا قبول کیا۔ پسپائی کا راستہ پسند کرنے والوں کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مقام سے نیچے گرنے کے بعد کہیں نہیں رکتے بلکہ نیچے ہی لڑھکتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ نائن الیون سے پستی کا جو سفر شروع ہوا، کہیں رکا نہیں۔ یہاں تک کہ اس سال ۶ جنوری کو ہم نے بھارت کے سامنے باقاعدہ سر جھکانے کا آغاز کر دیا۔ ہم نے اسے یہ گارنٹی دے دی کہ لائن آف کنٹرول پر جہادیوں کی نقل و حرکت ختم کر دیں گے۔ یعنی انہیں اپنے ہی ملک

میں ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ حالانکہ اس کی اجازت انہیں بین الاقوامی اور اقوام متحدہ کا چارٹر دیتا ہے۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ دیوار برلن پار کرنے والے تو اہل مغرب کے نزدیک ہیرو قرار پائے لیکن ''باڑ برہمن'' توڑنے والا ساری دنیا کی طرح پاکستان میں بھی مجرم ٹھہرا۔ ہم نے بھارت کو اجازت دے دی کہ وہ کنٹرول لائن پر باڑ کھڑی کر کے کشمیر کو دو حصوں میں بانٹ کر دے۔ ہم نے مجاہدین کو دہشت گرد مان لیا۔ حالانکہ یہاں بھارت کی گردن بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ وعدہ کیا گیا تھا کہ کشمیر کے بارے میں کوئی اوقف سے ہٹ کر سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا، لیکن اقوام متحدہ کی قراردادوں سے انحراف کر کے سمجھوتے پر آمادگی ظاہر کر دی گئی۔ حقیقت میں یہی قراردادیں ہیں جو مسئلہ کشمیر میں فریق ہونے کا پاکستان کو حق دیتی گی۔ اقوام عالم کا یہی فیصلہ کشمیریوں کو حق خودرادیت اور بھارت پر کشمیر میں اقوام متحدہ کے زیر انتظام رائے شماری کو لازم ٹھہراتا ہے۔
ہم نے اس موقف سے انحراف کیا جو دراصل اقوام متحدہ کا موقف تھا۔ اور جس کی تائد و توثیق کرنے والوں میں بھارت بھی شامل تھا۔ بھارتی وزیر اعظم نہرو نے خود یہ وعدہ کیا تھا۔ وہ کشمیر کے عوام کو حق خودرادیت دیں گے۔ ہمیں کیا حق تھا کہ وہ اقوام متحدہ کے متفقہ موقف کو مسترد کر کے کشمیر کاز پر کاری ضرب لگائیں۔ یہ کمزوری ان لوگوں نے دکھائی جنہوں نے ''سب سلے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگایا۔

یہ بات سرے سے غلط ہے کہ وادی کشمیر، جموں یا لداخ ہمارے کہنے سے ٹکڑوں میں بٹنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کشمیر کی صدیوں پرانی تاریخ ہے۔ صدر نے انہیں سات الگ الگ خطے قرار دیکر ان خطوں کے عوام کے پاکستان پر اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ کیا انہوں نے جموں کے ڈوگروں سے یہ بات پوچھی ہے کہ وہ خطہ کشمیر سے کٹ کر ہندوستان سے ملنا چاہتے ہے۔؟ وہ ایسے احمق ہرگز نہیں ہوسکتے کہ بھارت شکست و ریخت کے نتیجے میں خالصتان اور پاکستان کے بیچ پھنس کر رہ جائیں۔ وہ دیکھ رہے کہ بھارت کا غیر جمہوری رویہ اور فرسودہ طبقاتی سماج بہت جلد اسے توڑ دے گا اسی طرح لداخ کے دو لاکھ بدھوں سے پوچھیں تو وہ کبھی نہیں کہیں گے ہم وادی چھوڑ کر دہلی سے جاملنے کے لیے کے تیار ہیں۔ پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ جموں میں ہندو اکثریت ہے۔ جموں میں ہندوؤں کی تعداد محض 37 فیصد ہے۔ ضلع ڈوڈہ میں ساٹھ فیصد مسلمان رہتے ہیں ریاسی، کٹھوعہ اور کشتواڑ میں بھی قابل لحاظ مسلمان رہتے ہیں اور جو وہاں سے ہجرت کر کے اِدھر اُدھر چلے گئے ہیں ان کے ووٹ بھی یقیناً ہندوستان کے خلاف جائیں گے۔ اسلام کشمیر کے تمام خطوں کو ایک مضبوط زنجیر کی طرح باندھے ہوئے اور کشمیریت بھی......جس کی صدیوں پرانی تاریخ ہے۔

چار دسمبر کو صدر پرویز مشرف امریکی صدر سے ملاقات کر رہے ہیں۔ اس ملاقات میں کشمیر کے بارے میں کسی مثبت پیش رفت کی (کونڈالیزا رائس کی موجودگی میں) بہت کم امید ہے۔ خصوصاً اس حال میں کہ آپ خود ہی ان کے سامنے خود سرنگوں ہو چکے ہیں۔ اور آپ نے ''اپنی خدمات'' کا کوئی معاوضہ بھی طے نہیں کیا...... نہ ہی انہوں نے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی کوئی یقین دہانی کرائی ہے۔ صدر اپنی ............. اس کے اصل مفہوم سے آگاہ ہے۔ امریکی تھنک ٹینک بہت پہلے تقسیم کشمیر کی خوبیاں بیان کرتے رہے ہیں۔ مگر پاکستان، کشمیر اور بھارت میں اس کا یکسر مختلف مطلب سمجھا گیا۔ کشمیری اس سے سخت مایوس ہوئے اور من موہن سنگھ نے صدر کی

اس تجویز کو ''بہکے ہوئے خیالات'' قرار دیا۔ صدر اور ان کے ساتھی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ محض ایک مباحثے کا موضوع ہے لیکن یہ بات ایک ایسے شخص نے کہی ہے کہ جو ملک کا صدر اور آرمی چیف ہے۔ اس کی طرف سے اس بات کے اظہار کو بجا طور پر کمزوری قرار دیا گیا۔ ہم نے یہ کمزور پوزیشن اختیار کر لی ہے کہ اگر ہندوستان اپنے پرانے موقف پر اٹل ہے تو ہم کیوں اپنے موقف سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا بھارتی وزیراعظم نے سری نگر میں کھڑے ہو کر کہا...... کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ اس لیے ہم نے اپنی تجویز کے ذریعے انہیں پیغام دیا کہ ہم تھک چکے ہیں۔ جنگ سے بھاگ رہے ہیں۔ ہر قیمت پر معاملہ کرنے کو تیار ہیں۔ چاہے ہمیں اپنے مسلمہ موقف سے انحراف ہی کیوں نہ پڑے۔ صدر مشرف اسی کمزور موقف کو لیکر امریکہ جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ کچھ بھی منوانے کے پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔

صدر مشرف اس لیے کمزور ہیں کہ مٹھی بھر ہم نواؤں نے ان کا رشتہ قوم سے کاٹ ڈالا ہے۔ کشمیر جیسے قومی معاملے میں عوام ان کی پشت پر ہوتے تو وہ خود طاقتور اور ان کو طاقت کے محور پر گھومنا نہ پڑتا۔ ان کے ساتھ وہ حقیر اقلیت ہے۔ جو ہمیشہ کی طرح آج بھی قومی معاملات میں دخیل ہے۔ پاکستان کے پندرہ کروڑ عوام کو اس مخصوص طبقے سے شدید چیلنج درپیش ہے۔ حکومت نے باہمی اعتماد کے اقدامات (CBMS) کے نام پر اس گروہ کو بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو کم لباس اور زیادہ نمائش کا دلدادہ ہے۔ اسے بھارت کے کھلے کلچر میں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اسی طرح ہمارے غیر نظریاتی تاجروں کا طبقہ ہے جو ہر قیمت پر دولت کمانے کا عادی ہو چکا ہے انہیں بھارتی مارکیٹ تک رسائی دیوانہ بنائے ہوئے ہے۔ انہیں بھی روکنا دشوار ہے۔ پھر وہ دانشور ہیں جو کبھی ماسکو کے گرد گردش کیا کرتے تھے سوویت یونین پر زوال آیا تو امریکہ کو اپنا قبلہ مان کر وہاں جبہ سائی کرنے لگ گئے اور اب دہلی کو نیا قبلہ بنا رہے ہیں، انہیں کیسے سیدھا کیا جائے۔ یہ طبقہ اقتدار کے ایوانوں میں گہرے اثرات رکھتا ہے، اس لیے ان کے ہاتھوں اور زبانوں کو روکنا بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہ لوگ جو گالی دینے اور الزام تراشی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ کشمیر ان کی مذموم خواہشوں کی تکمیل میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ کشمیر پر مثبت پالیسی اختیار کی گئی تو یہ اندر سے معاشرتی محاذ آرائی پیدا کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

کشمیر پالیسی میں جو تبدیلی لائی گئی ہے وہ پاکستان کے لیے بھی خطرناک ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اسے واپس اپنے مقام پر لانا ہوگا۔ قوم کے اصحاب رائے و ضمیر پر فرض ہے کہ اس صورت حال کا نوٹس لیں۔ میں ملک کی سیاسی جماعتوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ریاست جموں کشمیر کے بارے میں وہ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ وہ لوگ جو خود کو مسلم لیگ میں شمار کرتے ہیں۔ کیا وہ اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا......؟ میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے پوچھتا ہوں ان کا کشمیر کے بارے میں کیا خیال ہے، ان کے قائد ذوالفقار علی بھٹو نے کشمیر کی خاطر ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کا اعلان کیا تھا......؟ وہ سیاسی پارٹیاں کیوں خاموش ہو گئی ہیں، جنہوں نے کشمیر کی تحریک اور جدوجہد آزادی کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا...... کیا وہ امریکہ کے دباؤ پر جہاد سے منحرف ہو جائیں گی۔؟ امریکہ تو چاہتا ہے، ہم قرآن کی ساری تعلیمات سے دست بردار ہو جائیں کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟

# کشمیر پالیسی کو درست سمت دینے کی چند تجاویز

فوری طور پر جن اقدامات کی ضرورت ہے میں ان کا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کشمیر ہمارے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے اور ہم اس کے لیے کس حد تک جاسکتے ہیں۔ یہ وہ بنیادی فیصلہ ہے جو مستقبل کی پالیسی کا رخ متعین کرے گا۔ اس مرحلے پر پاکستان کی پالیسی کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ آج ہر ایک شک وشبے کا شکار ہے خدا نخواستہ سب سے ''پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگاتے ہوئے کشمیر کو بھی پاکستان کے ایجنڈے سے خارج تو نہیں کر دیا گیا۔؟

۲۔ ہم امریکہ سے معاہدہ کر کے جو کچھ گنوا چکے ہیں۔ وہ بھی کم خسارہ نہیں لیکن بہت کچھ گنوا کر بھی کچھ نہ کچھ بچایا جاسکتا ہے۔ کم ازکم ہم میں امریکہ کا ایسا مطالبہ مسترد کرنے کی ہمت ہونی چاہیے جو ہماری بقا اور سلامتی کے منافی اور قومی مفاد کے خلاف ہو۔ اس سے ''مودبانہ انکار'' کر دیا جائے۔ میرے خیال میں نائن الیون کا خوف بھی غیر ضروری تھا۔ باہمی مشاورت اور قائدانہ بصیرت وفراست ہمیں اس بحران سے نکال سکتی تھی۔ خوف کے تحت کیے گئے فیصلے نے ہماری قومی حمیت کو نقصان شدید پہنچایا۔ بصیرت وشعور سے محرومی کی وجہ سے ہم اپنی ''خدمات'' کے بدلے امریکہ سے سودا بازی میں بھی مات کھا گئے کشمیر کے مسئلے کے حل کو امریکہ سے تعاون کے ساتھ وابستہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم اس میں بھی ناکام رہے۔ آج جب امریکہ ایک رو بہ زوال طاقت ہے۔ تو ہمیں کم از کم فلوجہ کے برابر غیرت کا مظاہرہ تو کرنا چاہیے۔

۳۔ قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کمزور پوزیشن میں کیے گئے معاہدے ہمیشہ طاقت ور کے حق میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا آج اگر ہماری پوزیشن کمزور ہے تو ہمیں عجلت میں کسی معاہدے کے جال میں پھنسنے کی ضرورت نہیں۔ آج اگر ہم زمینی حقائق کا اعتراف کر کے کمزور پوزیشن اختیار کر لی گئی ہے۔ تو صبر کر کے حالات بدلنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ گزشتہ کل کے زمینی حقائق آج بدل گئے ہیں۔ تو آج کی زمینی حقیقتیں بھی کل نہیں رہیں گی۔ قرآن کے احکام بھی یہی ہیں کہ کمزور پوزیشن میں کوئی معاہدہ نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے سامنے چین کی مثال موجود ہے۔ جس نے 1888ء کا مک موہن لائن کا معاہدہ کمزور پوزیشن میں ہونے کے باوجود مسترد کر دیا۔ ہانگ کانگ اور تائیوان پر غیر ملکی تسلط کبھی قبول نہیں کیا۔ مگر صبر کے ساتھ بہتر

وقت کا انتظار کیا۔

۴۔ بھارت صرف اس وقت اندرونی دباؤ سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس پر کوئی بیرونی دباؤ موجود ہی نہیں۔ اندرونی دباؤ صرف کشمیری ڈال سکتے ہیں۔ بشرطیکہ پاکستان ان کا حوصلہ بڑھائے انہیں ایسا تاثر نہ دیا جائے کہ مشکل پڑنے پر پاکستان ان کی پیٹھ پر چھرا بھی مار سکتا ہے۔ اگر پاکستان پر کمزور لمحے آ ہی گئے ہیں۔ تو کشمیریوں کو بھارت سے نپٹنے دیا جائے۔ وہ بھارت کو سبق دے سکتے ہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ بھارت کے سابق وزیر دفاع جارج فرنانڈس، جنرل ہری پرشاد اور جنرل وید ملک اور بے شمار عسکری ماہر اور سیاستدان کہہ چکے ہیں کشمیر کا کوئی فوجی حل نہیں۔ یعنی وہ کشمیری مجاہدین کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا اعتراف کر چکے ہیں۔ ہمیں کشمیر پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہی جنگ میں عملاً شریک ہونا تھا محض کشمیریوں کی اخلاقی اور سفارتی امداد کرنی تھی۔ اور یہ جنگ ہم جیت رہے تھے لیکن بصیرت کی کمی کی وجہ ہے ہم صبر نہ کر سکے اور جلد بازی میں سب کچھ گنوا دیا۔ اس نقصان کی تلافی کے لیے کشمیریوں پر اعتماد ضروری ہے۔ انہیں یہ موقع دینا چاہیے کہ وہ بھارت کو زمینی حقائق تسلیم کرنے پر آمادہ کر دیں۔

۵۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بھارت پاکستان کو شہ مات دینے کے لیے کشمیر کی اندرونی خودمختاری کا اعلان کر دے۔ اس چال کا توڑ کرتے ہوئے پاکستان پہل کرتے ہوئے اپنے آئین میں ترمیم کر دے۔ آئین میں یہ شق شامل کی جائے کہ پاکستان سے الحاق کی صورت میں کشمیر کو (تین محکمے خارجہ، دفاع اور کرنسی چھوڑ کر) مکمل خودمختاری دی جائے گی اس سے بھارت کی چال ناکام ہو جائے گی اور سارے کشمیر میں پاکستان کے ساتھ الحاق کے سلسلے میں یک جہتی پیدا ہو جائے گی۔ آئینی طور پر کشمیریوں کو اس بات کی بھی یقین دہانی کرائی جائے کہ الحاق کی صورت میں کسی غیر کشمیری کو کشمیر میں جائیداد خریدنے یا وہاں لوٹ کھسوٹ کرنےکی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جس طرح مفاد پرست عناصر آج گوادر کی زمینوں پر قبضہ جما رہے ہیں۔ ہمیں کشمیریوں کی یہ ضمانت فراہم کرنی چاہیے کہ کشمیر کشمیریوں کا ہی حق ہے۔

۶۔ ہم آزاد کشمیر کو غلط انداز میں چلا رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف کنٹرول لائن کے اس پار غلط پیغام جا رہا ہے بلکہ آزاد خطہ بھی حقیقی بیس کیمپ نہیں بنا سکا۔ وقت آ گیا ہے کہ آزاد کشمیر میں تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل لبریشن کونسل بنائی جائے تا کہ اقتدار کا موجودہ مکروہ کھیل ختم ہوا اور کشمیری متحد ہو کر کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کر سکیں۔

۷۔ سیاچن پر بھارتی فوج بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ وہاں ہماری خاموشی فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے سخت غلط ہے۔ ہم نے بتیس ہزار بھارتی فوج کو ریلیف دے کر فارغ بٹھا دیا ہے حالانکہ وہ ہمارے علاقے میں گھس بیٹھے ہیں لیکن امن سے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں ہماری پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ وہ اگر سیز فائر چاہتے ہیں تو ایک طرفہ طور پر ہمارا علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں۔

۸۔ ہماری موجودہ کشمیر پالیسی سے دنیا بھر میں پاکستان کے سفارتکار بالکل ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔اس کی وجہ پالیسی میں کنفیوژن ہے۔سفارت کار یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ معاملہ جنرل مشرف اور من موہن سنگھ براہ راست حل کر سکتے ہیں۔ان کی ضرورت نہیں رہی۔حالانکہ آج سفارتی محاذوں پر پہلے سے بڑھ کر سرگرمی دکھانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے سفارت کاروں کو ساری دنیا پر واضح کر دینا چاہیے کہ جدو جہد آزادی اور دہشت گردی میں کیا فرق ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ انسانی حقوق پر پوری دنیا میں جو شور مچا ہوا ہے۔اس کا اطلاق کشمیریوں پر کیوں نہیں ہوتا۔ ہمارے سفارتکاروں کو چاہیے وہ ساری دنیا میں کشمیریوں پر ہونے والے ظلم کو واضح کریں اور ہندوستانی فوج کی دہشت گردی نمایاں کر کے دکھائیں۔

۹۔ جب سے جامع مذاکرات کی بات چلی ہے پاکستان اور بھارت میں باہمی اعتماد کے اقدامات یا CBMS کا بڑا چرچا ہے۔ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ایسے اقدامات کے سلسلے میں پاکستان اور بھارت کی سوچ میں بعد المشرقین ہے پاکستان سمجھتا ہے باہمی اعتماد بحال ہونے کے وقت سے ہم انڈیا کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر راضی کر لیں گے۔ جب کہ بھارت سمجھتا ہے۔باہمی اعتماد کے اقدامات سے وہ کشمیریوں کو ان کے حقوق کے محروم رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔باہمی اعتماد کو بحال کرنے سے بھارت کی کوشش یہ ہے کہ دوقومی نظریہ تحلیل ہو جائے، تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

۱۰۔ یہ تاثر دینا چھوڑ دیں کہ ہم جنگ لڑنا نہیں چاہتے ہمیں آگے بڑھ کر یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ آزادی اور انصاف کے لیے ہمیں جب بھی لڑنا پڑے گا ہم ضرور لڑیں گے۔ہم جنگ نہیں چاہتے لیکن دوسروں پر اپنی ''امن پسندی'' کو کمزوری بنا کر پیش کرنا بھی غلط ہے۔ جنگ روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جنگ سے جی نہ چرایا جائے۔ جنگ سے بھاگیں تو جنگ مسلط ہوگی۔

۱۱۔ بھارت دوستی کے پردے میں بڑی خاموشی سے ہمارے دریاؤں پر ڈیم بنا رہا ہے، ہم جانتے ہیں کہ ہمارا پانی وہاں سے آتا ہے، اگر وہ ہماری شہ رگ بند کر دے گا، تو ہمیں جنگ ضرور لڑنی پڑے گی۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بھارت کشمیر میں بہت تکلیف میں ہے۔لیکن وہ کشمیر کو بائی پاس کر کے گیس پائپ لائن کی بات کر رہا ہے۔اس سے بھی آگے اس کی نظر سلامتی کونسل کی سیٹ پر ہے۔ اسے یہ سیٹ اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ پاکستان اس سے یہ الزام واپس لے لے کہ وہ کشمیریوں کے حقوق غصب کر رہا ہے اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کو تسلیم نہ کر کے عملاً یو این او کا ڈیفالٹر بنا ہوا ہے۔ہمیں کسی صورت میں بھارت کے لیے سلامتی کونسل کا راستہ صاف نہیں کرنا چاہیے۔

......❁......

# پاکستان کی کشمیر پالیسی کیا ہے؟
# کیوں ہے؟ کیسی ہو؟

1990ء میں کشمیر میں تحریک آزادی شروع ہوئی تو بھارت کو اس کی شدت، گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہ تھا نہ ہی آنے والے دنوں میں اس کے بے پناہ قوت اور پھیلاؤ کا کما حقہ شعور احساس تھا۔ چنانچہ خلاف توقع جب یہ رونما ہونے لگا تو بھارت کی حکومت اور اس کے اداروں کے بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔ دوسری طرف ہم نے قضیہ افغانستان سے فارغ ہو کر جب ضرب مومن شروع کی تو جس کا مقصد بھارت کو یہ احساس دلانا تھا ہم نہ صرف اپنے دفاع کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ جنگ کو دشمن کے علاقے کے اندر لے جانے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سے بھارت کو یہ احساس ہو چلا کہ پاکستان بزور بازو کشمیر کا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے۔ ان ہی دنوں وزیر اعظم بے نظیر صاحبہ مظفر آباد گئیں اور وہاں پر انہوں نے کشمیر کی جدوجہد آزادی کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کیا...... بلکہ یہ بھی کہا کہ اہل کشمیر کے خون کے ساتھ ہمارا خون بھی شامل ہوگا۔ اس سے بھی بھارت کے پالیسی سازوں نے یہ تاڑ لیا کہ پاکستان کی حکومت کسی دوٹوک فیصلے پر پہنچنے والی ہے۔

اسی زمانے میں امریکہ کی سی آئی اے کے سربراہ باب گیٹس پاکستان اور بھارت کے دورے پر آئے تو انہوں نے کہا کہ جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور نیوکلیئر جنگ چھڑ جانے کا امکان ہے حالانکہ اس وقت بظاہر جنگ کا کوئی خطرہ موجود نہ تھا...... لیکن امریکہ کو خوف تھا کہ جنگ ہوئی نیوکلیئر قوت استعمال کی گئی تو اس کے تصوراتی ''نیو ورلڈ آرڈر'' کو دھچکا لگے گا۔ ان واقعات کے پس منظر میں دیکھیں تو 1990ء کا سال تحریک آزادی کشمیر کے لیے بہت اچھا تھا...... ہم نے نہ صرف تحریک آزادی کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار کیا بلکہ بھارتی حکومت کو بھی احساس دلانے میں کامیاب ہوئے کہ ہم کشمیر کے لیے کس حد تک قربانی دینے کو تیار ہیں۔ اِدھر مجاہدین آزادی کی تحریک میں بھرپور رفتار سے تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ اگر چہ ان کے بہت سے افراد شہید بھی ہو رہے تھے لیکن تحریک آزادی کی رفتار بہت اچھی تھی۔ تحریک آزادی کی سب سے اہم کامیابی یہ تھی بھارت کا خبر رسائی کا نظام تباہ کر دیا گیا اس کا اطلاعاتی اور مخبری کا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ سرکاری مشینری مجاہدین کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

## غیر ملکی دباؤ اور ایٹمی پروگرام

سال 1991ء تحریک آزادی کے لیے بہتر ثابت نہ ہوا۔ اس لیے کہ اس سال ہمارے نیوکلیئر پروگرام کو

Cap کر دیا گیا۔ اس کی وجہ بھارت کے دل میں جنگ کی صورت میں جو خوف تھا اس میں کمی واقع ہوئی۔ ظاہر بات ہے کہ جب بھارت کو معلوم ہوگا پاکستان نے ایٹمی پروگرام پر پیش رفت روک دی ہے۔ تو انہوں نے اپنی نئی جنگی حکمت عملی تیار کر لی۔

یہاں مناسب ہوگا کہ پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کے بارے میں تین اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں پہلے ان کی مختصر وضاحت کر دوں۔

الف۔ منجمد کرنا (Freezing) اس سے مراد نیوکلیئر ہتھیاروں کی تیاری کے عمل کو اس سطح پر قائم رکھنا جس پر وہ موجود ہو۔ تاہم اس کو آگے نہ بڑھایا جائے۔

ب۔ ٹوپی پہنا دینا Caping ...... اس کا مطلب ہے ہتھیاروں کے بنانے کا کام اور یورینیم کی افزودگی کا عمل (Enrichment) روک دینا۔

ج۔ رول بیک (Roll Back) اسکا مفہوم یہ ہے کہ پہلے سے تیار شدہ مواد کو تباہ کر دیا جائے اور ہتھیار تیار کرنے کی نئی صلاحیت کو ختم کر دیا جائے۔

بدقسمتی سے Caping کا اعتراف تو کافی سیاسی حلقوں اور شخصیات کی طرف سے ہوا ہے۔ مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔ اس لیے کسی سیاسی جماعت نے ایسا کرنے کا اختیار (Mandate) عوام سے نہیں لیا۔ کسی پارٹی کے منشور میں یہ بات شامل نہیں رہی بلکہ سب نے اپنے اپنے منشور میں ایٹمی پروگرام کے تحفظ کا وعدہ کیا...... لیکن اقتدار میں آنے کے بعد وہ ایسا نہ کر سکے۔ انہوں نے کیپ آن کا خود اعتراف کیا۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ کس نے انہیں اس کا اختیار دیا ہے...... اگر وہ جمہوریت کے علمبردار تھے تو انہوں نے عوام کے دیئے ہوئے ''مینڈیٹ'' سے کیوں تجاوز کیا جبکہ عوام نے انہیں اس کا اختیار نہیں دیا تھا۔ سب نے تسلیم کیا کہ ایسا بیرونی دباؤ میں آ کر کیا گیا ہے۔

دراصل عالمی طاقتوں نے اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ وہ متوقع جنگ کا سدباب کر سکتی ہیں۔ انہوں نے دباؤ ڈالا اور دباؤ قبول کر لیا گیا۔ 1991ء میں ہی بھارت کو یہ سگنل ملنے لگے کم از کم کشمیر کے مسئلے پر ہم جنگ کے لیے تیار نہیں۔ مختلف رویوں سے یہ تاثر دیا گیا کہ پاکستان کشمیر کے مسئلے پر جنگ کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ حکومتیں بہت سوچ سمجھ کر قومی امور پر فیصلے کرتی ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن کم از کم بھارت کو یہ تاثر دینا ہرگز درست نہ تھا کہ ہم جنگ نہیں کر سکتے یا نہیں کرنا چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت نے اپنی فوجیں دوسرے محاذوں سے ہٹا کر دھڑا دھڑ کشمیر میں داخل کر دیں۔ عسکری نقطہ نگاہ سے وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کبھی ایسی پوزیشن اختیار نہ کرتا جسے فوجی اصطلاح میں عسکری عدم توازن Military Imbalance کہا جاتا ہے۔ ایسا پاکستان کی طرف سے اشارہ ملنے پر ہوا اور فوجی عدم توازن پیدا ہو گیا۔ بھارت اپنی ساڑھے پانچ لاکھ فوج کشمیر لانے میں کامیاب ہوا تو ظاہر ہے اس نے ہماری کوئی کمزوری تو دیکھ لی ہوگی۔ میرے خیال میں ایسا ہماری قطعی طور پر کمزور پالیسی کی وجہ سے ہوا کہ وادی کشمیر کی (لداخ کے ۳ لاکھ نکال کر) ۳۵ لاکھ آبادی کے خلاف ساڑھے پانچ لاکھ فوجی لائے گئے۔

ہماری کمزور پالیسی کا نتیجہ کہ 90ء میں محترمہ بے نظیر کی تقریر سن کر جو نوجوان پاکستان آئے یہاں آ کر ان کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ پاکستان کی حکومت نے جم کر ان کی حمایت نہ کی اس سے ان کو غلط تاثر ملا اسی کا نتیجہ ہے کہ وادی کے باہر تحریک میں پھیلاؤ نہ آ سکا یا کم از کم مطلوبہ پھیلاؤ نہ آ سکا جموں میں ڈوڈہ کو چھوڑ کر تحریک نے کوئی قابل ذکر نفوذ نہیں کیا۔ بھارت پر جو دباؤ پڑنا چاہیے تھا وہ نہ پڑا۔ پونچھ اور دوسرے پہاڑی علاقوں کے فوجی مزاج اور پیشے کے لوگ تحریک میں عملاً شریک نہ ہو سکے۔ ہماری کمزوری یہ تھی کہ ہم اہل کشمیر کو بھرپور انداز میں یہ پیغام نہ دے سکے کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ کہاں تک جا سکتے ہیں۔ جبکہ بھارت نے نہایت ظالمانہ انداز سے انہیں یہ پیغام دیا کہ تمہیں ہماری سنگینوں سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ نہ تمہارا واویلا ہمیں متاثر کر سکتا ہے۔ ظلم و ستم پر احتجاج اور شور مچانے کا بھارت پر کیا اثر پڑا۔ چار برس گزر گئے ہیں بھارت نہ تو انسانی حقوق کی تنظیموں کو جانے دیا۔ نہ ہی ایمنسٹی انٹرنیشنل کو اجازت دی اور نہ کسی پریس رپورٹر کو چھوڑا۔ اگر پاکستان ایسا کرتا تو پاکستان پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ اس کے باوجود پاکستان نے کچھ نہیں کیا اسے دہشت گردی کی دھمکیاں دی گئیں۔

## دہشت گردی کی گیدڑ بھبکی

جہاں تک دہشت گردی کی دھمکیوں کا معاملہ ہے۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں یہ گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ وہ کبھی ہمیں دہشت گرد قرار نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے انہیں کشمیر کی تحریک آزادی کو دہشت گردی قرار دینا پڑے گا وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ اس لیے کشمیر کی تحریک آزادی سیاسی اخلاقی اور قانونی لحاظ سے آزادی کی جائز تحریک ہے۔ دنیا کے تمام قوانین کے تحت اور خود اقوام متحدہ کے تمام قاعدے اور قانون اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دہشت گردی کی مرتکب تو بھارت کی حکومت ٹھہرتی ہے۔ اس کی افواج دہشت گردی کی مرتکب قرار پاتی ہیں۔

کشمیری عوام اور مجاہدین تو جدید و قدیم قوانین کے عین مطابق اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ وہ اپنے علاقے میں اور بڑے مہذب طریقے سے جدوجہد کرتے ہیں۔ انہوں نے بھارت کے علاقے کے اندر کوئی بم دھماکہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس بھارت ان کے علاقے میں دہشت گردی کر رہا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کرنے والے عوام اور مجاہدین پرامن ہیں۔ ان کی امن پسندی اس سے ثابت ہوتی ہے۔ وہ دشمن کی خواتین اور بچوں کو اغوا نہیں کرتے انہیں آگ میں زندہ نہیں جلاتے ان کے پاؤں نہیں کاٹتے۔ پھر پوری قوم ان بھاری دہشت گردوں سے کیوں مل جائے۔

دہشت گردی کا ہوا ختم ہوا کہ اس نے ختم ہی ہونا تھا پتہ نہیں ہم اس سے کیوں ڈر رہے تھے کہ ہمیں دہشت گرد قرار نہ دے دیا جائے؟ ہم نے بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس بے بنیاد خوف کی وجہ سے بہت سے اہم کام نہ ہو سکے جس سے بہت سی خرابیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ بھارت کوئی مطالبہ ماننے کے بجائے پھر اہل کشمیر کو یہ تاثر دے رہا ہے کہ میں

الاقوامی سطح پر نہ تو تم ہماری دست برد سے محفوظ ہو نہ پاکستان۔ بالآخر تمہیں ہماری حکمرانی قبول کرنی پڑے گی۔
اب وہ ان سے اپنی دو شرائط منوانا چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ کنٹرول لائن کو سرحد تسلیم کر لیا جائے دوسرا بھارت کی یونین کے اندر رہتے ہوئے جو بھی مانگو گے ملے گا لیکن کشمیری جانتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی بھارت نے ان سے کیا ہوا کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ ایک طرف یو این او کی قراردادوں کو فراموش کیا گیا دوسری طرف آرٹیکل ۳۷۰ کے تحت کشمیریوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کا اپنا وزیر اعظم اور اپنا صدر ہوگا اپنا جھنڈا ہوگا اس کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ شیخ عبداللہ کو دوستی کا جھانسہ دیکر جیل بھیج دیا گیا جہاں وہ برسوں دھکے کھاتے رہے۔ ظاہر بات ہے کہ کشمیری بھارت کے کسی وعدے کا اب اعتبار نہیں کر سکتے نہ بھارت کی یہ حکمت عملی کامیاب ہو سکتی ہے۔

صاف نظر آتا ہے کہ آخر کار بھارت کو بین الاقوامی دباؤ کے تحت یہ حقیقت قبول کرنی پڑے گی کہ کشمیری اس کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اب مغرب کی سیکولر قوتوں کو اس بات کا خطرہ نظر آنے لگا ہے کہ خطہ کشمیر بین الاقوامی اسلامی جدوجہد کا مرکز نہ بن جائے اور زمین کا مسئلہ نہ بن جائے۔ دنیا بھر کے مسلمان ...... بالخصوص مسلمانان افغانستان کہیں اپنی اندرونی کشمکش سے فارغ ہو کر اِدھر کا رخ نہ کر لیں۔ پاکستان کی عوام اور نوجوانوں میں کشمیر جانے کا رجحان کہیں تیزی سے پھیل نہ جائے اور ان کی دیکھا دیکھی تمام دنیا کے مسلمانوں کا ریلہ ادھر نہ امڈ پڑے۔ انہیں خاص طور پر تشویش ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان کہیں کشمیر میں اکٹھا ہونا شروع نہ کر دیں۔

مجھے یقین ہے کہ مسلمان آئیں گے اگر جہاد کا اعلان کر دیا جائے اگر سعودی عرب کے چیف جسٹس بن باز صاحب افغانستان کے رشید دوستم کے مظالم پر احتجاج کر سکتے ہیں تو بعید نہیں کہ وہ مسلمانان کشمیر پر مظالم دیکھ کر یہاں بھی جہاد کا فتوئی صادر نہ کر دیں۔ پھر تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس جہاد میں عملی شرکت کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بھارت کو کچھ نہ کچھ تو قبول کرنا پڑے گا۔ اب دیکھنا وہ بالآخر جو قبول کرے گا وہ کیا ہوگا۔

تھرڈ آپشن کے نظریے کو مغرب میں بہت اچھالا جا رہا ہے بڑے وثوق سے کہا جا رہا ہے بھارت کو بھی تھرڈ آپشن منظور ہے۔ میرے خیال میں تھرڈ آپشن کی بات قبل از وقت ہے بھارت پہلے یہ تو تسلیم کر لے کہ کشمیر ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عام کشمیری کسی متفقہ لائحہ عمل پر متحد ہوں ...... وہ سب بھارت کے تسلط سے آزادی کے نصب العین پر متحد رہیں۔ پھر جب بھارت اس بات پر راضی ہو جائے کہ وہ کشمیر کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے تو پھر کسی دوسرے آپشن پر بات ہو سکتی ہے۔ میرے ذاتی خیال میں جو لوگ تھرڈ آپشن کی بات کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں پر خط تنسیخ کھینچتے ہیں۔ اس کے بعد اقوام متحدہ میں کوئی نیا اور ایسا ریزولوشن لانا اور پاس کروانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا جو کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق ہو ہمیں نہ تو سپر طاقتوں کی چال بازیوں میں آنا چاہیے نہ ہی خود کوئی چال بازی کرنی چاہیے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مغربی دنیا کو حمایت مجبور کرنے کے لیے تھرڈ آپشن کا سہارا لینا ضروری ہے تو وہ بھی غلطی پر ہیں۔ پہلے تو یہ اسلامی طریقے کے منافی ہے کہ کھل کر بات کرنے کے بجائے نفاق سے کام لیا جائے۔ اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ امریکہ

ہمارے ساتھ مخلص ہے اور کشمیر آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے گا تو بھی وہ سارے کشمیر کو آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا نہ ہی وہ کبھی اس کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالے گا۔

امریکہ کا یہ کیسا ہی ذاتی مفاد اور Strategic Interest کیوں نہ ہو وہ ایسا نہیں کرے گا۔ نہ ایسا کر سکتا ہے اس لیے امریکہ کی ساری پالیسی سازی خود اسرائیل کے طابع ہے اور اسرائیل بھارت کو اپنا منظور نظر سمجھتا ہے۔ ان دونوں کے آپس میں دفاعی معاہدے ہو چکے ہیں۔ جس میں ٹیکنالوجی کی ٹرانسفر کا معاہدہ بھی شامل ہے لہٰذا اسرائیل بھارت کو مقاصد کی تکمیل کے لیے بہت اہم تصور کرتا ہے۔

تھرڈ آپشن کے مفروضے پر کام کیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ وادی کو آزاد کرانا ممکن ہوگا۔ جموں کا وہ علاقہ جو دریائے چناب کے پار ہے آزاد نہیں ہو سکے گا۔ اس طرح لداخ کے رہنے والوں کی سوچ بھی تھرڈ آپشن سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تھرڈ آپشن کے تحت آزادی دینا بھارت کے لیے یوں آسان نہیں پھر اسے ان سینکڑوں ریاستوں کو بھی ''خود مختاری'' کا آپشن دینا پڑے گی جنہیں برصغیر کی تقسیم کے فارمولے کے تحت بھارت میں شامل کیا گیا تھا۔ ریاست میں بھارت نے منظم فوج کشی کے ذریعے زبردستی اپنا قبضہ جمایا تھا۔ اب اگر تھرڈ آپشن کو قبول کر لیا جائے تو جبری طور پر شامل کی گئی ریاستوں کو کیسے بھارت سے علیحدگی اختیار کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔ تو پھر تقسیم کا سارا فارمولا ہی تلپٹ ہو جائے گا۔ بھارت اس سے زیادہ متاثر ہوگا کہ وہاں پہلے سے علیحدگی پسندوں کی پندرہ تحریکیں چل رہی ہیں۔

## OIC کا اجلاس بلایا جائے

اب سوال یہ کہ اب گزشتہ غلطیوں کی تلافی اور آئندہ کے لیے موزوں ترین پالیسی کیا ہو۔ کشمیر کی موجودہ تحریک کو صحیح معنوں میں حمایت دینے کے لیے فوری طور پر کیا اقدامات کیے جائیں تو میرے خیال میں اسلامی ممالک کی کانفرنس (OIC) کی کانفرنس فوری طور پر بلائی جائے کیونکہ یہ صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ اقوام متحدہ کا کردار ہم نے بوسنیا میں دیکھ لیا ہے۔ یہ مسلمانوں کیلیے کوئی رول ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ خصوصاً اقوام متحدہ کی موجودہ قیادت سے تو کسی قسم کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ اس لیے اقوام متحدہ سے رجوع کرنا بے کار ہے اس سے بھارت کو تحریک آزادی کے خلاف ظالمانہ اقدامات کرنے کی زیادہ سے زیادہ مہلت ملتی رہے گی۔

اسی طرح شملہ معاہدے کے تحت مذاکرات بھی بے سود ثابت ہونگے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شملہ معاہدہ کشمیر کے مسئلے کے حل کے لیے تحت ایک ہی فریم ورک کے تحت رائے شماری کرانے سے یہ مسئلہ حل ہو جائیگا لیکن اپنی قراردادوں پر عمل درآمد کروانے کے لیے اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل اپنے طور پر پہل کرنے پے آمادہ ہے۔؟ بالکل نہیں ہرگز نہیں بلکہ بطروس غالی تو مصالحت کرانے کی بات کراتے ہیں۔ حالانکہ ادارہ اقوام متحدہ ان کو ساری تنخواہ اپنی قراردادوں پر عمل درآمد کروانے کی دیتا ہے۔ لہٰذا اس وقت او آئی سی کا اجلاس طلب کرنا ہی واحد اور قابل عمل رستہ رہ جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقوام متحدہ اور شملہ معاہدہ مقبوضہ کشمیر میں خون ریزی بند کرانے

میں ناکام ہو چکے ہیں۔اسلامی ممالک کی ہنگامی کانفرنس اس طرح بلائی جائے جس طرح روس کی طرف افغانستان پر حملے کے بعد اسلام آباد میں ہنگامی اجلاس ہوا تھا۔امریکہ کی سوچ میں تبدیلی نظر آتی ہے۔اس لیے اسے اجلاس کے انعقاد پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔افغانستان کے مسئلے پر ایران نے قرارداد پیش کی تھی بہتر ہوگا کہ اس مرتبہ بھی کوئی دوسرا ملک قرارداد پیش کرے۔

## نظریاتی ہم آہنگی کی ضرورت

پاکستان کی گروہی تقسیم اور سیاسی انتشار کشمیر کی تحریک آزادی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔یہ حوصلہ افزا بات ہے کہ پانچ فروری کو پوری قوم نے متحد ہو کر بھارت کو یقین دلایا ہے کہ ہم سب مسئلہ کشمیر پر ایک ہیں۔بھارت کو اپنی بھائیوں کو خون بہانے کی کھلی چھٹی نہیں دے سکتے لیکن سیاسی دھڑوں میں اقتدار کی رسہ کشی سے بار بار اصل مسئلے سے نگاہ ہٹ جاتی ہے۔یہ کیسی بدقسمتی کی بات ہے حالیہ الیکشن میں موٹروے اور ییلو کیب جیسے فروعی معاملات کو ایشو بنایا گیا ہے جبکہ کشمیر جس سے ہماری تقدیر وابستہ ہے کسی نے اسے ایشو نہ بنایا۔عوام پر جو بے حسی طاری ہے اگر اسی طرح بڑھتی رہی تو ہم اہل کشمیر سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمہ وقت کشمیریوں کو اس بات کو یقین دلایا جائے کہ پاکستان کے عوام دامے درمے سخنے قدمے تمہارے ساتھ ہیں۔اہل کشمیر کے لیے نہایت ضروری ہے۔کہ وہ اپنی صفوں میں نظریاتی اور فکری ہم آہنگی پیدا کریں۔وہ یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں سے جب بھی ہٹ کر کوئی بات کی جائے گی تقسیم کشمیر کا خطرہ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔بھارت کے لیے اگر کوئی بات قابل ہو سکتی ہے تو وہ تقسیم کشمیر ہی ہے۔ جہاں تک تقسیم کشمیر کی بات ہے ممکن ہے بھارت کو اس کے جواز میں یہ دلیل اپنے اوپر بھی لاگو کرنی پڑے گی جہاں سولہ کروڑ مسلمان ہیں۔پھر ان کے لیے بھی کئی خطہ زمین الگ کرنا ہوگا پھر وہ تقسیم عمل میں آئی گی جو یوگوسلاویہ میں سامنے آئی۔پھر یہ کوئی نظریہ تو نہ ہوگا۔پھر تو بھارت سے پوچھا جائے گا کہ اگر چند لاکھ ڈوگرے مسلمانوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے تو سولہ کروڑ مسلمان بھارت کے ہندوؤں کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟۔اگر لاکھوں ہندو پاکستان میں عزت و آبرو کے ساتھ رہ سکتے ہیں تو ڈوگرے کیوں نہیں رہ سکتے۔میرے خیال میں تو ایک دن بھارت کو مٹ ہی جانا ہے۔کشمیر آزاد ہو جائے اِدھر خالصتان بن جائے گا۔تو ڈوگرے کہاں جائیں گے۔یہ تو ان کے ساتھ بہت ظلم ہوگا۔کہ وہ بھارت سے بھی کٹ جائیں گے اور کشمیر سے بھی اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔اس لیے ڈوگروں کو چاہیے کہ وہ کشمیر کی جدوجہد آزادی میں بھرپور حصہ لیں۔

ایک سوال یہ بھی اُٹھایا جا سکتا ہے جب یو این او کی قراردادوں کے مطابق ہندوستان کشمیر سے نکل جائے تو پاکستان کے دوسرے صوبوں کی طرح وہ بھی ایک صوبہ ہوگا جو اپنے حقوق کے لیے تگ و دو شروع کر دے گا کشمیر کا ایک الگ مقام ہونا چاہیے جس سے وہ پاکستان سے تمام فائدے اُٹھا سکتا ہے کہ وہ جغرافیائی طور پر پاکستان کی گود میں ہے۔لیکن میرا خیال ہے وہ پاکستان کا صوبہ بن کر نہیں رہے گا۔نہ ہی یہ مناسب ہوگا بلکہ مناسب ہوگا کہ وہ پاکستان کی انتظامی خرابیوں سے بھی اس کا دامن محفوظ رہے گا۔اس کے سیاسی جغرافیائی اور معاشی وجود

کو ابھی تمام ضمانتیں مل جائیں گئیں۔ جن کی خاطر وہ آج تک جہاد کر رہے ہیں۔
پاکستان کی حکومتوں نے جس طرح کمزوری کا اظہار کیا ہے اور عوام نے خاصی حد تک بے حسی ظاہر کی ہے۔ اس سے تحریک آزادی کشمیر کو مطلوبہ قوت اور حوصلہ نہیں مل سکا۔ لیکن ان کی ہمت اور جرأت کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے کہ اس کے باوجود تحریک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم بھارت کی عسکری پالیسی میں تبدیلی کی وجہ سے ان کے شہروں میں حملوں سے شہری آبادی کو بے پناہ مشکلات کا سامنا ہے۔ بھارتی فوج ان حملوں کا بدلہ شہریوں سے لے رہی ہے۔ شہری آبادی کی برداشت کی حد ہوتی ہے۔ مجاہدین کو گوریلا اصولوں کے تحت شہروں کو چھوڑ کر باہر لڑنا ہوگا اور ہندوستانی فوج سے اس کی موجودگی کی قیمت وصول کرنا ہوگی۔ ہمیں ہندوستان کے واویلے کے بجائے مظلوم کشمیریوں کی دادرسی کرنی ہوگی۔ ہندوستان اگر یہ کہتا ہے کہ وہ کشمیر کو اس لیے آزاد نہیں کرسکتا کہ اس طرح تو وہ ٹوٹ جائے گا۔ تو آکر ہندوستان کے اتحاد کی رکھوالی کشمیریوں کی عزت و خون سے کیوں؟ آخر کیسی منطق ہے کہ ہم تمہیں آزاد اس لیے نہیں کرتے اس طرح ہم خود ٹوٹ جائیں گے۔ ہندوستان ٹوٹتا ہے تو اسے ٹوٹنے دو۔ کل تو وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کیے تو ہندوستان ٹوٹ جائے گا۔ تو کیا یہ مطالبہ بھی ہم مان لیں۔

## ہماری پالیسی کیا ہو

کشمیر کے لیے ہماری حمایت ہر کمزوری اور عیب سے پاک ہونی چاہیے اس خطرے سے بے نیاز ہو کر بھارت ہم پر حملہ کرسکتا ہے اور ہمارے خلاف جنگ بھی چھیڑ سکتا ہے۔ بھارت کشمیر میں اتنی فوج رکھ کر کہیں پر بھی حملے کی پوزیشن میں نہیں۔ لیکن اگر وہ ایسا کرنا بھی چاہیں تو ہماری افواج اس سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہمیں اس جنگ کو طول دینا ہوگا۔ جب کہ بھارت کی کوشش ہوگی وہ مختصر ترین مدت میں ہمیں واضح شکست دے یہ جو بھارت کے لیے ہرگز ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمیں کسی مفروضے کی بنا پر نیوکلیئر جنگ نہیں چاہیے اس کے بجائے اپنے جوانوں کو تیار کرنا ہوگا۔ ہم جو معاشی مفادات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہماری قومی سوچ محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمیں معاملات کو گروہی اور سیاسی عینک سے دیکھے کشمیر کی آزادی کا دفاع ہم سب بشمول افواج پاکستان کی مشترکہ ذمہ داری ہے اخلاقی قانونی جغرافیائی اور تاریخی ہر پہلو سے کشمیر کی آزادی ہم سب کی ذمہ داری ہے افواج پاکستان اس معاملے میں اگر حساس ہیں تو یہ فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے ہندوستان تو کسی اخلاقی اور قانونی جواز کے بغیر کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے۔ ہمارے پاس تو ایسی ہزار ہا وجوہ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کشمیر پاکستان کا جز ورلاینفک ہے۔
پاکستان کی حکومت اگر اس معاملے میں بے حسی یا لاپرواہی کا مظاہر کرے تو ہمیں پاکستان کے شہروں کو خصوصی طور پر اور پورے پاکستان بالعموم جگانا ہوگا۔ بڑے بڑے شہر اگر کشمیر کے مسئلے پر پوری طرح جاگ اُٹھیں اپنے کشمیری بھائیوں کا ساتھ دینے اور جینے مرنے کے لیے تیار ہوگئے تو کسی حکومت کے لیے بھی لاپرواہی سے کام لینا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہمیں ان لوگوں خصوصاً شہروں کے عوام کو بتانا ہوگی کہ پاکستان کی بقا کشمیری

آزادی پر منحصر ہے۔ جو ترقی پسند ہیں اور "سٹیٹس کو" کے حامی ہیں۔

یہ نہایت خوش آئندہ بات ہے کہ پاکستان کے نوجوان میں ایک بڑی تعداد ابھر رہی ہے۔ جو مغربی استعماریت کے سخت خلاف ہے۔ یہ ٹھیک ہے مغرب کی قوت اور ٹیکنالوجی ہم سے بہتر ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ایک چیز ہمیں سرخرو کرسکتی ہے اور وہ اپنے عقیدے سے ہماری وابستگی ہے۔ ہم اپنے دین کی خاطر جان دے سکتے ہیں۔ جو مغرب نہیں دے سکتا یہ جان دینے کی صلاحیت ہماری اصل قوت اور بچاؤ کا واحد راستہ ہے۔ جو لوگ مسلمان ہو کر سیکولر ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ انہیں بوسنیا کے حالات سے عبرت لینی چاہیے۔ کشمیر کے مسئلے پر ہمیں چاہیے کہ اہل پاکستان متحد ہو جائیں۔ ایسا ہوگا تو جنوبی ایشیاء کے تمام مسلمان ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ جن میں پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش اور ہندوستان بھی شامل ہے۔ پوری امت بھی متحد ہو کر ہماری پشت پناہی پر آسکتی ہے لیکن پہلے ہم خود تو متحد ہوں۔

# مسئلہ کشمیر کی چابی افغانستان میں

## (روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، 05-02-2008، بروز منگل)

مسئلہ کشمیر ایک دائمی سچائی ہے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ دشمن اس لازوال تحریک کو ناکام کرنے کی کتنی ہی کوششیں کر لے، یہ کبھی ناکام نہیں ہوگی۔ ایک شیطانی قوت نے موقعے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کشمیری مسلمانوں کے عقیدے، تہذیب و ثقافت، وسائل اور سرزمین پر قبضہ کر لیا لیکن ان کی روحوں پر کوئی قبضہ نہیں کر سکا۔ ہندوستان گزشتہ ساٹھ برس سے مسلسل کشمیری مسلمانوں کو اپنے رنگ میں ڈھالنے کی شیطانی چالیں چلتا آیا ہے، جبر و تشدد کے تمام حربے اپنائے، مگر کامیابی نہیں ہو سکی۔ شیطان اور اس کے حامی جہاد کے ہمیشہ سخت خلاف رہے ہیں۔ آج بھی جہاں جہاں جہاد ہو رہا ہے شیطان اس کے خلاف سرگرم ہے۔ کشمیر بھی شیطان کا خاص نشانہ ہے اس لیے کہ یہاں کشمیری قوم اپنی آزادی کے لیے جہاد کر رہی ہے۔ حالانکہ کشمیر کا جہاد بہت محدود اور دفاعی نوعیت رکھتا ہے اور خود مغرب کے لوگ جانتے ہیں اس کا مقصد کشور کشائی یا ہوس اقتدار نہیں، بلکہ محض آزادی حاصل کرنا ہے۔

کشمیر کی آزادی کی تحریک کو افغانستان کے جہاد سے مہمیز ملی تھی۔ افسوس افغانستان کے جہاد کے فوائد بڑی حد تک گنوا دیے گئے۔ کچھ ہم نے گنوایا اور کچھ افغانستان کے مجاہد لیڈروں نے کھو دیا جن کی فکر جہادی نہ تھی اور یہ معاملات وہاں سے ہی بگڑنے لگے تھے۔ پاکستان کو اس موقعے پر جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس نے وہ ادا نہ کیا، نائن الیون کے بعد تو اس نے سراسر منفی کردار ادا کیا حالانکہ پاکستان عالم اسلام کی سب سے بڑی قوت تھی اور اس کے جہادی اثرات اور اس کی فکر بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی مگر نائن الیون کے ڈرامے کے ذریعے اسے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ نائن الیون سے پہلے ہی جہاد کو مٹانے کا سارا اہتمام کر لیا گیا تھا۔

اب یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ دشمن نے اسلام اور مسلمانوں پر حملے کے لیے یہ سازش تیار کی تھی۔ میں کہتا رہا ہوں نائن الیون تو بہانہ ہے، افغانستان ٹھکانہ اور پاکستان نشانہ ہے۔ یہ سچائی اب بالکل سامنے آگئی ہے۔ اس موقعے پر پاکستان کے حکمرانوں سے بالخصوص اور عالم اسلام کے حکمرانوں سے بالعموم یہ تاریخی غلطی ہوئی کہ انہوں نے ایک جھوٹی چال میں آکر دنیا کو ظلم سے بچانے والی قوت (جہاد) کو برا کہنا شروع کر دیا۔ جہاد کو دہشت گردی سے منسوب کرنے سے بڑا جھوٹ نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ کشمیر کے دو پہلو ہماری خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ پہلا یہ کہ پاکستان نے کشمیری عوام کی سیاسی اور اخلاقی حمایت ختم کر کے ان کو حالات کے سپرد کر دیا ہے اور دوسرا لائق توجہ پہلو مقبوضہ کشمیر کے اندر قیادت کی فکر اور عمل ہے۔ ایک دو لیڈروں کو چھوڑ کر کوئی بھی صحیح سمت میں آگے نہیں بڑھ رہا بلکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زمانے کی چال کے مطابق سفر کیا جائے جو انتہائی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی نقطہ نظر ہے۔

یہ ہمارے قومی کردار کے منافی بات ہے، ایسی باتیں کی جا رہی ہیں جو تحریک کے نصب العین کے منافی ہیں۔ مثلاً 1953ء سے پہلے کی پوزیشن پر جانے کا مطالبہ قطعاً بے معنی ہے۔ اس کا مطلب ہے بھارتی آئین کے آرٹیکل 370 کے تحت کشمیر کو خصوصی سٹیٹس دیا گیا تھا جسے بھارت کی اہم پارٹی بی جے پی قبول ہی نہیں کرتی۔ 1953ء کی پوزیشن سے ہمیں کیا ملے گا؟ شیخ عبداللہ کو تو اس کے بعد طویل عمر جیلوں میں گزارتی پڑی تھی۔

موجودہ صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے تو کشمیر کی اندرونی اور بیرونی قیادت اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے اور اس حقیقت کا ادراک کر کے کہ انہوں نے کون سی پوزیشن اختیار کر رکھی ہے اور اس سے تحریک کو فائدہ ہے یا نقصان؟ ایسا نہ ہو وقتی فائدے کے لیے بصیرت کے منافی فیصلہ کر بیٹھیں اور نا قابل تلافی نقصان ہو جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کے ہاتھ کھینچ لینے سے کچھ بددلی پیدا ہوئی لیکن اصل بات یہ ہے کہ بھارت پر تحریک کا دباؤ قائم ہے۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی ایک تہائی افواج مقبوضہ کشمیر میں تعینات ہیں ان میں سے ابھی تک ایک فوجی بھی واپس نہیں بلایا گیا، اس کے برعکس بھارت کے یوم جمہوریہ (26 جنوری) پر مزید تیس ہزار فوجی مقبوضہ کشمیر بھجوائے گئے ہیں حالانکہ بھارت کے لیے بہت ضروری تھا کہ وہ اپنا عسکریت پر قابو پا لینے کا دعویٰ سچا ثابت کرنے کے لیے چند ایک فوجی ضرور واپس بلاتا لیکن تحریک کی قوت نے بھارت کو مجبور کر رکھا ہے کہ وہ اپنی فوج نہ نکالے۔

اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کشمیری عوام کے جذبہ آزادی میں پہلے سے زیادہ شدت آگئی ہے اور تحریک پھل پھول رہی ہے۔ بلاشبہ مجاہدین کی کارروائیوں میں کمی آئی ہے لیکن ضعف تعداد میں آیا ہے کارکردگی میں نہیں اور ہدف کے حصول میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اہداف کے انتخاب میں غفلت کرنی بھی نہیں چاہیے۔ عام کشمیریوں کی جان و مال کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ رہا مجاہدین کا جانی نقصان، تو جان دینا ہر مجاہد کی دلی آرزو ہوتی ہے۔

کشمیری قوم اور قیادت سے آج میں چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں تا کہ اس مرحلے پر تحریک کو نقصان پہنچانے سے بچایا جا سکے۔

ا۔ کشمیری قوم اور قیادت کو میرا یہ پیغام ہے کہ وہ پاکستانی حکمرانوں کے گناہ پاکستانی قوم پر نہ ڈالیں۔ افواج پاکستان کو جب بھی موقع دیا گیا، آزادی کشمیر کے لیے بھرپور کردار ادا کرنے میں کوئی دقیقہ و گزاشت نہیں کریں گی۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستانی قوم خود آزاد نہیں تو وہ آپ کو کس طرح آزادی دلائے گی؟ لیکن کشمیر کی محبت سچ مچ اہل پاکستان کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتی ہے۔ امریکہ جب

تک افغانستان سے نہیں جاتا صرف افغانستان، پاکستان اور کشمیر ہی نہیں بھارت اور چین بھی متاثر ہوں گے۔ امریکہ نے یہاں سے بالآخر جانا ہی جانا ہے اور اس کے بعد ایسے راستے کھلیں گے جو آزادی اور خوش حالی سے بھرے پڑے ہیں۔

۲۔ یہ وقت حوصلہ ہارنے کا نہیں بلکہ حالات موزوں ہونے کا انتظار کرنے اور استقامت دکھانے کا ہے۔ نائن الیون کا واقعہ نہ ہوتا تو اب تک مسئلہ کشمیر حل ہو چکا ہوتا بلکہ اگر پاکستان میں پرویز مشرف جیسا حکمران ہی نہ ہوتا جن کو بھارت کی دوستی بہت عزیز ہے، تو بھی صورتحال میں انقلاب آ چکا ہوتا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ امریکہ افغانستان میں مزید دو برس تک رہے گا۔ 2009ء کے آخر میں امریکہ کی واپسی ہو گی اور اس وقت بہت بڑے اور مثبت واقعات رونما ہوں گے۔

۳۔ کشمیری قیادت میں اتحاد کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے جو خوش آئند بات ہے لیکن سید علی گیلانی جنہوں نے پہاڑ جیسی عزیمت واستقامت دکھائی، ان کے بغیر اور یاسین ملک کے باہر رہنے سے اتحاد اہمیت حاصل نہیں کر سکتا۔

اتحاد فضا میں نہیں بنتے، یہ بر سر زمین رونما ہوتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے اپنا مفاد چھوڑنا پڑتا ہے اور اتحاد کسی مرکزی نقطے اور اصول پر قائم ہوتا ہے۔ اتحاد کا پہلا اصول یہ ہونا چاہیے کہ حق خود ارادیت کے مطالبے پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بھارت کی فوج کشمیر چھوڑ نہیں دیتی۔ دوسرا یہ اصول سب کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ کشمیر کے حصے بخرے نہیں کیے جائیں گے۔ ہر قیمت پر کشمیر کی وحدت وسالمیت برقرار رکھی جائے گی۔ یہ دو اصول بنیاد بنا لیے جائیں باقی معاملات بعد میں طے ہوتے رہیں گے۔

۴۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کشمیر کی آزادی کی چابی افغانستان میں ہے، یعنی جب تک امریکہ افغانستان سے شکست کھا کر نہیں جاتا، اس وقت تک کشمیر آزاد نہیں ہوگا۔ کشمیر کا جہاد افغانستان کی کامیابی سے شروع ہوا تھا اور اب کشمیر کی تحریک کو ضعف پہنچا ہے تو اس کا اثر بھی کشمیر کی تحریک آزادی پر پڑا ہے لیکن مسئلے کا حل آج بھی اس کی کوکھ میں موجود ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ امریکہ افغانستان کی جنگ جیت سکتا ہے تو ایک پیشہ ور سپاہی کی حیثیت سے اور اللہ تعالیٰ نے جو سمجھ بوجھ مجھے دی ہے، اس کی بنیاد پر پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ امریکہ یہ جنگ نہیں جیت سکتا۔

کشمیری قیادت، عوام اور مجاہدین اس صورتحال کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ امریکیوں نے عراق سے واپسی کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا ہے، مگر انہیں خوش فہمی ہے کہ وہ عراق کی ناکام لڑائی افغانستان میں جیت سکتے ہیں لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ عالمی استعمار کا آئندہ کی تاریخ افغانستان میں لکھنے کا عزم خاک میں مل کر رہے گا۔ افغانستان میں امریکہ کو جہادی فکر اور سوچ کے ساتھ کشمکش درپیش ہے، اس لیے اسے ختم ہونے میں کچھ دیر لگے گی، لیکن جب بھی یہ ختم ہو گی، امریکہ کو وہی دھچکا لگے گا جو روس کو یہاں لگا تھا۔ ان شاء اللہ یہی دھچکا کشمیر کی آزادی کا پیش خیمہ ہوگا۔

# مشرف کی اقتدار سے علیحدگی تک ہمارا احتجاج جاری رہے گا اور مطالبے سے دستبردار نہیں ہونگے، جنرل حمید گل

تینوں مسلح افواج کے سابق سروسز چیفس، ایئر مارشل، ایڈمرل، کور کمانڈروں، سینئر جرنیلوں اور ریٹائرڈ جوانوں کا تیسرا اہم اجلاس آج 5 فروری کو راولپنڈی میں طلب کرلیا گیا ہے۔ جس کی صدارت ائیر چیف مارشل (ر) نور خان کریں گے۔ اجلاس کے اختتام پر سابقہ فوجی سربراہان، کور کمانڈرز، سینئر ریٹائرڈ جرنیل کشمیری عوام سے یکجہتی کے اظہار کے لیے انسانی ہاتھوں کی زنجیر بنائیں گے اور اس احتجاجی مظاہرے کے دوران وہ صدر پرویز مشرف کی پالیسیوں کے خلاف بھی آواز بلند کریں گے اور ان سے مستعفی ہونے کے مطالبے کو پھر دوہرایا جائے گا۔ سابقہ فوجیوں کی تنظیم کا احتجاجی مرحلہ تیسرے دور میں داخل ہوگیا ہے۔

اس سلسلے میں این این آئی سے خصوصی گفتگو کرتے ہوئے آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل ریٹائرڈ حمید گل نے کہا کہ سابقہ فوجی افسران اور جوانوں کی آج 5 فروری کو یوم کشمیر پر کشمیری عوام سے اظہار یکجہتی کے لیے تنظیم کا خصوصی اجلاس منگل کو دوپہر 2 بجے راولپنڈی مال روڈ پر مقامی ہوٹل میں طلب کرلیا گیا ہے اور اس اہم اجلاس کی صدارت قومی ہیرو ائیر مارشل (ر) نور خان کریں گے اور اجلاس میں سابق چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ، جنرل ریٹائرڈ فیض علی چشتی، جنرل ریٹائرڈ جمشید گلزار کیانی، جنرل ریٹائرڈ عبدالقیوم، جنرل ریٹائر علی قلی خان، آزاد کشمیر کے سابق صدر جنرل ریٹائر محمد انور خان سمیت تینوں مسلح افواج کے سینئر جرنیلوں، کمانڈروں اور جوانوں کی ایک بڑی تعداد شرکت کرے گی اور سابقہ فوجیوں کے اس تیسرے اہم اجلاس کے دعوت نامے جاری کردیئے گئے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں جنرل ریٹائرڈ حمید گل نے کہا کہ اس خصوصی اجلاس کی صدارت ائیر چیف مارشل ریٹائرڈ نور خان کریں گے اور سابقہ فوجی قیادت اس اجلاس میں مسئلہ کشمیر کے حوالے سے اہم خطاب کرے گی اور کشمیر کاز کو نقصان پہنچانے والے حکمرانوں کی پالیسیوں پر اپنا موقف پیش کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ سابقہ فوجی اپنے اصولی موقف پر قائم ہیں کہ صدر مشرف ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد میں فوری طور پر مستعفی ہو جائیں اور ہمارا احتجاج اس وقت تک جاری رہے گا جب تک صدر مشرف اقتدار سے الگ نہیں ہوتے اور ہماری تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

انہوں نے کہا کہ صدر مشرف سے مستعفی ہونے کے مطالبے سے سابقہ فوجی دستبردار نہیں ہوں گے اور

یہ مطالبہ ملک اور قوم کے وسیع مفاد میں ہم لوگ کر رہے ہیں اور یہ آواز ملک کے 16 کروڑ عوام کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اجلاس کے اختتام پر سابقہ عسکری قیادت، افسران اور جوان کشمیریوں کے ساتھ یکجہتی کے لیے انسانی ہاتھوں کی زنجیر بھی بنائیں گے اور یہ اجلاس تین گھنٹے تک جاری رہے گا جس میں سابقہ فوجی افسران کشمیر کی آزادی کے حوالے سے اہم خطاب کریں گے اور عوام کو بھی آشکار کریں گے۔

# خودمختار کشمیر

# ایک ہلاکت آفریں سراب

خودمختار کشمیر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ابہام وشکوک پابات ہوئی۔ امکانات اور ناممکنات بات ہوئی۔ اس ضمن میں کچھ ایسی تجاویز بار بار سامنے آرہی ہیں کہ جن مضمرات وعواقب کے بارے میں جو تجاویز پیش کرنے والوں کو بھی بہت کم علم ہے۔ بہت بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع کے مختلف تکنیکی معاملات پر بات کریں۔ میرے خیال میں دونوں طرف سے شکوک وشبہات کے اظہار اور وضاحت سے اس مسئلے کے حل میں مدد ملے گی۔ قومی معاملات جب فیصلہ کن مرحلے پر ہوں۔ تو اس نوعیت کی بحثوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ قابل عمل صورت حال سامنے آئے اور پوری قوم کوئی متفقہ لائحہ عمل تیار کر سکے۔ افغانستان میں جب معاملات آخری مراحل میں تھے تو یہ بحث عام تھی کہ عبوری حکومت کیسی ہو۔ نظام حکومت کیسے چلایا جائے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ پانے کا نتیجہ یہ نکلا جس سے ہم آج افغانستان کو دوچار دیکھ رہے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ صورت حال پیش آئی تھی۔ نصب العین پر فیصلہ نہ ہو پایا تھا اور نو برس تک ہم آئین نہ بنا سکے۔ افغانستان میں ہم عبوری حکومت کو پرامن انتقال اقتدار پر اصرار کرتے رہے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا کیونکہ اس میں ایسے عناصر داخل ہو گئے جو مسئلے کو اُلجھا کر فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم اسی مرحلے پر کشمیر کے بارے میں اچھی طرح بحث کر کے شکوک وابہام کو ختم کر دیں۔

سب سے پہلے تو یہ واضح کر دوں کہ میں تھرڈ آپشن کے خلاف نہیں لیکن تھرڈ آپشن کے نتیجے میں جو ممکنہ مشکلات اور خرابیاں سامنے آسکتی ہیں میں چاہتا ہوں پہلے اس کو بے لاگ تجزیہ ہو۔ میں ہر انسان کی آزادی کے حق میں ہوں۔ یہ ناقابل تنسیخ حق ہے جسے چھینا یا غصب نہیں کیا جا سکتا۔ قومیں جب ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو ساتھ چھوڑ جاتی ہیں حالانکہ بنگلہ دیش کے پاس کوئی دوسرا آپشن بھی نہ تھا۔ لیکن جب وہ ہم سے ناراض ہو گئے تو ساتھ چھوڑ کے چلے گئے۔ اسی طرح سکھ ہندوستان میں آزادی مانگ رہے ہیں۔ بھارت میں آزادی کی بارہ تیرہ دوسری تحریکیں چل رہی ہیں حالانکہ ان کے پاس ملک کے شہری ہونے کا حق موجود ہے لیکن وہ اس الحاق سے خوش نہیں۔ تو ان کو الگ ہونے کا حق بھی حاصل ہے۔

## خودمختاری کے مفروضے

۱۔ خودمختار کشمیر کے حق میں عموماً یہ دلیل بڑے شدومد سے دی جاتی ہے کہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ

کشمیر کا الحاق قبول نہیں کرے گا۔

ب۔ دوسرا نقطہ یہ ہے کہ پاکستان کے اندر لوگوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ اور جہاں استحصال ہو رہا ہو اس کے نتیجے نسلی اور لسانی نزاع پیدا ہوتا ہے۔ اس حالت میں کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کیوں کرے۔

ج۔ تیسرا وہ کہتے ہیں پاکستان اپنے تخلیق کے مقاصد میں ناکام ہو گیا۔ جب یہ اس خواب اور آرزو کے مطابق نہیں چل رہا جس کے لیے قائم کیا گیا تھا تو کشمیریوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کی کامیابی کے بعد اس سے الحاق کریں۔

میرے خیال میں سب سے پہلے تو یہ مفروضہ درست نہیں کہ ہندوستان کشمیر کے پاکستان سے الحاق کو قبول نہیں کرے گا۔ یہ بات تو قبل از وقت ہے کیونکہ آج تک ہندوستان نے اٹوٹ انگ کے علاوہ کوئی بات نہیں کہی۔ وہ ابھی تک ہندوستان کے آئین کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری کی بات کرتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر انہوں نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وہ کشمیر کے الحاق کو نہیں مانے گا۔ نہ صرف اپنے اندر دلیل کا وزن نہیں رکھتی بلکہ عملاً ابھی تک ایک تصور سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں۔ اب تک ہمارے سامنے جو نظریات آئے ہیں۔ ان میں کرن سنگھ نے پانچ الگ الگ علاقوں کی بات کی ہے۔ Owen Dixon نے کشمیر کی تقسیم دریائے چناب کی لائن پر کرنے کی تجویز دی ہے۔ مگر ہندوستانی حکومت نے ابھی تک اپنا موقف نہیں بدلا۔ کسی منصوبے کے بارے میں حامی نہیں بھری تو نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ بھارت الحاق پاکستان کا مخالف اور خود مختار کشمیر کا حامی ہے۔ اس کے دانشوروں نے زیادہ سے زیادہ یہ بات کی کشمیر تقسیم ہو سکتا ہے۔ خود مختار کشمیر کی حمایت یا مخالفت کی تو بات ہی نہیں ہوئی۔ تقسیم کے ضمن میں بھی دو آرا ہیں جس کی زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

البتہ پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ہم کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنا پسند کریں گے۔ بجائے اس کے ہم خود مختاری کی حمایت کریں، کیونکہ اس سے ہندوستان کے اندر کی خود مختاری کی بیسیوں تحریکوں کو شہ ملے گی۔ ہماری آزادی اور خود مختاری خطرے میں پڑ جائے گی۔ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ میر قاسم نے اپنی سرگزشت میں اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ اندرا گاندھی کے زمانے میں ہماری اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے بھارت نے مشرقی پاکستان پر فوج کشی کر کے بنگلہ دیش کو بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ لیکن آج بھارت میں کہا جا رہا ہے اندرا گاندھی نے ایسا کر کے شدید غلطی کی۔ امرتا بازار پتریکا میں نریندر چوہدری نے اپنے مضمون میں لکھا کہ یہ غلط کام کیا گیا۔ اس سے خود ہندوستان کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بھی کہا تھا کہ ”جس طرح تم نے بنگلہ دیش بنایا ہے۔ بھارت میں ہر جھاڑی کے پیچھے بنگلہ دیش چھپا ہے۔“ یعنی بنگلہ دیش جیسے خود مختار ملک بن سکتے ہیں۔ وہ وقت گزر گیا۔ پاکستان نے بنگلہ دیش کو قبول کیا لیکن اسلام سے اس کا لگاؤ ختم نہیں کیا جا سکا۔ اسلام کی کشمکش آج بھی وہاں جاری ہے۔ دینی جماعتوں نے وہاں پاکستان کی نسبت زیادہ سیٹس لی ہیں۔

## کمزور کشمیر کی بقاء کا مسئلہ

تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندو مسلم دشمنی کی وجہ سے جب ہندوستان میں مرکز کمزور ہوا تو مسلمانوں کی حکومت میں لارڈ کلائیو کو ہندوستان آنے کا موقع ملا اور پھر انگریز ہندوستان پر چھا گئے۔ اب کوئی کمزور ریاست اس خطے میں وجود میں آتی ہے تو وہ بھی اپنے دفاع کے لیے غیروں کی محتاج ہوگی۔ اس کا نتیجہ کسی نئے کلائیو (کلنٹن) کے آنے کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے۔ امریکہ سے چین کی کشمکش کی صورت میں تو امریکہ کے اس علاقے میں داخلے کے وسیع امکانات ہیں۔

رہا سوال استحصال تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ خود مختار کشمیر کے اندر استحصال نہیں ہوگا۔؟ جبکہ ہم دیکھتے ہیں ہندوستان کی اتنی بڑی جمہوریت کے اندر بھی استحصال ہو رہا ہے۔ ہر طبقے قوم اور علاقے کا استحصال ہو رہا ہے۔ حالانکہ ہندوستان سیکولر ریاست ہونے کا دعویدار ہے۔ ہمارے ہاں بھی استحصال ہو رہا ہے جس کا نتیجہ ہم نے بھگتا ہے۔ ہمارے بنگالی اور مہاجر پیش پیش تھے، استحصال سے ہی مایوس ہوئے۔ ان کو پاکستان سے بغض نہیں بلکہ استحصال سے شکایت پیدا ہوئی۔ بنگالی کا استحصالی نظام سے ہی بغض تھا لیکن اس بات کی کون گارنٹی دے گا کہ کشمیر خود مختار ہو جائے تو اس میں استحصال نہیں ہوگا اور بلتیوں لداخیوں ڈوگروں گجروں اور کشمیریوں کے درمیان حقوق و اختیارات کو چپقلش نہیں ہوگی۔

یہ بھی کہا جا رہا کشمیر کو سوئٹزر لینڈ بنایا جا سکتا ہے۔ مگر لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ سوئٹزر لینڈ 1815ء میں ایک طویل جنگ کے بعد بنا اور خطے کی سب طاقتوں نے اس کی غیر جانبداری کی گارنٹی دی تھی۔ اس سے وہاں طاقت کا توازن پیدا ہوا اب اگر ہم سوئٹزر لینڈ کے ماڈل کو سامنے رکھیں تو اس خطے میں طاقت کا توازن برابر نہیں۔ ایک طرف چین ہے جو ابھرتی ہوئی سپر طاقت ہے عام اندازہ ہے کہ شائد 2025 تک دنیا کی سپر طاقت بن جائے گا۔ دوسری طرف ہندوستان اپنی بڑائی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ تیسری طرف پاکستان ہے جو کشمیر کو خارج کر کے اور بھی کمزور ہو جائے گا۔ اس طرح طاقت کا توازن کہاں سے آئے گا۔

سوئٹزر لینڈ کی طرز کی گارنٹی دیتی ہے تو پھر چین کو اس میں شامل کرنا پڑے گا۔ ورنہ معاملہ طے نہیں ہوگا۔ کیونکہ چین کے دروازے پر ایک ریاست کا قیام اسے اعتماد میں لیے بغیر ممکن نہیں۔ کیا اس بارے میں سوچ لیا گیا ہے؟ کیا چین ایسی صورتحال کو قبول کر لے گا۔ مانا کشمیر کی اپنی کرنسی اور خارجہ پالیسی ہوگی لیکن اس کے دفاع کا کیا بنے گا؟

## ٹرسٹی شپ کی تجویز

ایک عجیب و غریب تجویز بھی آئی ہے کہ کشمیر کو پندرہ برس کے لیے یو این کی ٹرسٹی شپ میں دے دیا جائے۔ یہ تو بہت ہی مضحکہ خیز بات ہے اور ناقابل عمل سوچ ہے۔ دنیا میں اب تک ایک چھوٹے ملک نمیبیا کو کیا فائدہ ملا ہے۔ یہ بات تو اور بھی ناقابل قبول ہے کہ سپرداری یا ٹرسٹی شپ کا یہ ردعمل پندرہ سال کی طویل مدت پر محیط ہے۔ آخر اس کی حکمت کیا ہے۔ کیا پندرہ برس تک کشمیریوں کو حق خود ارادیت کے لیے انتظار کروانا پڑے گا۔

ابھی ان کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہوئی کہ وہ رائے کا اظہار کرسکیں میرے خیال میں یہ ایک ایسا بے ہودہ تصور ہے۔ اس پر بات کرنا بھی نامعقویت ہے۔ جولوگ اقوام متحدہ کی حیثیت جانتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اقوام متحدہ اور امریکہ میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے اس پروگرام کا مطلب یہ ہے کہ یو این او کی آڑ میں امریکہ کو وہاں داخل کردیا جائے۔ اس لیے میں اس تجویز کو کشمیر پر امریکہ کے قبضے کی چال سمجھتا ہوں۔ اس کے اثرات، نتائج اور مضمرات کشمیر، پاکستان اور ہمارے پڑوسی چین کے لیے نہایت خطرناک ہوں گے۔ یو این او کے ضمن میں صرف ایک صورت قابل قبول ہوسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ عارضی طور پر وہاں اپنی ایڈمنسٹریشن قائم کرے مگر صرف اتنی دیر تک کہ جب تک اس کے زیر اہتمام استصواب رائے کا انتظام ہو جائے اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ اس کی اجازت اقوام متحدہ کی قراردادوں میں بھی موجود ہے۔

## بفر ریاست کا تصور

اگر کشمیر کو اس وقت بفر ریاست بنانے کی کوشش کی جائے تو یہ سوال جواب طلب رہتا ہے کہ پیا کشمیر، بھارت، چین اور پاکستان کے درمیان ایک بفر ریاست بن کر رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بفر ریاستوں کا حال آپ دیکھ رہے ہیں۔ افغانستان کا منظر تو بالکل سامنے ہے۔ اگر کوئی نئی چپقلش جنم لیتی ہے تو اس صورت میں کشمیر کو دفاع کون مہیا کرے گا۔ بالخصوص اگر چین سپر طاقت بن جاتا ہے تو کشمیر کے خطے کو اپنے دفاع کے خطے سے باہر کسی طاقت کی جانب دیکھنا ہوگا۔ باہر سے دفاع کی گارنٹی امریکہ ہی سے مل سکتی ہے۔ لیکن کیا یہ سوچ لیا گیا ہے کہ امریکہ کا یہاں آنا اس خطے کے ممالک کے لیے قابل قبول ہوگا......؟ کشمیر اور لداخ سے چین کا نہایت حساس علاقہ (Soft Under Belly) شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے افغانستان کے شمال میں دریائے آمو سے روس کا حساس اور نازک علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ چین کا نیوکلیئر ٹیسٹ کا علاقہ (لب نور) اس کے بالکل نزدیک ہے۔ چین کے سپیس لانچنگ پروگرام کو مانیٹرنگ بھی لداخ سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے بین الاقوامی طاقتوں کے کھلاڑی اس علاقے میں گہری دلچسپی ویسے تو نہیں رکھتے۔

اگر خود مختار کشمیر لداخ میں امریکہ کو اڈہ بنانے کی اجازت دیتا ہے تو لازماً اسے نئی محاذ آرائی کا حصہ بننا ہوگا۔ چین کیوں ایسی صورت حال کو قبول کرے گا خصوصاً اس حال میں کہ دونوں علاقوں کے درمیان ابھی تک حد بندی بھی نہیں ہوئی۔ یہاں چودہ ہزار فٹ بلند اکسائی چن کا علاقہ ہے جو لداخ سے جڑا ہوا ہے اور تبت کو سنکیا نگ سے ملاتا ہے۔ تو کیا چین اپنے دو حساس علاقوں کے سنگم پر واقع کشمیر میں محاذ آرائی کو قبول کر لے گا۔؟ کیا اس کے مضمرات و نتائج پر بھی غور کر کیا گیا ہے؟

## اقوام متحدہ کی قراردادوں سے دست برداری

ہم سب خود مختار کشمیر کی بات کریں گے تو ہمیں یو این او کی قراردادوں سے ہٹ کر بات کرنی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ نیا ریزولوشن پیش کیا جائے گا کیونکہ پہلے ریزولوشن میں خود مختار کشمیر کا ذکر نہیں۔ ہندوستان نے آج تک رائے شماری کے حق کو تسلیم نہیں کیا۔ کجا ایک نیا مطالبہ پیش کر دیا جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان

پہلے اس حق کو تسلیم کرے جس کا اس نے وعدہ کیا ہے۔ آج اگر ہم یو این او کی موجودہ قرار داد پر خط تنسیخ کھینچ دیں اور ہندوستان سے کہیں کہ وہ نئی قرار داد لائے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہندوستان اس سلسلے میں ہمارے ساتھ دھوکہ نہیں کرے گا۔؟

ایسے حالات میں جب کہ پہلے ایسا ہو چکا ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے بارے میں عمومی طور پر فضا معاندانہ ہے۔ عالمی طاقتیں ہر جگہ نہیں نیچا دکھانا چاہتی ہیں۔ کشمیر پر موجودہ قرار دادوں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے۔ کہ یہ پرانی ہوگئی ہیں۔ تو نئے ریزولوشن کی گارنٹی کون دے گا؟ یہ وہی طاقتیں ہیں جنہوں نے ہمیں انسانی حقوق کمیشن میں جانے کے لیے کہا تھا لیکن جب ہم وہاں گئے تو ہماری حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا گیا۔ کیا ان کو کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں نظر نہیں آتیں۔؟ اس کے باوجود وہ صرف نظر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کی نیت درست نہیں۔ اور ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس چیز کی کیا ضمانت ہے کہ نئی قرار داد پیش ہو تو امریکہ لازماً اس کی حمایت کرے گا۔ ہندو اور یہودی لابیاں اپنے اثر و رسوخ سے امریکہ کو پھیر نہیں دیں گی۔ ہم اس امید پر گھڑا کیوں پھوڑ لیں کہ برسات آنے والی ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو سب کچھ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس وقت تو وہ کسی نئی قرار داد کی بات نہیں کرتے بلکہ انڈین یونین میں رہتے ہوئے بھارتی آئین کے مطابق کشمیر کی اسمبلی بنانے کے حق میں ہیں۔ بعض لوگوں کا مفروضہ ہے کہ اسمبلی بنے گی تو وہ انڈین یونین سے الگ ہونے کا فیصلہ دے دے گی۔ لیکن جب انڈین یونین کے اندر رہتے ہوئے الیکشن لڑیں گے تو ہندوستان یہ نہیں کہہ دے گا کہ مسئلہ تو طے ہو گیا۔ کیونکہ ابھی تک کشمیریوں کی خود مختاری کے لیے ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں پھوٹا۔ اس لیے یہ نہایت حساس اور خطرناک معاملہ ہے۔ اور بہت احتیاط سے اس سے نمٹنا چاہیے۔

جب آپ نئی سوچیں اور جہتیں نکالیں گے تو پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ کشمیر تقسیم نہیں ہوگا۔ کشمیر کی آزادی اور خود مختاری کی بات ہوگی۔ تو پھر ڈوگرے اور لداخی اس میں کیوں شامل ہوں۔؟ آزاد کشمیر جس کے تمام مفادات پاکستان سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ وہ کیوں مانے گا کہ پاکستان بھی یہ علاقہ چھوڑ دے۔ جبکہ شمالی علاقے پہلے ہی اپنی آئینی حیثیت مانگ رہے ہیں اور تحریک آزادی اس وقت جموں اور وادی کے کچھ علاقے تک محدود ہے۔ دوسرے علاقے اس سے متاثر نہیں۔ یہ تو سیدھی سیدھی تقسیم کی راہ ہے۔ اگر ہم کشمیر کی تقسیم کے لیے راضی ہیں تو اس سے کشمیر کو فائدہ ہوگا نہ پاکستان کو اور نہ تحریک آزادی کو نہ ہندوستان کو البتہ چین کو ہم ضرور ناراض کر لیں گے وہ پہلے ہی تبت اور ہانگ کانگ کا مسئلہ حل کر رہا ہے اسے ایک نئے مسئلے کا سامنا ہوگا۔ لہٰذا ہر ایسی بات تقسیم کشمیر کی بات سے نکلتی ہے۔ ہو اور جو یو این او کی قرار دادوں سے ہٹ کر ہو خطرے سے خالی نہیں۔

آج اگر ہندوستان ہم سے جنگ بھی لڑتا ہے تو ہمارے پاس اس کا اخلاقی جواز وہ یو این او کی قرار داد کی صورت میں موجود ہے۔ بین الاقوامی طاقتیں یہ کہہ سکتی ہیں کہ ہمارے پاس اس کے خلاف ایک اخلاقی جواز نہیں۔ اگر ہندوستان یو این اور ریزولوشن کو قبول نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ مردہ ہو چکا ہے۔ تو کشمیری نوجوان اپنے خون اور شہادتوں سے زندہ کیسے کیے ہوئے ہیں۔

## ''خودمختار کشمیر کا آئین''؟

اب آیئے ایک اور نکتے پر...... فرض کریں کشمیر آزاد ہو کر اور ایک خودمختار ریاست بن جاتا ہے۔ تو اس کا آئین کیا ہوگا۔ سیکولر ہوگا یا اسلامی؟ اگر سیکولر ہوگا تو بھارت سے الگ ہونے کا جواز کیا ہے۔ آپ تو الگ ہی اس بنیاد پر ہو رہے ہیں کہ تقسیم ہند کے فارمولے کے مطابق بھارت اور پاکستان دو الگ الگ ریاستیں دوقومی نظریے کے تحت وجود میں آئی تھیں اور مسلم اکثریت کے علاقوں کو پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ اسی اصول کے تحت کشمیر کو پاکستان کو حصہ بنا تھا یعنی بحیثیت مسلمان ریاست کے اسے پاکستان کا حصہ بننا تھا۔ ورنہ تو آزادی کی کوئی بنیاد ہی نہیں بنتی۔ لہٰذا اگر کشمیر کی آزادی کی کوئی بنیاد ہے تو وہ دوقومی نظریہ ہے جس کی رو ہمیں یہ کہنے کا حق ملا ہے۔ کہ یہ تقسیم ہند کے ایجنڈے کا ایک نامکمل باب ہے اس کا فیصلہ ابھی ہونا ہے اسے دوقومی نظریے کے فریم کے اندر ہندوستان سے الگ ہو کر اسلامی ریاست میں شامل ہونا ہوگا۔ اگر آپ سیکولر ریاست بنتے ہیں تو ہندوستان سے الگ ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ بالفرض آپ کشمیر کو آزاد کرنے کے بعد سیکولر بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا وہ مجاہدین جو اسلام کے نام پر جانیں قربان کررہے ہیں اسے قبول کرلیں گے۔؟ یا اگر آپ خودمختار کشمیر بنا کر اسے اسلام کا نام اور نظام دیتے ہیں تو کیا ڈوگرے اور پنڈت اسے قبول کرلیں گے۔؟

اب ہم اس دلیل پر بات کرتے ہیں کہ آیا پاکستان واقعی ناکام ہوگیا ہے؟

اس ضمن میں سب سے پہلے اس حقیقت کو جاننا ہوگا کہ یہ ایک نظریاتی ملک ہے۔ ریاست مدینہ کے بعد پہلی بار ایک اسلامی مملکت کا قیام ممکن ہوا۔ یہ نہ صرف پاکستان کے رہنے والوں بلکہ ہندوستان کے رہنے والوں مسلمانوں کی امیدوں کو مرکز تھا۔ کیونکہ اس کو بنانے میں ان لوگوں نے بھی حصہ لیا تھا جو آج اس کا حصہ نہیں ہیں۔ ان کو پتہ تھا کہ ہم اس کا حصہ نہیں بنیں گے لیکن وہ سب چاہتے تھے کہ پاکستان کی صورت میں ایک اسلامی ماڈل بن جائے گا۔ کشمیر کے مسلمانوں کا بھی پاکستان کی تشکیل میں حصہ تھا۔ پاکستان کے نام میں حرف ک کشمیر سے اس کے ناقابل تنسیخ رشتہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کشمیر کا تعلق بھی ایک نظریے سے ہے۔ نظریے کے لیے تجربہ گاہ کی ضرورت تھی۔ اس لیے پاکستان کا وجود میں آنا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی پہلی کڑی تھی۔ اس کے وجود میں آنے سے احیاء اسلام کی تحریکیں وجود میں آئیں اور یہ جو کشمیر کی جنگ آزادی لڑی جارہی ہے۔ اس کا تعلق بھی واضح طور پر نظریہ پاکستان سے ہی ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کے نظریے اور نظام کے درمیان تضاد کو حل نہیں کیا جاسکا۔ نظریہ موجود ہے۔ لوگوں کی خواہشات اس سے منسلک ہیں لیکن پاکستان کو اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہونے نہیں دیا گیا۔ اس طرح جغرافیائی کے ساتھ ساتھ ایک نظریاتی تکمیل نہیں ہوسکی۔ استحصالی گروہوں نے یہ تکمیل نہیں ہونے دی۔ لیکن یہ ناکامی نظریے کی نہیں بلکہ نظام کی ہے۔ جو انگریز کے دور سے تسلسل سے چلا آرہا ہے۔ اس نے ہم سب کو مایوس کردیا ہے۔ اسی وجہ سے پاکستان بھی مسائل سے دوچار ہے۔ اس تضاد کو ہم نے دور کرنا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم مصیبتوں سے دوچار ہیں لیکن جس وقت تک پاکستان قائم ہے اس وقت یہ امید قائم ہے کہ ہم مطلوبہ نظام

لے آئیں گے۔ جب تک اسلامی آئین موجود ہے۔ پاکستان کی بتدریج صحیح سمت کی طرف بڑھنے کی صلاحیت باقی رہے گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نظریہ پاکستان پر مبنی نظام کا عملی طور پر نفاذ باقی ہے مگر اس کے لیے کشمکش جاری ہے۔ لہٰذا یہ کہہ دینا کہ پاکستان ناکام ہو گیا۔ درست نہیں۔ اس کے بجائے یہ کہنا درست ہو گا کہ ہم ابھی تک اس نظام کو درست کرنے کی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

میں سمجھتا ہوں پاکستان کے نظریے اور نظام کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنا جتنا کسی پاکستان کا فرض بنتا ہے اتنا ہی ہر کشمیری پر عائد ہوتا ہے کیونکہ پاکستان دونوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ اگر کشمیری اس نظام اور عقیدے کے لیے جدوجہد نہیں کرتے تو یہ بڑا ظلم ہوگا۔ میں اس سے بھی بڑھ کر کہوں گا۔ پاکستان نہ صرف پاکستان اور کشمیر ہندوستان بنگلہ دیش اور پوری ملت اسلامیہ کی آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز ہے۔ اس سے بھی اس خطے کے تمام مسلمانوں کی دلچسپی ہونی چاہیے لیکن اگر اس کے استحکام اور تکمیل کے اس کی تحلیل کی طرف کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے۔ تو یہ نہ صرف اسلام، پاکستان بلکہ کشمیریوں کی بھی خدمت نہیں ہوگی بلکہ اس سے ہندوستان، بنگلہ دیش ایران اور افغانستان کو بھی نقصان پہنچے گا۔ کشمیریوں کا محض اس مفروضے پر کہ پاکستان میں ان کا استحصال ہوگا پاکستان کو کمزور کرنے پر آمادہ ہو جانا قرین انصاف نہیں۔ استحصال سے نجات کے لیے بھی قوت کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی مضبوطی اور استحکام نہ صرف پاکستان بلکہ کشمیریوں اور برصغیر کے مسلمانوں کو استحصال سے نجات دلانے کے لیے ضروری ہے۔ اگر مسلمان محض اقتصادی استحصال کی بنیاد پر قوم اور ریاست کی تشکیل کی بات کرنے لگیں تو پھر عقیدے کی کیا حیثیت رہ گئی۔ کیا بوسنیا کے مسلمان یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ انہیں مار پڑ رہی ہے اس لیے وہ عیسائی ہو جائیں تاکہ ان کے معاملات درست کیے جائیں۔ یا بھارت کے مسلمان ہندو بن کر بہتر آسائش حاصل کر سکتے ہیں تو کیا وہ کر لیں گے۔ کیا وہ عقیدہ چھوڑ دیں گے......؟ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ پاکستان کے اندر حقیقی معنوں میں پاکستان بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس کا آئین اسلامی ہے۔ اس کا نام اسلامی ہے۔ اور ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کو تبدیل کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب کشمیر اپنی جدوجہد میں کامیابی کے بعد آگ اور خون کے اس دریا سے نکل آئے گا۔ تو اس کا ایمان شہیدوں کے لہو سے زندہ و تابندہ ہوگا یہ زندہ و تابندہ کشمیر پاکستان کو نیا نظام لانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

## کشمیر اور پاکستان ......لازم و ملزوم

یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ پاکستان صرف اپنی اقتصادی منفعت کے لیے کشمیر کی تحریک کا ساتھ دے رہا ہے۔ پاکستان نے تو کشمیر کے لیے بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ اپنی آزادی اور سلامتی کو داؤ پر لگا کر تین جنگیں لڑی ہیں۔ اور کشمیر کے لیے اپنا نصف حصہ گنوایا ہے۔ اگر پاکستان کشمیر پر اپنے موقف کو چھوڑ دیتا تو اقتصادی طور پر ترقی کر سکتا تھا۔ ایک غریب قوم نے اپنے بجٹ کا ۴۷ فیصد حصہ کشمیر کے دفاع کے لیے ہی خرچ کیا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر جھگڑے کی وجہ سے ہی دفاعی طور پر ہم نے اس کی برابری کی کوشش کی اس لیے نیوکلیئر صلاحیت کرنے کی تگ و دو کی۔ ورنہ اتنی بڑی فوج رکھنے کا ہمارے پاس کیا جواز تھا۔ تین جنگوں میں پاکستانی عوام

نے زبردست مالی اور جانی قربانیاں دیں۔ اگر کشمیر پاکستان کی اقتصادی ترقی کا باعث بن سکتا ہے تو پاکستان بھی کشمیر کی ترقی اور بقا کا باعث ہے۔ اس لیے یہ سوچ منفی اور غیر منطقی ہے۔ پاکستان ایک خطہ زمین پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ تو پاکستان بھی کشمیر کی ترقی اور بقا کا باعث ہے۔ اس لیے یہ سوچ منفی اور غیر منطقی ہے۔ پاکستان ایک خطہ زمین پر نظر رکھے ہوئے۔ کشمیر اگر پاکستان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے تو پاکستان کی بقاء کی ضمانت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

مغربی ممالک کل تک مسئلہ کشمیر پر ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ اب کہتے ہیں قرار دادیں پرانی ہوگئی ہیں۔ کیا پرانے اصول منسوخ کیے جاتے ہیں۔؟ عراق پر حملے دوسرے مواقع پر وہ فی الفور حملے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن کشمیر کے مسئلے پر آخر یو این او اور ریزولوشن کیوں پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ کچھ تو اس کی وجہ ہوگی۔ اس سلسلے میں ہمیں سراب دکھائے جاتے ہیں۔ دراصل وہ ہماری سادگی سے فائدہ اُٹھا کر یہاں قدم جمانا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان کی نئی چالوں سے آگاہ ہونا چاہیے۔ ایک بنے بنائے کھیل کو ایسے ہی ہم ایک سپر پاور کے کہنے پر خراب کردیں۔ جس نے ہمیں بار بار دھوکا دیا۔ جس کو مسلمانوں سے کوئی انس کی رغبت نہیں۔ اس پر اعتماد کرکے ہم مستقبل کی سپر پاور چین سے کیوں ٹکرائیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ مستقبل قریب میں امریکہ ماضی کی سپر پاور رہ جائیگا۔ مگر جس کے ساتھ ہمارے کشمیر کے حوالے سے گہرے تعلقات ہیں۔ اور آج بھی وہ ہمارے ساتھ کھڑے ہیں اور مستقبل میں جن کے سپر طاقت ہونے کا مغرب کا یقین ہے۔ اس سے بگاڑ پیدا کرلیں ...... یہ تو عقل ودانش کے خلاف ہے۔

ہندوستان تو چاہتا ہے کسی نہ کسی طریقے سے اقوام متحدہ کی قرار دادوں کو ختم کیا جائے۔ ہندوستان نے ہمیشہ اس سلسلے میں ہمارے ساتھ چالیں چلیں۔ شیخ عبداللہ کو ہمارے پاس بھیجا اور یہ تاثر دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل میں سنجیدہ ہے۔ پھر جب چین نے حملہ کیا تو امریکہ کے ذریعے درخواست کی ہم اس پر حملہ نہ کریں۔ بعد میں کشمیر کا معاملہ طے کرلیا جائے گا۔ اس طرح ہم دھوکوں اور جعل سازیوں کا شکار رہے۔ کشمیری آج اگر پاکستان کو ناراض کردیں گے تو پاکستان کے لوگ بھی تحریک آزادی کی حمایت سے ہٹ جائیں گے۔ پاکستان کے اندر قربانی کا جذبہ نہیں رہے گا۔ کبھی کوئی تحریک آزادی کامیاب نہیں ہوتی جب تک اسے باہر سے امداد نہ ملے۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ کشمیر پاکستان کی مدد کے بغیر آزاد ہو کر خود مختار ہو جائے گا تو یہ بالکل غلط سوچ ہے۔ لہٰذا کشمیر کی آزادی کے لیے کام کرنے والوں کو پاکستان کو اپنی جدوجہد سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے دو سال پہلے کہا تھا کہ کشمیری اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ اگر ہم بھرپور انداز میں ان کے ساتھ کھڑے نہ ہوئے تو اس کا نتیجہ یہ رنگ لا سکتا ہے لیکن ایسا پاکستان کی حکومت یا حکومتوں کی وجہ سے ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنا کردار صحیح طریقے سے ادا نہیں کیا۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے کشمیر کی محبت ان کے خون میں دوڑ رہی ہے۔ میں پاکستان کے عوام اور حکومتوں سے کہوں گا کہ خدارا ایسے کام بند کردو جس پاکستانی اور کشمیر عوام میں غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ کشمیر قانونی اور اخلاقی لحاظ سے ہمارے شہری ہیں۔ اگر ہندوستان بغیر کسی جواز کے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے۔ تو ہم ہر قسم کے قانونی اور اخلاقی جواز کے باوجود کشمیریوں کو اپنا شہر کیوں نہ کہیں۔ کشمیری تو ہمیشہ پاکستان

کے ساتھ رہے ہیں۔ خودمختاری کا نظریہ بہت بعد کی بات ہے۔ خودمقبول بٹ شہید نے پاکستان کی سرزمین پر پہنچ کر اس مٹی کو چوما تھا۔ اس کے بعد پاکستان آ کر انہوں نے بقول خودمختاری کے حامیوں کے اپنا نظریہ بدل لیا تھا۔ مگر اس کا کیا مطلب ہوا یعنی اس سنے پہلے اگر کشمیر عوام کو موقع ملتا تو وہ سو فیصد پاکستان کے حق میں ووٹ دیتے۔ 1972ء تک کشمیرعوام میں اس بات پر کوئی اختلاف ہی نہیں تھا۔ بھارت پرست پارٹیوں کا موقف البتہ مختلف تھا۔ لیکن آزادی پسند غالب اکثریت تو صرف ایک آپشن رکھتی تھی اور وہ تھا پاکستان۔ اس صورت میں کشمیر پر پاکستان کا حق مسلمہ تھا اور ہر کشمیری اس کا شہری تھا۔ ہم سمجھتے ہیں ہر کشمیری آج بھی ہمارا شہری ہے۔ اس لیے اپنا شہری ہونے کے ناطے ہمیں اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے پاکستان کو کشمیر کے لیے ایک جنگ اور لڑنی پڑے اور اپنی سلامتی کو داؤ پر لگانا پڑے لیکن ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اگر کشمیر کے لیے پاکستان پہلے ہی بہت قربانیاں دے چکا ہے۔ تو آئندہ بھی ایسی ہی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ اگر کشمیر کا نظریہ ایک خودمختار ریاست کو مان لیا جائے تو پاکستان کی گزشتہ اور آئندہ قربانیوں کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ اگر ہندوستان آج ہم پر حملہ نہیں کر رہا تو وہ اپنی روائتی فوج کے ساتھ ساتھ ہماری نیوکلیئر قوت کے سبب ایسا ہوا ہے۔ نیوکلیئر صلاحیت کے لیے بھی ہم نے بھی قربانی دی ہے۔ کشمیر کے لیے پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے۔ ہم نے اپنے چوٹی کے سربراہ ختم کروائے ہیں۔ امریکہ کی دشمنی مول لی ہے۔ یہودی مخالفت قبول کی ہے۔ اسی وجہ سے افغانستان میں جیتی ہوئی بازی اُلٹ گئی۔ آج بھی کشمیر کی خاطر ہم نیوکلیئر قوت ختم کرنے کو تیار نہیں۔ اس لیے کشمیر کے لیے پاکستان ضروری ہے اور پاکستان کے لیے کشمیر۔

ایک مضحکہ خیز مفروضے کے طور پر بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کشمیر کا پاکستان سے الحاق تو پندرہ لاکھ ڈوگرے کہاں جائیں گے۔؟ ڈوگروں کو کشمیر کے ساتھ اپنی شناخت کو ختم کرنے کی حماقت سے بچنا چاہیے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو کل جب بھارت ٹکڑے ہوتا ہے تو جس کے خدشات خود بھارت کے اندر موجود ہیں۔ تو ایسی صورت میں نہ صرف ڈوگرے پاکستان بلکہ ہندوستان سے بھی کٹ کر رہ جائیں گے۔ ان کی ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف خالصتان ہوگا۔ جبکہ اس کے سارے روابط جغرافیائی طور پر کشمیر اور پاکستان کے ساتھ ہیں۔ جموں سے ستواری اور سچیت گڑھ کے راستے کراچی تک اٹھارہ گھنٹے میں اور چمن چوبیس گھنٹے میں پہنچا جا سکتا ہے۔ جب کہ کشمیر کا بمبئی کے راستے دنیا سے رابطہ بہت بعید ہے۔ سکھوں کی آزادی کی صورت میں اور مسائل پیدا ہوں گے۔ لہٰذا ان کو بھی پاکستان میں زیادہ تحفظ ملے گا۔ ہندوستان تو بیس کروڑ مسلمانوں کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتا۔ پندرہ لاکھ ڈوگروں کی کیا حیثیت ہوگی۔ اس سلسلے میں پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے جموں کے ڈوگروں اور لداخ کے بدھوں کے تحفظ کے لیے آئینی تحفظات حاصل کیے جائیں۔

آخری بات ...... کشمیر میں جہاد جاری ہے۔ جہادی قوتوں جماعتوں اور تحریکوں جو جب تک اعتماد میں نہیں لیا جائے گا۔ کشمیر کے بارے میں کیا جانے والا کوئی بھی فیصلہ جنیوا معاہدے کی شکل اختیار کر جائے گا۔ جس طرح افغانستان کے بارے میں جنیوا معاہدے کے بعد خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ وہاں اصل قوت کو اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اسی طرح آج اگر کشمیر کی سیاسی قوت کوئی فیصلہ کرتی ہے جو جہادی قوتوں کی مرضی کے خلاف ہو تو اس سے

ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ مجاہدین سے بالا کوئی فیصلہ کشمیر کے مسئلے کو حل نہیں ہو سکتا۔ کشمیر میں آج فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے جس کے ہاتھ میں بندوق ہے۔ بندوق کشمیریوں نے اللہ کے نام پر اٹھائی ہے۔ قرآن وسنت کی بالادستی کے لیے کشمیری جان دینے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے کشمیر کا مسئلہ آج محض زمین کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ دین کے ساتھ بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ نظریے کو اگر اس ضعف سے بچانے کی کوشش کی گئی تو ایک نیا خلفشار شروع ہو جائے گا۔

## معاہدہ الحاق ضروری ہے

میرے خیال میں کشمیریوں کے الحاق کے بارے میں خدشات کا حل یہ ہے کہ کشمیری پاکستان کے ساتھ شامل ہونے سے پہلے اپنے لیے اپنا آئین اور نظام بنا کر آئیں۔ پاکستان کا صوبہ بن کر کسی نئی چپقلش کا شکار نہ ہوں بلکہ دفاع، کرنسی اور مواصلات، امور خارجہ مرکز کو سونپ کر باقی اختیارات ریاست کے پاس رہنے کی ضمانت حاصل کریں۔ یہ بالکل جائز بات ہے کشمیر کو پاکستان کی سیاسی اور انتظامی خرابیوں میں حصہ نہیں ملنا چاہیے۔ پاکستان میں خاصی سیاسی اور انتظامی گندگی موجود ہے۔ اس لیے کشمیر پاکستان سے الحاق ضرور کرے مگر اپنی شرائط پر کرے۔ باقاعدہ ایک معاہدہ الحاق عمل میں لایا جائے اور الحاق کی شرائط پاکستانی آئین کے آرٹیکل 370 سے بھی بڑھ کر ہوں اور کشمیر کی مکمل داخلی خودمختاری کی ضمانت موجود ہو۔

اس ضمن میں جو خدشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کشمیر کو خودمختار حیثیت دے دی گئی تو دوسرے صوبے بھی ایسے ہی مطالبے کریں گے۔ تو یہ بات سراسر غلط ہے۔ دوسرے صوبوں نے اپنی آزادی لڑ کر نہیں لی۔ وہ پاکستان کے آزاد ہونے کے نتیجے میں خود بخود آزاد ہو گئے۔ جبکہ کشمیر کی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ وہ تو خون کا دریا پار کر کے آئے گا اور پاکستان سے الحاق کرے گا۔ اس طرح کشمیریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا Autonomous Status حاصل کریں اور آزادی کے بعد وہاں اسلامی نظام قائم کریں۔ وہ نظام جس کے لیے پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان جس سے آج تک محروم ہے۔

کشمیری عوام نے جتنی قربانیاں دی ہیں اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ کشمیر کو اسلام کا ایسا ماڈل بنائیں۔ جس کی تقلید پاکستان کے دوسرے علاقے بھی کریں اور پاکستان کو صحیح معنوں میں پاکستان بنا سکیں۔ صرف اسی طریقے سے کشمیر پاکستان سے الحاق بھی کر سکے گا۔ اس کی خرابیوں سے بھی محفوظ رہے گا اور اس کو اسلام کا قلعہ بنانے میں معاون و مددگار ہوگا۔ کشمیر کو یہ سوچنا ہوگا کہ محض آزاد ہونا ہی کافی نہیں۔ آزاد ہونے والی سرزمین کو اس کے نظریے سے ہم آہنگ کرنا بھی اہم ہوتا ہے۔ پاکستان بھی آزاد ہوا تھا مگر جس ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے آزاد ہوا تھا اور اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ وہ آج بھی حاصل نہیں ہوا۔ کشمیری اپنی قربانیوں کے اسی ثمر کو سمیٹ سکتے ہیں کہ کشمیر کو آزاد کر کے پاکستان سے اس کا الحاق کریں اور پاکستان میں اللہ کا دین نافذ کرائیں۔

آل پارٹیز حریت کانفرنس کے مل کر کام کیا جائے اور اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک کر لیا جائے کہ ایک مضبوط پاکستان نہ صرف کشمیریوں بلکہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو بھی تقویت دے گا۔ جبکہ کمزور

پاکستان نہ صرف کشمیریوں بلکہ اس خطے کے نصف ارب مسلمانوں کے نظریے اور عقیدے کو کمزور کرنے کا باعث ہوگا۔ اسی طرح سے آج مغرب کی جو ثقافتی یلغار ہے، اس حوالے سے اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ امریکہ خود مختار کشمیر کو اپنی ثقافت کا اڈاہ بنا کر ہمارے ایمان، عقیدے اور نظریے کو تہس نہس نہیں کر دے گا۔!!

اس لیے کشمیر کے معاملے میں صبر اور حوصلے کے علاوہ حکمت کی بھی ضرورت ہے۔ اپنے موقف سے ہٹنا نقصان دہ ہوگا یہ ہماری بصیرت کا امتحان ہے۔ ہم کسی ہلاکت آفریں سراب کے پیچھے بھٹک نہ جائیں اور کسی مہلک گرداب میں پھنس کر رہ نہ جائیں۔ مجاہدین کو اعتماد میں لیکر کام کریں ورنہ اندرونی خلفشار کا خطرہ باقی رہے گا۔ اس وقت دونوں طرف سے سیاسی قائدین کی ملاقات خوش آئند ہے۔ لیکن پاکستان قوم، کشمیریوں اور مجاہدین میں پاکستان کی حکومت کے خلاف جو شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں جو بڑی حد تک درست ہیں۔ اس کا ازالہ ضروری ہے۔ سمجھا جارہا ہے کہ یہ وہ نہیں کر رہے جو ان کو کرنا چاہے۔ جب سے تحریک آزادی کا آغاز ہوا ہے۔ انہوں نے کشمیر کے مسئلے پر یکسوئی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کشمیر پر ہماری پالیسی ڈانواں ڈول ہے۔ خود پاکستان کے حالات بھی تقویت کے بجائے کمزوری کا باعث بن رہے ہیں۔ مثلاً کراچی کے مسئلے نے ہماری قیادت کی توجہ کشمیر کے ہٹا دی ہے۔ اگر پاکستان کے عوام کشمیریوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ وقت آنے پر پاکستان کا انتخاب کریں گے تو ہم پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ کشمیر کے لیے دی جانے والی بے پناہ قربانیاں دینے والوں کے ساتھ بھرپور یک جہتی کا اظہار کریں۔ پاکستان کے عوام اور کشمیریوں ...... دونوں کو بے پناہ حکمت وفراست، صبر واستقامت اور ہمت وحوصلے کی ضرورت ہے۔

## مصنف کی نئی آنے والی کتاب

علم و عرفان پبلشرز
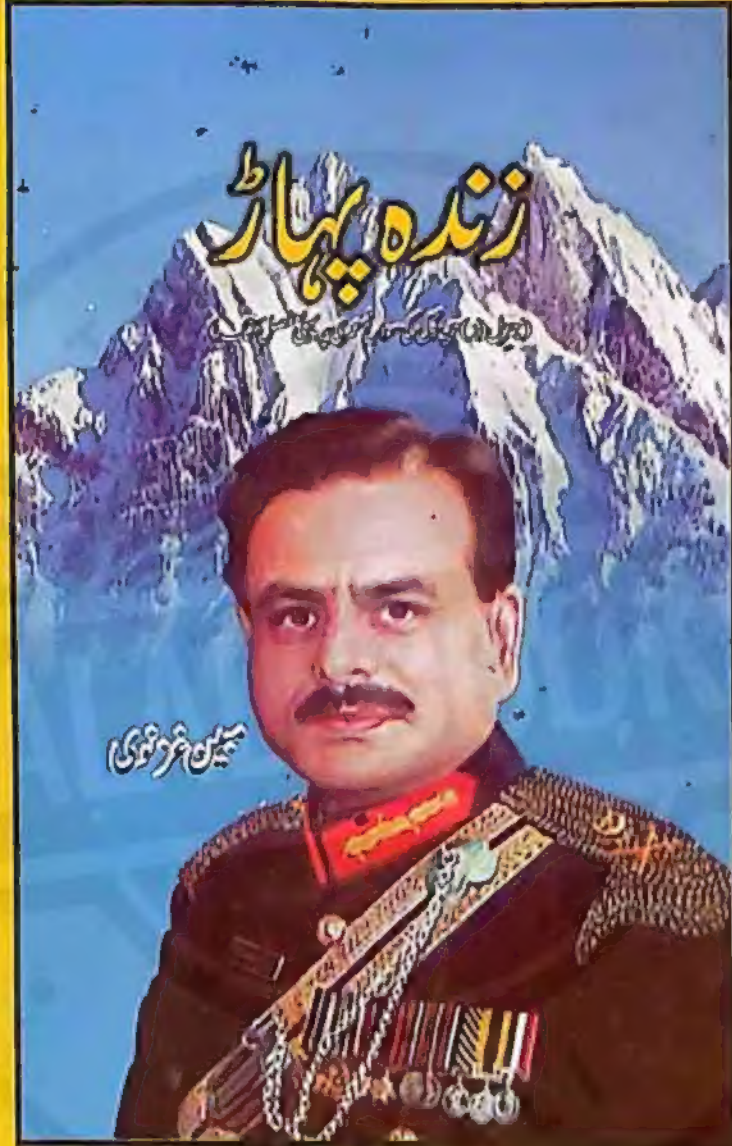
الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37352332'37232336 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com